

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

ظالم زبان کی قید میں

یو آئیے رڈ لے سے مریم تک

9/11 کے بعد جس بدل کر افغانستان چھپنے والی ہر خطا کو خطا قرار دیا گیا

کے اسرار و اسرار کے گہرے اور ایمان افروز و مستطاب اسرار

2001ء کی 11 ستمبر کو منگل کا دن تھا۔ یہ میرے لئے ایک خوشگوار دن ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سنڈے ایکسپریس کے نیوز روم میں اس دن کا آغاز، اگرچہ چھ ہفتوں کے اخراجات کے فارم پر کرنے سے کیا تھا، پھر بھی مجھے امید تھی کہ مجھے سستانے کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ اتوار کے اخبارات کے صحافیوں کے لئے منگل عام طور پر میل جول کا دن ہوتا ہے۔ وہ اپنے نئے اور پرانے رابطہ کاروں (Contacts) سے ”آئیوی“ یا ”کاگلیوز“ میں لنچ پر ملاقات کرتے ہیں، اس کے بعد کسی لوکل بار میں مزید ارشرب کی چسکیاں لیتے ہیں پھر ”سوہو“ کے کسی پب یا کلب میں جا بیٹھتے ہیں۔

تاہم بد قسمتی سے مجھے اس منگل کو اخراجات کے کافی پیچیدہ فارم پر کرنا پڑ گئے جو ایک منت خواں طے کرنے سے کم نہ تھا۔ اس کام کے لئے اکاؤنٹس جیسا ذہن اور انتہی کی سی یادداشت درکار ہوتی ہے۔ اچھے وقتوں میں اخراجات کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی پانچ گھنٹے لنچ، کی نذر ہو جانے کی کوئی پرواہ کی جاتی تھی، اب اکاؤنٹس قومی اخبارات کے اندر بھی آگئے ہیں، ان کی وجہ سے بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کیونکہ سٹوری کا ذریعہ بننے والوں کے ساتھ گپ شپ پر صرف ہونے والا وقت اور پیسہ اکارت نہیں جاتا، اس سے بڑی بڑی سٹوری کا سراغ مل جاتا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ میں نے اپنے ایک اچھے ”رابطہ کار“ سے جیل میں ملاقات کا وعدہ کر رکھا تھا، وہ قانونی نظام کی نارسائی کی وجہ سے قید کاٹ رہا تھا۔ اسے دروغ خلفی کے الزام میں غلط طور پر سزا ملی تھی۔ وہ حقیقتاً بے قصور تھا۔

رپورٹوں کی عام روش کے برعکس، میں سرخیاں پہلے طے کر کے رپورٹنگ نہیں کرتی۔ میں نے یہاں اپنے ہفتے کے آغاز میں دو کام ترجیحی طور پر کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ خلاف عادت میں کچھ سٹپٹائی ہوئی اس منشیوں والے کام کو نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی، اور سوچ رہی تھی کہ آج کھانے کی فرصت کہاں؟ اگر مارا مار کر کے پیر اور سینڈوچ وغیرہ نصیب ہو سکے تب بھی خود کو بڑی خوش قسمت سمجھوں گی۔

میں نے چونکہ اپنی توجہ کی منتشر ہونے سے بچائے رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، اس لئے میں سر جھکائے، دفتر کی ”چہل پھل اور چھیڑ خانوں سے انجان بنی رہی۔ دوسرے ساتھی اپنا اپنا کام نمٹا کر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور میں دفتر میں عملاً تنہا رہ گئی۔

ہمارا نیوز آپریشن، اس بڑے نیوز روم کا صرف ایک حصہ ہے جہاں ڈیلی ایکسپریس کے چرنلسٹ، فوٹو گرافر، عملہ، نیوز ڈیسک، سب ایڈیٹرز، گرافک آرٹسٹس اور دیگر کارکن مل جل کر کام کرتے ہیں۔ ہمارا دفتر ”بلیک فریڈم برج“ پر واقع ہے جسے پیار سے ”گرے لیبا نکا“ کہا جاتا ہے۔

یہ دن خاص طور پر قابل ذکر تو نہیں تھا، اس کا نصف حصہ بھی نہیں گزر پایا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ لوگ نیوز روم کے چاروں طرف رکھے ہوئے ٹی وی سیٹوں کے سامنے ٹکڑیوں کی صورت میں جمع ہو رہے ہیں۔ میں تھوڑی سی اس طرف مڑی تو یہ دیکھ کر مجھے شدید دھچکا لگا کہ سکرین پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا نارتھ ٹاور دکھائی دے رہا تھا جسے آگے لگی ہوئی تھی۔

یہ تقریباً دو بجے کا وقت تھا میں نے فوراً اپنی بڑی بہن ”ویو“ کو فون کیا، وہ نیوکیسل میں اپنی فلاور شاپ میں تھی، میں نے اسے فوراً ٹی وی لگانے کے لئے کہا تا کہ اسے پتہ چل سکے کہ اس وقت امریکہ میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم تین ہفتے قبل نیویارک میں تھیں جہاں اس نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے اوپر جانے کے لئے قطار میں لگنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے اسکے گرائنڈ فلور میں پھولوں کی دکانیں دیکھنے کا زیادہ شوق تھا۔

میں نے اسے فون پر بتایا کہ ممکن ہے کہ ٹاور سے ٹکرانے والے طیارے کے پائلٹ کو دل کا دورہ پڑ گیا ہو، یا کوئی اور عارضہ لاحق ہو گیا ہو جس کی وجہ سے اس کا طیارے پر کنٹرول نہ رہا ہو۔ مجھے اس وقت یہ خیال نہ آ سکا کہ اس کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ بعد ازاں میں نے خود پر لعنت بھیجی کہ میں نے رصد گاہ (Observation) جانے پر اصرار کیوں نہیں کیا تھا۔

”ویو“ اور میں دونوں بگ اپل (نیویارک سٹی کا بگڑا ہوا نام) کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھیں چنانچہ ہم وال سٹریٹ میں ریجنٹ ہوٹل میں جا ٹھہریں۔ کیونکہ ہم نے جو کچھ کمایا تھا اس سے آسائش خریدنا ہمارا پیدائشی حق تھا۔ یہ فانیو سٹارگلٹری مین ٹین سائل کا ہوٹل تھا۔ ”ڈبلو، ٹی، سی“ (ورلڈ ٹریڈ سنٹر) یہاں سے سوسوگنز سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ یہ فنانشل سیکٹر میں واحد فانیو سٹار ریٹ کا ہوٹل تھا۔ یہ عمارت دراصل سٹاک ایکسچینج تھی جب سے یہ تعمیر ہوئی ہے، اس میں بار بار تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ اب یہ ایک ہوٹل بن چکی ہے، اس کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ اسکے ہاتھ ٹب پورے نیویارک میں وسیع ترین ہیں۔ افسوس کہ مجھے اپنے ہمراہ ٹھہرانے کے لئے بڑی بہن ہی میسر آ سکی تھی۔

بہن اور نیویارک میں اپنی آٹھ سالہ بیٹی ڈیزی سے اس کے سرکیمپ میں ملاقات کرنے کے بعد ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ کمپ یہاں سے تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے فاصلے پر ہو رہا تھا۔ وہ یہاں کل چھ نفلتوں کے لئے آئی تھی۔ اس کمپ میں اس کی خوب خاطر و مدارات ہو رہی تھی اور ایسا دھیان رکھا جا رہا تھا کہ اسے ”بور“ ہونے کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اگر میں انگلینڈ میں گرمی کی چھینوں میں اس کا دل بہلانے کے لئے کسی خادمہ (au pair) کو رکھ لیتی وہ بھی اس کو اتنی تفریح مہیا نہ کر سکتی، جتنی یہ کمپ اسے فراہم کر رہا ہے (خدا یا! میں اپنی 38 سال کی عمر میں اس 8 سالہ ڈیزی کے معاملہ میں اپنے رویے کا جواز کیوں ڈھونڈتی رہتی ہوں؟ یہ ایک من موہنی اور متوازن بچی ہے، ہم ایک دوسری سے بہت پیار کرتی ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس کے پاس زیادہ وقت گزارتی۔ لیکن ”سنگل مم“ کے طور پر تلخ حقائق سے نمٹنا اور ورکنگ جرنلسٹ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا، زندگی کو مشکل تر بنادیتا ہے۔ دوسری عورتوں کے کشیلے فقرے بھی ہوش اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔

میری نیویارک سے متعلق یادداشتیں، میرے سامنے پڑے ہوئے ڈی وی پر آنے والے مناظر سے بالکل برعکس تھیں۔ ”ویو“ میری رنگ کنٹری سن کر سکتے میں آ گئی۔ پھر اس نے اچانک میرا فون بند کر کے اپنے شوہر بل برائون کو فون کر دیا اور اسے واقعات بتانے لگی۔

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے کچھ ساتھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرتے ہیں۔ میں ”ڈرامے“ کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی، ان لمحات تک، میں اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ امریکن ایئر لائنز کی فلائیٹ 11 جو بوسٹن کی لوگن ایئر پورٹ سے لاس اینجلس جاتی ہے۔ اسے نیویارک کے وقت کے مطابق صبح 8:48 پر ”دانستہ“ نار تھناور کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد میں پھر بہن سے فون پر بات کرنے لگی۔ چند لمحے قبل میں نے ایک اور بونگ 767 کو جو یانا یینڈ ایئر لائنز کی فلائیٹ 175 تھا، ”ساؤتھ“ ناور کے ساتھ ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا، اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے اچانک فون رکھ دیا اور شوہر کو آوازیں دینے لگی۔

میں نے مایوس ہو کر ادھر ادھر دیکھا، میں جس کسی سے بات کرنا چاہتی تھی وہ لنچ پر تھا۔ مجھے نیویارک سے رابطہ قائم کرنا تھا یہ ناقابل یقین درجے کا خوف و ہراس تھا کیونکہ یہ (بے۔ ایف۔ کے) جان ایف کینڈی کے قتل کے واقعہ کے بعد ہولناک ترین سنوری تھی۔

نیویارک سٹی نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ تمام پل اور سرنگلیں بند کر دی گئی تھیں۔ سہ پہر 2:25 پر صدر جارج ڈبلیو بش کہہ رہے تھے۔ ”ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ، ہمارے ملک پر دہشت گردوں کا حملہ ہے۔“

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ آرو پبلیکٹ محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com

نیویارک سٹاک ایکسچینج اور جملہ ہوائی اڈے بند کر دئے گئے۔ کہا جا رہا تھا کہ کسی نے امریکا سے جنگ شروع کر دی ہے اور اس کا ”پرل ہاربر“ پر حملے سے موازنہ کے اعلانے لگا۔

ادھر میں نے ٹی وی، اپنے ڈیسک پر رکھے ہوئے ٹیلی فون اور اپنے موبائل کے درمیان دوڑ لگا رکھی تھی۔ میں اپنے نیوز ایڈیٹر جم مرے اور ایڈیٹر ناؤسنڈ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ مجھے نیویارک جانا ہی پڑے گا۔

دو بج کر پینتالیس منٹ پر امریکن ایئر لائنز کی فلائٹ 77، بوئنگ 757 جو ڈلس ایئر پورٹ کی طرف سے آئی تھی، اینڈیگن سے جانکرائی۔ اس سے عمارت کے پانچ پہلوؤں میں سے ایک پہلو (Side) مہندم ہو گیا۔ چند منٹوں کے بعد وائیٹ ہاؤس خالی کر لیا گیا، ہم سب کا خیال تھا کہ بس اب اس پر حملہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ لوگ بیجانی انداز میں باتیں کر رہے تھے کہ کم از کم ایک طیارہ لاپتہ ہے ہو سکتا ہے کہ وہ ادھر ہی جا رہا ہو۔

اعتنا ہو مجھ پر، میں نے اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہا، میں اب تک نیوز ایڈیٹر سے رابطہ نہیں کر پائی۔ اسٹنٹ ایڈیٹر جونا تھن کیلورٹ نے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ لیکن میں کیسے پرسکون رہ سکتی تھی۔ یہ منگل کا دن تھا، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ صدی کی سب سے بڑی خبر کی تھیں اتنی تیزی سے ہماری آنکھوں کے سامنے گھل رہی تھیں، ہم کیسے چپ رہ سکتے تھے؟

ہم ٹی وی پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے وہ خوفناک مناظر دیکھ رہے تھے کہ آفس ورکرز اوپر کی منزلوں سے خود کو نیچے گرا رہے ہیں، ہمارے منہ حیرت اور خوف سے کھلے کھلے رہ گئے میرے خدا! اندر کیسی دوزخ برپا ہے کہ ان کو جان بچانے کے لئے اتنی اونچی کھڑکیوں میں سے باہر کود جانا بہتر راستہ دکھائی دے رہا ہے۔ بس میں اور کچھ نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن قہرمانی حالات مجھے مارے باندھے یہ دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ بدحواسی کے مظاہر تھے کہ لوگ جان بچانے کے لئے اتنا غیر منطقی طریقہ اختیار کر رہے تھے، جو ہمارے تصور سے ہی باہر تھا۔

جم مرے اپنی روایتی گرجاؤں اور خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیوز روم میں داخل ہوا، چند منٹوں کے بعد مارٹن ناؤسنڈ آ پہنچا۔ جب میں نے انہیں یہ واقعہ بتایا تو وہ کچھ پریشان ہوئے، مارٹن نے کہا کہ وہ مجھے نیویارک بھیجنا چاہتا ہے۔ جبکہ جم کا خیال تھا کہ مجھے مشرق وسطیٰ جانا چاہیے، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ امریکا میں ہونے والی اس سفاکی کے کچھ ”روابطہ“ وہاں ضرور موجود ہوں گے۔

میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ مجھے دمشق یا لبنان جانا چاہیے جہاں میرے چند ”پسندیدہ“ اور دلچسپ ”رابطہ کار“ رہتے ہیں ممکن ہے کہ مجھے ان سے کچھ پتے کی باتیں معلوم ہو جائیں یا اپنی سنوری کے لئے کوئی سمت مل جائے۔ مجھے معاً احمد جبریل یاد آیا جو کسی وقت عوامی محاذ پر آئے آزادی فلسطین کی جنرل کمان کا لیڈر ہوا کرتا تھا (یہ وہی گروپ تھا جس پر شبہ کیا گیا تھا کہ اس کا ”لاکربی“ پر سے گزرتے ہوئے امریکی طیارے پین ایم 103 کو مار گرانے میں ہاتھ تھا) میں 1992ء میں دمشق میں اس کے بنکر میں موجود تھی، جبکہ میں سات ماہ کی حاملہ تھی اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کے تاریک گوشوں میں نمایاں ہونے لگی تھی۔ میری حیثیت اس بنا پر بھی بڑھ گئی کہ میں پی ایل او کے کرنل زاروراک کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی جو 1972ء تا 1976ء جنوبی لبنان میں فتح میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک رہ چکا تھا، اور بعد میں وہ یا سر عرفات کی اتملی جنس کا سربراہ بن گیا۔ وہ میرے پیٹ میں بچے کا باپ تھا جس کی وجہ سے وہ نیوکسیل (شمالی انگلینڈ) میں آ کر میری ہی فلیٹ میں رہنے لگا۔ اسے یا سر عرفات نے میرے ساتھ تعلقات جاری رکھنے پر برطرف کر دیا تھا خیر وہ ایک دوسری کہانی ہے۔ بہر حال وہ اب بھی میرے بہترین دوستوں میں سے ہے۔

ہاں تو میں اپنے دفتر کی بات کر رہی تھی، ایڈیٹر مارٹن ناؤسنڈ اور جم نے تمام امکانات کا جائزہ لینے کے بعد جلدی جلدی مجھے نیویارک بھیجنے کا فیصلہ کر دیا، جونہی میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نیوز روم سے نکلنے لگی تو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ساؤتھ ناؤر گر کر بلے کا ڈھیر بن چکا اور اس میں سے نکلنے والی راکھ کے مرغولے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ نووارک (نیوجرسی) کی طرف سے آنے والی یونائیٹڈ ایئر لائنز فلائٹ 93 (بوئنگ 757) جو کہ سان فرانسسکو جا رہی تھی پٹسبرگ سے تقریباً اسی میل دور سمریٹ کاؤنٹی کے عین شمال میں گر کر تباہ ہو گئی۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی گھر گئی کچھ کپڑے وغیرہ اٹھائے اور سیدھی پیتھروائیئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب ایئر پورٹ پہنچی تو بحراوقیانوس کے پار سے آنے والی تمام پروازوں کو لینڈا کی طرف بھیج دیا گیا تھا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا نارتھ ناؤر بھی منہدم ہو چکا تھا۔

میں برٹش ایئرویز کے ڈیسک کے سامنے قطار میں بگ گئی۔ ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد پتہ چلا کہ کم از کم ایک دن کے لئے بحراوقیانوس کے اوپر سے کوئی پرواز نہیں گزرے گی۔ البتہ برازیل جانے

والی ایک پرواز تھی۔ میں نے خیال کیا ”چلو اسی پر چلی جاتی ہوں“ میں بہ آواز بلند سوچنے لگی اور ساتھ ہی میں وہاں سے امریکا پہنچنے کے وقت کا حساب کتاب کر رہی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ میکسیکو اور کینیڈا کی طرف سے ملنے والی سرحدیں بھی بند کر دیں گئی ہیں۔ تاہم میں نے پیدائشی طور پر رجائیت پسند ہونے کی وجہ سے نیویارک کے لئے جمعرات 13 / ستمبر کا ٹکٹ خرید لیا کیونکہ مجھے امید تھی کہ اس وقت تک فضائی راستہ کھل چکا ہوگا۔

میں کسی قدر مایوسی کے عالم میں اپنی بھری ہوئی ہولڈال سمیت دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔ لیکن اس بات پر دل میں خوش تھی کہ میں نیویارک کیلئے جمعرات کی صبح کا ٹکٹ تو کم از کم لے لیا ہے۔ ادھر نیویارک کے میٹرو ڈلف گلیانی نے کینال سٹریٹ کے مین ہٹن ساؤتھ کو خالی کرنے کا آرڈر دیدیا تھا اور میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ کیا وہ لوگ نہیں میں نے چند ہفتے قبل 55 وال سٹریٹ ہوٹل میں دوست بنایا تھا، خیریت سے ہوں گے۔ میں ان سے رابطہ قائم نہیں کر سکتی تھی کیونکہ سب مواصلاتی سلسلے بند دکھائی دے رہے تھے۔

پھر میں نے ایک ڈسٹرکٹ میں ڈیزی کو اس کے بورڈنگ سکول میں فون کیا، تاکہ معلوم کروں کہ کیا اسے نیویارک کے تباہ کن واقعات کے بارے میں کچھ پتہ چلا ہے۔ اسے اگرچہ یہ معلوم ہو چکا تھا، اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ ان واقعات کی سنگین نوعیت اس کے مزاج پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہوئی۔ اس نقطے پر آ کر مجھے مشکل کام بھی کرنا پڑا کہ میں نے اسے بتادیا کہ میں نیویارک کا ٹکٹ لے چکی ہوں۔ میں نے اس کے لئے امکانی طور پر پریشان کن اطلاع کو معتدل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے وعدہ کیا کہ میں واپسی پر اس کے لئے ایک خوبصورت تحفہ لاؤں گی۔ بچوں میں عموماً پائے جانے والے مادہ پرستانہ رجحان کی وجہ سے وہ اس نے فوراً خوش ہو گئی۔ ڈیزی اور میں اکثر اکٹھی سفر کرتی ہیں، میں اسے ہمرانہ لے جاؤں تو وہ سخت ناراض ہوتی ہے، ہم اپنے سفر کو ہمیشہ ایک چھوٹی سی مہم کہتی ہیں۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ میں اس کی ہاف ٹرم پر بروقت پہنچوں کیونکہ میں نے ہم دونوں کے ایمسٹرڈم جانے کے لئے ٹکٹ خریدے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ٹیلی فون نیچے رکھ دیا، اگر میں پہلے فون منقطع کر دوں تو وہ بہت برا مناتی ہے اور اس بات پر پریشان ہوتی رہتی ہے کہ کیا میں اب تک اس نے ”آن لائن“ گفتگو کر رہی ہوں، میں بھی بچپن میں ایسا ہی کرتی تھی۔

جب میں دفتر پہنچی، تو پہلے میں سڑک کے پار سٹیمفورڈ واٹن بار میں گئی اور ”لینز“ کی ”سپیشلز“ میں سے ایک جام مانگا۔ لینز اس بار کی منیجر ہے اور حیرت انگیز ”میز“ بناتی ہے۔ میں نے اب تک جتنی شراب پی ہے ان میں سے اس کا ذائقہ مجھے سب سے اچھا لگا ہے۔ ہم اسے ”سپیشلز“ کہتے ہیں۔ یہاں کا ماحول بھی اچھا ہے اور بار کے پیچھے کھڑی لڑکیاں بھی بڑی ہنس مکھ ہیں۔ لیکن آج رات کی فضا سو گوار تھی۔ اگر میں اسے ناکوار کہوں تو بجا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہر جگہ لوگ ایک صدمے سے دوچار دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں سے میں نے ”سوہو“ (Soho) کے لئے ٹیکسی لے لی تاکہ ”گیری کلب“ پہنچ جاؤں۔

لندن کو رات گئے

میں عام طور پر براستہ ”گیری“ گھر جاتی ہوں، درحقیقت میں ”ہمیشہ“ گیری کلب کی طرف سے ہوتی ہوئی گھر پہنچتی ہوں! ہو سکتا ہے کہ میں ٹیکسی والے سے کہوں کہ وہ ڈین سٹریٹ اور آکسفورڈ سٹریٹ کے اوپر کی طرف سے لے جائے تاکہ رات کی رنگینیوں سے بچتی ہوئی جاؤں۔ لیکن آپ مجھے بتائیں کہ صبح تین بجے تک گھومنے پھرنے والوں کو ”پینے“ کی اشد طلب ہو رہی ہو تو وہ گیری کلب نہ جائیں تو کہاں جائیں۔ وہاں داخل ہو کر دھما چوڑی بھی مچائی جاسکتی ہے۔ جب خالی ہو تو بھی پرچی کام دے جاتی ہے۔

مجھے اس کی ممبر شپ تقریباً آٹھ سال پہلے جب خالی ہونے کی وجہ سے ہی ملی تھی۔ ہوا یوں کہ میں ان دنوں کارڈف میں ”ویلز آن سنڈے“ میں بطور ڈپٹی ایڈیٹر کام کر رہی تھی۔ میں کسی فنکشن کے سلسلے میں لندن میں تھی اور ایک پرانے رفیق کار کیونین کینہل سے اچانک ملاقات ہو گئی جو ایک تفتیشی صحافی ہے۔ ہم پارلیمنٹ کے ایوان بلا (ہاؤس آف لارڈز) میں کچھ وقت گزارنے کے بعد تین ارکان ایوان (Peers of the Realm) سمیت گیری کلب میں چلے آئے۔ ہم جی بھر کر سرور و مستی میں کھوئے رہے، مزید ڈرنگ کی خواہش پیدا ہوئی تو اور منگوا لئے لیکن ہماری جیبیں تقریباً خالی ہو چکی تھیں۔ اس پر میرے ذہین و طباع میزبان نے کہا کہ تم بھی ممبر بن سکتی ہو، بشرطیکہ میں فارم پر دستخط کے لئے ایک تائید کنندہ تلاش کر سکوں تو پھر میری ”پرچی“ بھی چلنے لگے گی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے یہی کچھ کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ میری لئے اپنے گھر کی طرح ہے یعنی میرے گھر کا گھر بنا ہوا ہے۔

اگرچہ 11 دسمبر کی رات کو یہاں قدم رکھتے ہی ایک گھرے سنائے کا احساس ہوا، بار میں صرف ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا، وہ بھی مغموم و پریشان۔ ہم نے دن کے واقعات کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے بتایا کہ یہ اس کے بوائے فرینڈ کا برتھ ڈے ہے ”اور وہ بھی ایسا کہ جسے یہ کبھی نہیں بھلا سکے گا۔“ میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے

ہوئے کہا۔ ہم امریکا پر کیے گئے اس حملے کے پیچھے محرکات پر غور کرتے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ کیا اس کی جڑیں مشرق وسطیٰ میں ہیں؟ ہم اس پر بھی بحث کرتے رہے کہ کیا یہ مغرب کے خلاف ”دہشت گردی کی جنگ“ کا حرف آغاز ہے، اور اس کا لندن میں کیا رد عمل ہوگا جہاں ہم برسوں سے دہشت گردوں کی سرگرمیاں برداشت کرتے آ رہے ہیں۔

جب میں نے گھر پہنچ کر اپنے پورٹریٹل ٹی وی کا سوئچ آن کیا تو اس میں کچھ عرصہ سے چلی آنے والی خرابی کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے تھر تھراہٹ اور جھلملاہٹ کے بعد ایکشن میں آگیا اور دن بھر کے واقعات سنائے جانے لگے۔ پتہ چلا کہ چند گھنٹے پہلے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سیون، جو کہ 47 منزلہ اور ہے، طیارے کی ٹکرائے سے پھنسنے والے نقصان کی وجہ سے منہدم ہو چکا ہے، اور امدادی کام کرنے والے 200 فائر مین اور 78 پولیس مین لاپتہ ہیں۔ صدر بوش نے بارکسڈیل ایئر فورس بیس لوزیانا سے اعلان کیا کہ ”حفاظتی انتظامات کئے جا رہے ہیں کوئی غلطی مت کیجئے امریکا ایسی بزدلانہ حرکتیں کرنے والوں کو ڈھونڈ نکالے گا اور انہیں سخت سزا دے گا۔“ اس تقریر کے الفاظ سے دلیری، قوت اور جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔ مگر پھر کیا ہوا کہ:

اس سے ایک شرمناک حرکت سرزد ہوگئی کہ لوزیانا میں اتنی زوردار تقریر کرنے کے بعد وہ وہاں سے کھسک کر نبراسکا کی آفٹ ایئر فورس بیس جا پہنچا۔ جو امریکی سٹریٹجک کمانڈ کا اڈہ ہے جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نیویارک کو اپنی پہلی ”پورٹ آف کال“ (مستعمل بندرگاہ) بناتا، پھر واشنگٹن جاتا اور اس کے بعد پٹسبرگ جاتا۔ اگرچہ میر اپنے سیاستدانوں اور شاہوں پر بھی یہی تبصرہ ہے کہ وہ آفٹ آنے پر اپنے قریب ترین بنی ہوئی خندق تک بھی نہیں جا سکیں گے۔

اگلے روز میں شراب کا نشہ اترنے کی اعضا شکنی کا درد لئے ہوئے بیدار ہوئی اور اپنے پسندیدہ ”گریزی سیون کیفے“ میں جا بیٹا کہ سنو کی پشت کے گوشت سے بھرے ہوئے سینڈوچ سے ناشتہ کروں، میرے سامنے اخبارات کا ڈھیر پڑا تھا، جن کا صفحہ اول ڈرامائی اور روح فرسا خبروں سے بھرا ہوا تھا، ان سب کو میں فوراً پڑھ گئی۔

میں دفتر پہنچی تو واقعات کے پس منظر کی سٹوریز پر کام کرتے کرتے صبح کے دو بج گئے۔ ہم نے بہت ضخیم اخبار مرتب کیا، جو پورے عملے کی محنت و جاں فشانی کا زبردست مظاہرہ اور ”All hands on deck“ کا کامل ترین نمونہ تھا۔ میں نے اپنے متعدد ایسے دوستوں، ساتھیوں اور رابطوں کو کالیں کیں جن کے نیویارک میں روابط تھے یا ہو سکتے تھے، اور پھر مشرق وسطیٰ میں اپنے رابطوں سے بات کی جن میں کچھ موڈی کردار تھے اور کچھ ناپسندیدہ قسم کے تفتیشی صحافی بنے پھرتے تھے۔ مجھے ”ہاروے نکولس“ میں اپنا فیشیل بھی منسوخ کرانا پڑا اور کرس بونے کو ایسا کرنے سے کبھی نہیں روک سکی۔ وہ سنڈے ٹیلی گراف کا ایک اسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور سنڈے مرر کا سابق نیوز ایڈیٹر بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کا ایک رپورٹر اور میرے نیوکیسل کے دنوں کا ایک ذاتی دوست کرس ہینگلز مجھے فیشیل کرانے پر مجبور کرتا رہا، میں نے خلوص دل سے اس سے وعدہ تو کر لیا کہ اچھا جاؤں گی، لیکن جب وقت کے لئے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے اور مجھے ابھی بہت سا کام نمٹانا تھا۔

خاوند، بوائے فرینڈ اور جاب

میں تو دوست بھی نہیں رکھ سکتی، خاوندوں اور بوائے فرینڈز کی تو ویسے کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ میں نے خود پر طنز کرتے ہوئے سوچا۔ میری جاب ہی ایسی ہے کہ سارا کچھ اس کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ میں زندگی کی طرف سے ڈالی گئی آزمائشوں سے نمٹنے سے کبھی نہیں تھکتی اور ہمیشہ اس پرانی کہاوت پر یقین رکھتی ہوں کہ سچائی انسان سے کہیں زیادہ انوکھی ہوتی ہے۔

حقیقی بات یہ ہے کہ ”میری زندگی“ بعض اوقات افسانے سے بھی زیادہ انوکھی ہو جاتی ہے۔ جب میں لوگوں سے کہتی ہوں کہ میری اس سے پہلے تین بار شادیاں ہو چکی ہیں تو وہ ورطہ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، انہیں بات بڑی دیر کے بعد سمجھ آتی ہے تاہم ڈیزیز کا باپ میرے ان شوہروں میں سے نہیں ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ حرام کاری کرتے رہنا یا متعدد آشنائوں سے دوستی جاری رکھنا، یکے بعد دیگرے متعدد شوہر نہ رکھنے سے کیوں بہتر ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں زندگی کے لئے بے پناہ پیاس رکھتی ہوں، اس کا پتہ میرے تعلقات کی وسعت اور گیری کلب گزارے ہوئے وقت سے چلتا ہے۔ میری دوست میری انرجی پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں، تاہم میں تین چار گھنٹے تو لیتی ہوں اور کسی کے ساتھ چپکی نہیں رہتی، اس لئے کلب جانے میں حقیقی خوشی محسوس کرتی ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ میں ایک صاحب سے یہ سن کر کتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ ہم ہمیشہ کی نیند میں کھو جانے سے پہلے اور 27 برس سوتے ہیں۔ اوہ میرے خدا ہم پورے ستائیس برس خواب غفلت میں رہتے ہیں۔ یہ بہت ہی خوفناک ہے۔ سوچئے تو یہی کہ آپ اتنے عرصے میں کتنا کچھ کھودیتے ہیں۔

میں اس بیش قیمت خلاصہ معلومات میں اس بات کا اضافہ کروں گی کہ زیادہ تر لوگ اسی طرح سوتے سوتے موت کے آغوش میں لڑھک جاتے ہیں۔ لوہ لینا نہیں تھا۔ مرا تھا، ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے۔ اس طرح نیند اختتام زندگی بن جاتی ہے۔ چنانچہ جتنا مجھ سے ہو سکے نیند سے گریز کرتی ہوں۔

میں جمعرات کو صبح تین بجے گھر پہنچی۔ ہولڈال کو دوبارہ پیک کیا، اور پیدگلٹن سٹیشن کے لئے رواز نہ ہوئی جہاں سے مجھے بذریعہ ”ہیتھرو ایکسپریس“ اپنی نیویارک کی فلائیٹ پکڑنی تھی۔ سوچا کہ چلو دوران پرواز کچھ نہ کچھ نیند کر لوں گی۔ جب میں پہنچی تو سٹیشن کے ایک سپروائزر نے بتایا کہ سروس بند ہو گئی ہے، صبح کے پانچ بجے سے پہلے شروع نہیں ہوگی۔ غضب کی سردی کے عالم میں، بیچ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے ازارا کرم مجھے پرائیویٹ کمرے میں چلنے کے لئے کہہ دیا، جہاں میں ایک کونے میں بیٹھنے کے بعد چند لمحوں میں ڈھیر ہو گئی۔ اوہ رڈ لے بس اتنی ہی ہمت تھی!

تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے جگادیا اور میں ہیتھرو ایکسپریس کے لئے چل پڑی، اور سردی سے بری طرح ٹھٹھر رہی تھی۔ میری پیدڈ لیڈر جیکٹ میری حفاظت سے قاصر تھی۔ ہیتھرو پہنچی تو انکشاف ہوا کہ میری فلائیٹ ایک مرتبہ پھر منسوخ ہو چکی ہے چنانچہ میں کشاں کشاں دفتر پہنچی جہاں سنور کے گوشت اور پائے سے تیار شدہ سینڈویچ کھائے جا رہے تھے اور میں لشکر یہ شریک دعوت ہو گئی۔

ادھر امریکا بدستور در دسے تڑپ رہا تھا، برطانیہ سے کوئی صحافی باہر نہ نکل سکا کیونکہ امریکی ایئر پیس ابھی تک بند تھی۔ میں نے دفتر سے مزید سنوریز اکٹھی کیں اور نیوز ایڈیٹر جم کو بتایا کہ مجھے صبح کی فلائیٹ ضرور مل جائے گی کیونکہ میں نے گیارہ ستمبر کو ٹکٹ خرید لیا تھا، مجھے ترجیحا سیٹ ملے گی۔

اسی لمحے میری سکرین پر ”مینی پولیس“ سے میری کزن مائیکے کی ”ای میل“ ابھری، وہ اس بات پر جھنجھلا رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کوئی طاقت امریکا پر کیوں حملہ آور ہو گئی ہے، میں اسے اس کی کئی وجوہ بتا سکتی تھی لیکن اس وقت ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہوں، فکر نہ کرو، جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ حالات، دوبارہ بالکل اُسی طرح کے نہیں ہو سکیں گے۔

امریکیوں اور انگریزوں میں فرق

میں امریکا سے محبت کرتی ہوں اور بہت سے امریکیوں کو بھی محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں، مجھے وہ جگہیں بہت اچھی لگتی ہیں جہاں فاسٹ فوڈ کے لئے لائنیں نہیں لگانا پڑتیں اور جہاں سروس بلا تو قفل جاتی ہے۔ جو کہ زیادہ تر لندن میں خارج از امکان ہے تاہم میرے خیال میں اہل امریکا صدے سے جلد بحال ہونے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتے جو اہل برطانیہ میں پائی جاتی ہے اور انہیں یہ معلوم کر کے یقیناً حیرت ہوگی کہ ان کے ملک سے باہر کے لوگوں میں سے ہر ایک ان سے نفرت کرتا ہے یا کرنے لگے گا۔ ان کے برعکس، برطانیہ کے لوگوں کی کھال صدیوں کے تجربات کے باعث موٹی ہو چکی ہے۔ آپ ایک ہاتھ میں بائبل تھام کر اور دوسرے ہاتھ سے تلوار لہرا

کر باہر کی دنیا کے سامنے زیادہ دیر دندا نہیں سکتے۔ ہم تیس سال سے دہشت گردی کی فضا میں رہ رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے اندر ”نظر انداز کرنے“ (devil-may-care) کا رویہ پیدا ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اوسط درجے کا امریکی اس صدمے سے باہر نہیں آ سکے گا۔

میں اور میرا کزن دن بھر ایک دوسرے کو ”ای میل“ کرتے رہے، اور میں اس غم کو شدت سے محسوس کرتی رہی۔ 11/ ستمبر تک اس کے ذہن پر ماہ اکتوبر میں ہونے والی اپنی شادی کا دن سوار تھا۔

اس شام، میں تقریباً آٹھ بجے سٹی ایڈیٹر رچہ ڈفلپس اور اپنے عزیز ترین دوست مارکس وائس کے ساتھ دفتر سے نکلی، وہ اب ”بزنس اینڈسٹی نیوز“ ٹیمز میں ریگولر کام کر رہا ہے۔ باہر اس وقت سخت بارش ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے وہاں ایک منتظر ٹیکسی ڈرائیور پر دھونس جمانے کا فیصلہ کیا اور اس سے کہا کہ ہم نے تمہاری کیب کمپنی کو فون کیا تھا، وہ پوری طرح ہماری بات کا قائل نہ ہوا تاہم اس نے ہم تینوں کو سوار ہونے کی اجازت دیدی۔ ہم جلدی سے نکل سکتے تھے کہ عین اسی وقت، مارٹن ناؤسنڈ لڈگیٹ ہاؤس کی سیڑھیوں سے دوڑتے ہوئے اترے اور پھلاٹکتے ہوئے اپنی ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

ہم پر اس وقت منکشف ہوا کہ ہم رنگے ہاتھوں پکڑ لئے گئے ہیں۔ انہوں نے ہم تینوں کو ڈاکو قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہیں ہم جیسے آوارہ مزاجوں کو بھرتی کر کے ایسی ہی حرکت کی توقع کرنی چاہیے تھی۔ ہم کھیانے ہو کر ہنسنے لگے تاہم انہوں نے ہمیں راستے میں اتار دینے کی پیشکش کر کے بٹھالیا۔ ہم نے بھیگی بلی کی طرح خاموشی سے سفر کیا اور بالآخر فلیٹ سٹریٹ میں اتر کر پیزا اور سستی سی شراب کے لئے چل پڑے۔

رچہ ڈنے کہا، بری طرح پھنس گئے تھے تاہم بچ نکلے ہیں، اور میں نے جواب دیا، میں جب بھی ایسی حرکت کرتی ہوں، عین موقع پر پکڑ لی جاتی ہوں۔ ہم نے ایسے جملوں سے اپنی گھبراہٹ دور کر لی، اور ایک خوفناک دن کا انجام بخیرہ ہوا۔

اس کے بعد مرد لوگوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی اور میں گیری کلب کی طرف چل پڑی جہاں کی فضا بے حد آزادانہ ہے، آپ جتنی چاہیں شرمناک حرکت کر ڈالیں، کوئی آپ کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔

اگلی صبح، جمعہ کو میں پھر ہتھرو وین میں تھی جہاں میری ملاقات امریکن مڈویسٹ کی ایک مضبوط ڈیل ڈول کی خاتون کے غیر معمولی خاندان سے ہوئی جس پر مجھے اپنی ماں جانکس اور دو بہنیں دیو اور بل یاد آ گئیں۔

انہوں نے 11/ ستمبر کو ہتھرو وائر پورٹ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ ٹرانس اٹلانٹک (بحر اوقیانوس پار کی) فلائٹس کے معطل ہو جانے کا اعلان ہو چکا تھا مگر وہ باہر جانے والے اولین مسافروں میں شامل ہونے کا تہیہ کئے ہوئے تھیں۔ انہوں نے وقت گزاری کے لئے اپنے معمولات خود وضع کر لیے اور ایر پورٹ سٹاف انہیں وقفے وقفے سے پیسٹریاں اور کافی فراہم کرتا رہا۔

میں انہیں ناشتے کے لئے لے گئی اور ان سے پوچھا کہ کیا انہیں برطانیہ اچھا لگا ہے، اور انہوں نے یہاں کیا کیا دیکھا ہے؟ ان کے ذہن پیچھے اپنے گھر میں پھنسے ہوئے تھے، اور انہیں بار بار خیال آ رہا تھا کہ کس کس پر کیا کیا ہوتی ہوگی؟ ان کی فلائٹ دراصل ٹیک آف کر گئی تھی لیکن جب 11/ ستمبر کے واقعات کی فلیسکیل تفصیلات موصول ہونے لگیں تو طیارے کو ہتھرو واپس لانا پڑ گیا۔ لیکن جب تک طیارہ ایر پورٹ ٹرمینل پر اتر نہ گیا، انہیں اس کے خوفناک ”یو ٹرن“ کی وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی۔

میں جب نیویارک کے متبادل تخت کے لئے قطار میں لگی تو یہ سن کر میں بے چینی محسوس کرنے لگی کہ اولین ترجیح ان امریکنوں کو مل رہی ہے جو گھروں کو واپس جانا چاہتے ہیں، اور وہ کافی تعداد میں تھے۔

نیویارک سے آنے والی ان بے چاری روحوں کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ جن رشتہ داروں کو چھوڑ کر آئے ہیں، ان میں سے کوئی اب تک زندہ ہے یا نہیں؟

میری ماں نے مجھ سے میرے موبائل پر گفتگو کرتے ہوئے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا مجھے نیا ٹکٹ مل گیا ہے؟ ماں میرے کاموں میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہے اور حسب ضرورت، میری عملی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ ہر کسی کی طرح وہ بھی نیویارک میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں پوچھ رہی تھی، اس نے یہ سوال بھی کیا کہ میں وہاں کہاں قیام کروں گی اور اپنے فرائض کیسے ادا کروں گی؟

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، اور یہ بھی بتایا کہ اگر میں وہاں ہوتی، مجھے مس ڈیزی کا ”ویک اینڈ“ بہت یاد آئے گا جو 28/ ستمبر کو شروع ہو رہا ہے۔ ماں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ مجھے ہر گز پریشانی نہیں ہونا چاہیے، وہ اور میرا والد اسے لیک ڈسٹرکٹ جا کر خود لائیں گے۔

2001ء کے واقعات کے ضمن میں جب میں دوپٹی انیئر پورٹ پر پہنچی تو میں اسلام آباد کے حوالہ سے سوچنے لگی میں نے اسے اپنے لئے ایک موقع اور ایک چیلنج کے طور پر لیا۔ ٹھیک ہے کہ میں نیویارک جانا اور اس کے لوگوں سے ملنا چاہتی تھی، کہ دیکھو وہ اب کس حال میں ہیں، میں انہیں درد و کرب میں پاتی تو لا محالہ میری تمام خوشگوار یادیں مٹ کر رہ جاتیں۔

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خود سے کہا، جم ٹھیک ہی کہتا تھا کہ مجھے اس وقت اسلام آباد میں ہی ہونا چاہیے تھا، یہ وہ جگہ ہے جہاں اس خوفناک سنو ری کا دوسرا باب شروع ہو رہا ہے، جو ہمیشہ کے لئے تاریخ کی کتابوں میں رقم ہو جائے گا۔

میں اسی وقت میرا موبائل بجنے لگا، یہ میری ماں جانس تھی اس کی حیرت کا تصور کیجئے، اس نے مجھ سے پوچھا، کیا نیویارک میں پہنچ گئی ہو؟ میں نے اسے بتایا کہ میں کہا پانی جا رہی ہوں۔ اس نے پوچھا میں غلط سمت میں کیوں جا رہی ہوں؟ میں نے ہر جوش انداز میں جواب دیا، تاکہ اسے پریشان ہونے سے بچا سکوں، میں نے اسے بتایا کہ میں اسلام آباد کی طرف جا رہی ہوں، شاید میں یہ بھی کہہ بیٹھتی کہ شیطان کے ساتھ ڈانس کرنے چلی ہوں۔ مگر وہ تو آتش زیر پا تھی، پروگرام میں اتنی بڑی تبدیلی کو کیسے برداشت کرتی۔

اندازہ ہے کہ 43 سال کی ہو گئی ہوں (اب تو ساری دنیا جانتی ہے) لیکن وہ مجھے اب بھی فیملی کی بے بی اور اپنی ننھی بیٹی سمجھتی ہے، میں نے اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی موٹر تیزی سے گھوم رہی تھی اور اس کی زبان شعلہ بار تھی۔ اگرچہ وہ 73 برس کی ہے لیکن چیخنے چلانے لگتی ہے تو بڑی خوفناک چیز دکھائی دیتی ہے۔ میں جب بھی گلے گلے مصیبت میں پھنسی ہوں تو وہ کسی نہ کسی مرد کو اس کا ذمہ دار سمجھتی ہے، اب وہ جم مرے (میرے ایڈیٹر) پر کولہ باری کر رہی تھی اور اسے فون کر کے اپنے دل کا سارا غبار نکال دینا چاہتی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس نے مجھے کسی رومی دلال کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو، اور کہا کہ میں دوبارہ تمہیں کبھی ملوں گی ہی نہیں۔

پھر بولی، اگلے طیارے سے سیدھی واپس لندن پہنچو اور میرے باپ نے درمیان میں اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ مجھے کوئی معقول جاب کرنی چاہیے اور یہ کہ میں فوراً گھر پہنچوں۔ اگر میں اپنے کام کو نوعیت کے حوالے سے ماں کی تشویش کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ میں اپنے نئے لباس کی وجہ سے گلی محلے میں بدنام ہو کر اندھیری گلی میں جا پھنسنے والی ہوں۔

میں نے اس سے التجا کی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے اور خدشہ ظاہر کیا کہ اگر اس نے آفس میں ایسا فون کر دیا تو میں تمسخر کا بدترین نشانہ بن جاؤں گا۔

میرے لباس پر ماں کا اعتراض

مجھے یاد آیا کہ پچھلی دفعہ جب وہ دونوں میرے پاس ”ویک اینڈ“ کے لئے آ کر ٹھہرے تھے تو انہوں نے مجھے کوئی ”معقول کام“ کرنے کی التجا کی تھی، اس وقت میں ”دی نیوز آف دی ورلڈ“ کے لئے کام کر رہی تھی، اور صبح کے دو بجے گھر لوٹی تھی، میں ”ہارو“ میں S&M پارٹی میں شرکت کر کے آئی اور اس وقت میں نے انتہائی تنگ کپڑے، نشر نیٹ زیر جامہ اور پی وی سی سکرٹ پہنی ہوئی تھی اس کے ساتھ ڈاگ کالر اور کچھ جھکڑیاں لگائی ہوئی تھیں جو نوکدار بیلٹ کے ساتھ آویزاں تھیں۔

میں نے آہستگی سے چلتے ہوئے پکٹن ڈور کھولا، تاکہ ماں پر یہ ظاہر ہو کہ میں ہاٹ چوکیٹ ڈرنک بنا رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ بڑبڑائی اور کہا کہ میں اس بے ہودگی کو چھوڑ کر کوئی آہر و مندانہ کام ڈھونڈوں۔ میں نے اسے واضح اور واضح لفاظ میں کہا، اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں کوئی گشتی طوائف بن گئی ہوں تو جان لیجئے کہ میں ”دی نیوز آف دی ورلڈ“ کے زیر سایہ کام کر رہی ہوں۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا ہاں مجھے سب پتہ ہے، اسی لئے تو کہتی ہوں کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔

میں جانتی ہوں کہ میری کچھ ذمہ داریاں ہیں، ڈیزی میری خصوصی ذمہ داری ہے، جسے پالنا پوسنا اور تربیت دینا بہت اہم کام ہے، مجھے اپنی جاب سے بھی محبت ہے، میں نہیں چاہتی کہ میری ایک محبت دوسری محبت کے تقاضوں کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو میری جاب کے بارے میں سمجھ نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک صحافی کے لئے اپنے پیشے کے دائرہ سے باہر کے لوگوں سے، ان کی توقع کے مطابق تعلق رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

میرا پہلا شوہر ”کم“ (Kim) تھا، اسے میں اس وقت سے جانتی تھی جب میں چودہ سال کی تھی۔ وہ صحافت کو ایک گندہ پیشہ سمجھتا تھا اور اس سے شرم محسوس کرتا تھا۔ اس کی خوشی صرف ایسے کام میں تھی کہ میں کسی آفس میں صبح 9 بجے سے 5 بجے شام تک رہتی۔ جب ہماری شادی ہوئی تو میں نے فلیٹ سٹریٹ میں ڈیلی میل کی ملازمت مسٹر دکر کے اس کی بجائے ”ناردرن ایکو“ میں ایک عہدہ سنبھال لیا۔ ”کم کی ناڈ“ ”نائن برج“ کے گرد لپٹی ہوئی تھی، وہ اس کے

نیو باریک کی بجائے اسلام آباد

انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں لیکن جب دو منٹ کا فاصلہ رہ گیا تو میرے موبائل کی بیل بج گئی۔ یہ میرا بس جم تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بس چند منٹ رہ گئے ہیں، جونہی ٹکٹ ملے گا، میں اسے کال بیک کروں گی۔ لیکن اس نے مجھے جو جواب دیا وہ سن کر میں سنائے میں آ گئی۔ اس نے کہا نیویارک کو بھول جاؤ اور اس کے بجائے سیدھی اسلام آباد پہنچو۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنی قوت کو یابی سے محروم ہو گئی ہوں۔ میں نے خود کو یہ کہتے ہوئے محسوس کیا کہ میرے تمام ملبوسات ڈاؤن ٹاؤن نیویارک کے لئے چیک ہوئے تھے، گھٹیا ایشیا کے کسی نئے قسم کے بازار کے لئے نہیں خریدے گئے تھے۔

جم کے اس فیصلے کا کیا محرک تھا، میں اس سے بے خبر تھی ہم چند غنتوں ہی سے ایک دوسرے کو جاننے لگے تھے، اور ہم ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے، وہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھا، اسے لیڈی رپورٹرز سے ڈیلنگ میں کوئی ”مسئلہ“ درپیش نہیں تھا جیسا کہ بعض نیوز ایڈیٹروں کو ہوا کرتا ہے۔

لیکن اب میں اس کے فیصلے پر اعتراض شروع کر رہی تھی، اس نے میری ٹائل کو فوراً محسوس کر لیا اور کہا کہ سنووری اب افغانستان اور پاکستان سے شروع ہونے والی ہے، یہ اب وہ جگہ ہے جہاں ہمیں موجود ہونا چاہیے۔ میں پھر بھی دلی طور پر قائل نہ ہو سکی اور بڑبڑاتے ہوئے کہا، ”اچھا جاتی ہوں اسلام آباد کا ٹکٹ لینے“۔ ٹریش ایروریز نے اس روز کے لئے پاکستان کے دارالحکومت کے لئے اپنی تمام پروازیں منسوخ کر دی تھیں لیکن کسی نے مجھ سے کہا کہ میں اگلے ٹرمینل جا کر ایمیریشز ایرلائیز کے لئے کوشش کروں۔

میں اسی طرح منہ بسورتی ہوئی ایمیریشز ڈیسک پر پہنچی اور اسلام آباد کا ٹکٹ مانگا۔ انہوں نے مجھے لندن ٹالا ہور براستہ دوئی ٹکٹ کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ میرے لئے لاہور سے اسلام آباد کی انٹرئل فلائٹ کی بکنگ کرانا، بہتر رہے گا۔ میں بے دلی سے اُدھر گئی، طبیعت ابھی تک بو جھل تھی۔ ایمیریشز کے طیارے میں جا بیٹھی، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ طیارہ حیرت انگیز طور پر پُر تعیش اور آرامدہ تھا۔ میں قدرے مطمئن ہو کر ”ان فلائٹ بریجنٹ جونز“ مووی دیکھنے لگی۔ میری اپنی ترجیح تو دوران سفر کتاب بنی ہوتی ہے تاہم یہ بہت دلکش فلم تھی، میں اس میں کھو گئی۔

کچھ دیر بعد کمپیوٹر سکرین پر (جو میرے سامنے تھی اسے ہیڈ ریٹ میں لگا دیا گیا تھا) میں نے شطرنج کی متعدد گیمیں کھلیں، اور جب میں نے آخر میں کمپیوٹر کو شکست دیدی تو ہم دوئی میں اترنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ میں دوئی سے بہت محبت کرتی ہوں، اس کے ساتھ میری کئی یادیں وابستہ ہیں۔ خلیج کی جنگ کے زمانے میں نیو کیسل میں ”سنڈے سن“ کیلئے کام کر رہی تھی، ایک فوٹو گرافر مائیکل سکاٹ اور میں ”آرے ایف ہرکولیس“ ٹرانسپورٹریٹروں کو بند مٹھی کے انگوٹھے کا اشارہ دیکر لفٹ لے لیتے تھے اور مشرق وسطیٰ میں گھومنے کا مزہ لیا کرتے تھے۔

منصوبہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا، اس طرح ہم متعدد بار رائل فلیٹ آگزیلری جہازوں پر بھی جو آہنائے ہرمز میں گشت پر مامور تھے، میر کرتے پھرتے تھے۔ یہ معمول بہت دلچسپ و مسرت انگیز تھا حتیٰ کہ وہ دن آ گیا کہ ہماری گھر کی آخری پرواز منسوخ ہو گئی اور ہم دوئی میں پھنس کر رہ گئے۔

میرے پاس اپنے شوہر نمبر 2 کا امریکن ایکسپریس کارڈ اب بھی موجود تھا، چنانچہ میں نے اسے خوب جی بھر کر استعمال کیا۔ اور ایک اعلیٰ درجے کے ٹھنڈے ہوٹل میں ہفتہ بھر قیام کیا حتیٰ کہ ہمیں ”آرے ایف کی پرواز پر ایک اور مفت کی لفٹ مل گئی۔“

میں نے اپنے دفتر میں اخراجات کا بل پیش کیا جو اندازاً 2000 پاؤنڈ بنتا تھا، اس سے میرے ایڈیٹر جان میک گرک کو دل کا دورہ پڑتے پڑتے رہ گیا، اس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”ہٹو واہیات عورت، میرے پاس گل چھروں کے لئے رقم نہیں اور نہ ہی بجٹ میں کوئی گنجائش ہے۔“ میں نے اسے کہا ”یہ ادائیگی تو آپ کو کرنا ہی پڑے گی، میں نے اپنے سابق شوہر کا ایکسپریس کارڈ استعمال کیا ہے، اگر آپ اسے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میرے خلیج کے ٹرپ کے بل اس کے ذمہ ہیں تو پھر یونہی ہی۔“

چند دن بعد وہ اور اس کا، اس دور کا ڈپٹی ایڈیٹر کرس رٹن ایڈیٹر ریل بجٹ کی جانچ پڑتال کر رہے تھے، تو انہیں بجٹ میں کئی ہزار ڈالر فالتو نظر آ گئے جن میں سے میرے بل کی بہ آسانی ادائیگی ہو گئی، اس کے عوض سکاٹی (مائیکل سکاٹ) اور میں نے میلوں لمبی پکچر سنو ریز پلائی کیں جو جنگ خلیج کا پورا عرصہ کام دیتی رہیں۔

میک گرک، اسکے بعد ”ڈیلی ریکارڈ“ میں چلا گیا، بعد ازاں اس نے ”سکاٹ لینڈ آن سنڈے“ میں کام کیا اور اب وہ ایڈیٹر میں ”سکاٹ میڈیا“ کے ایڈیٹر ریل ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا ہے۔

”نیچے کی طرف“ جا ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک سال سے بھی کم عرصہ گزرا تھا کہ ہماری شادی خطرے میں پڑ گئی اور بالآخر ٹوٹ گئی، اس طرح آٹھ سال کے تعلقات ختم ہو گئے۔ دو سال بعد 1983ء میں، میں نے جم میکفوش سے شادی کر لی، وہ ریجنل کرائم سکوواڈ میں پولیس سارجنٹ تھا، وہ بڑا اجر اتمند اور ولولہ خیز مرد تھا اور عمر میں مجھ سے 20 سال بڑا تھا، وہ اپنے پیشے میں اچھی طرح دھنسا ہوا تھا اور میں اپنے پیشے میں بتدریج ابھر رہی تھی۔ پھر میں ”نیوکیسل جرنل“ میں چلی گئی اور کچھ عرصہ بعد ”سندے سن“ سے منسلک ہو گئی۔ جہاں میں نے ایک انوار کے اخبار کے لئے رپورٹنگ کا پہلی بار ڈاٹک چکھا۔ فلیٹ سٹریٹ نے مجھے ایک بار پھر اشارہ دیا لیکن اگر ”کم“ نائن برج کے ساتھ ”ویلد“ پایا گیا تو جم میکفوش بھی اسی کی کمر سے بندھا ہوا تھا، اور وہ لندن منتقلی کے سوال پر غور ہی نہیں کر سکتا تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com

مردوں کا شاونم

میں میکشوش سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی، چنانچہ میں گفتگو کے دوران کبھی اسے جتا ہی نہ سکی کہ وہ عورتوں سے خود کو برتر سمجھنے والا مرد (شاو نزم زدہ) ہے، میں اگلے چند سال علاقائی پولیس کے گروڈرڈنپن بائنگ کرتی رہی اور ہر "جنش" کے ساتھ پروموشن پاتی رہی، جس سے مجھے اپنے حلقے میں عزت و توقیر ملتی رہی۔ 1990ء تک جم اور میں ایک دوسرے سے بہت دور بٹ چکے تھے اور پھر میں نے ایک ناقابل معافی اقدام کر دیا، وہ یہ کہ میں "میری ٹوریل آرمی" میں شامل ہو گئی۔ 1992ء میں میری ڈیوڈ سے ملاقات ہوئی جو کہ ڈیزی کا باپ ہے، ہم 1996ء تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد میں نے ایک اسرائیلی روحانی موش سے شادی کر لی جو دو سال تک رہ سکی۔ یہ جدائی ڈیوڈ والی جدائی سے مختلف تھی، یہ دوستانہ علیحدہ گی نہیں بلکہ بدتر انداز میں ہوئی، اس کے بعد سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔

دوئی انٹرپورٹ کے عین وسط میں امی سے ہونے والی گفتگو نے مجھے ذہنی طور پر تھکا دیا۔ طبیعت سخت مکر تھی چنانچہ میں فون بند کرنے کے بعد میں گھومتی گھومتی سی فوڈ کے کاؤنٹر پر جا پہنچی اور مچھلی کے اچار، جھینگا، چٹے کیک مع سفید انگوروں کی عمدہ شراب "شارڈو نے" کا آرڈر دیا۔ یہ میرا امی سے دودو ہاتھ کرنے کا ایک طریقہ رہا ہے، کیونکہ وہ "فضول خرچیوں" پر بہت ناراض ہوتی ہے، میں نے خوب ڈٹ کر کھایا اور ٹھنڈی شراب کا ایک ایک قطرہ مزے لے لے کر حلق سے اتارا۔ کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ بس یہ ایک ہی بار ہے، پاکستان پہنچی تو ایسا نہیں کر سکوں گی۔ میں گرم اور مصالحہ دار غذا پسند نہیں کرتی اور سبزی و پھل بھی نہیں کھاتی چنانچہ میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتی تھی کہ اگلے چند ہفتے میں کھا سکوں گی یا نہیں۔ پھر سگریٹ یاد آ گئے، ہاں مجھے سگریٹ ضرور لے لینے چاہئیں۔

شراب کے آخری قطرے پینے کے بعد میں مسکرائی اور سوچا، میں جاکس سے لڑائی جیت چکی ہوں لیکن اس کا مطلب لازماً جنگ ہی جیتنا نہیں۔ میں نے خدا سے دعا کی کہ کہیں ماں نیوز ایڈیٹر کو فون نہ کر دے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایسا کرنے سے کتنی رسوائی ہوگی؟ سونے کی یہ ڈلی کسی "پرائیویٹ آئی" یا کسی بڑے سائز کے اخبار کے زہریلے ڈائری نوٹس کے ہاتھ لگنے میں کتنی دیر لگائے گی؟

میں اپنی امی ابو سے محبت کرتی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیں، اور یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کیا میں ڈیزی کے جوان ہوتے ہوتے، اپنی ماں کی طرح ہی بن جاؤں گی؟ اس میں مجھے شک ہے، یعنی ایسا ہونا یقینی نہیں۔ ڈیزی ان بچوں میں سے نہیں جن کی زندگی اتفاقات سے عبارت ہوتی ہے، وہ ایک ایسا بچہ ہے جسے دوہرا استحکام حاصل ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کرے گی، میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ اس میں کوئی خطرہ مول لینے والی بات ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہ لازماً کوئی بری بات ہے، موزون لوگوں کو موزون کام ہی ملتے ہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب ہم کینیا گئے اور ایک سفاری میں سیر کر رہے تھے۔ ایک جگہ ہم نے ایک بہت بڑے سائز کا کچھوا دیکھا جسے کیلے کھلائے جا رہے تھے۔ اس کے مالک نے ڈیزی سے پوچھا کیا وہ اس پر سواری کرنا چاہتی ہے؟ اس نے زور سے سر ہلا کر انکار کیا، میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے حسب معمول اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا.... "موقع ہے آگے بڑھو" لیکن وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلی۔ اتنے میں اس شخص نے اسے اٹھا کر کچھوے تک پہنچا دیا اور یہ اس کی پشت پر جم کر بیٹھ گئی۔ سیکنڈوں میں اس کے چہرے سے خوف کے آثار غائب ہو گئے اس نے ہنسنا شروع کر دیا اور اپنی تصاویر بنانے کی فرمائش کرنے لگی۔ کئی تصویریں بنائی گئیں اور یہ بے حد خوش رہی۔ بعد میں، میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے پہلے سوار ہونے سے کیوں انکار کیا تھا؟ اس نے بتایا کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ کچھوا اسے لے کر بھاگ جائے گا۔ ہم دونوں اس پر بہت ہنسیں۔ میں نے اسے اپنے چند معتقدات میں سے ایک اسے پھر یاد دلایا۔ "موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤ کیونکہ بعض اوقات ہمیں دوبارہ ہاں کہنے کا موقع کبھی نہیں ملتا۔"

جونہی فلائیٹ نے دوئی سے ٹیک آف کیا، وقت کے فرق نے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں اور میں اونگھتی رہی تاوقتیکہ ہم لاہور پہنچ گئے۔ جہاں میں اندرون ملک پرواز کے لئے انتظار کرنے لگی۔ اتنے میں دو آدمی دکھائی دیئے جو یقیناً ٹیلی ویژن چینلس گزر رہے تھے۔ مجھے اس کا اندازہ ان کے طرز عمل اور ان کے مووی کیمروں سے ہوا۔ چند خوشگوار جملوں کے تبادلے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ چیک ٹیلی ویژن سے تعلق رکھتے ہیں اور افغانستان جانا چاہتے ہیں، کوشش کر رہے ہیں کہ پشاور کے راستے سے داخل ہو جائیں۔ خیر میں نے انہیں الوداعی کلمات کہے پھر ہم سب اسلام آباد کی فلائیٹ میں بیٹھ گئے۔

اسلام آباد پہنچی تو مجھے ایک ٹیکسٹ میسج موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ایکسپریس نیوز پیپر نے میری بکنگ

”بیسٹ ویسٹرن ہوٹل“ میں کرا دی ہے اور ساتھ کرائے کی کاروں کی ایک فرم کاریفرنس بھی دے دیا۔“ کرائے کی کار؟“ اس پر میں حیران ہوئی، میں دنیا کی بدترین کارڈرائیوروں میں سے ہوں اور دوسری ویمن ڈرائیورز کو بھی اچھے نام سے نہیں پکارتی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جب تک یہاں رہوں گی گاڑی نہیں چلاؤں گی۔

ٹیکسی بلوائی اور ”بیسٹ ویسٹرن“ کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے لندن سے روانگی سے قبل جو دوڑ بھاگ کی اور پھر یٹھروائیر پورٹ پر جو انتظار کیا وہ کسی صورت 36 گھنٹے سے کم نہ تھا، اس لئے میں اس وقت غسل کی سخت ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ مجھ سے یقیناً شتر بان کے جاگلیئے کی سی بدبو آرہی ہوگی، اس لئے میری طبیعت بہت بیزارتھی۔

ہوٹل کے استقبالیہ کا آدمی ششدر رہ گیا، اس نے بتایا کہ میری ریزرویشن کینسل کر دی گئی ہے کیونکہ میرے آنے کی توقع نہیں کی جارہی تھی۔

یہ غالباً ایک بے حد پرانا حربہ ہے۔ کوئی رپورٹر اچانک کہیں آٹیکا ہوگا، اس نے جب ہوٹل کو پوری طرح بُک پایا تو اس نے میری (”یو آنے رڈ لے“ کی) کینسلیشن کال کرا دی اور کمرہ ہتھیا لیا، کیا وہیات حرکت کی اس نے۔ ایسی ناگہانی مصیبتوں کے پیمانے یا گہرائی کو تو جانے دیجئے۔ بعض نوسرباز اپنے صحافی ساتھیوں کو بھی زک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہ سب اپنی گھٹیا درجے کی ذہنیت اور ”نمبر 1“ کہلانے کی سستی خواہش کے مظاہرے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب دسمبر 1988ء میں ”لا کر بی“ کا سانحہ ہوا تھا، ہوٹل روم بکنگ اور بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ریزرویشن کے لئے کیسی کیسی چھچھوری حرکتیں اور دھکم پیل کے شرمناک مناظر دیکھنے میں آئے تھے۔

ایک حرکت جو خاص طور پر تاملی ذکر ہے یہ تھی کہ ”ڈیلی سٹار“ کا ایک رپورٹر جس نے ایک بریک فاسٹ ٹیلی ویژن پریزنٹر سے کمرے کا قبضہ لیا تھا، اسے یہ دیکھ کر شدید صدمہ ہوا کہ اس کا سوٹ کیس کھول کر دوبارہ پیک کیا گیا ہے اور راہ داری میں پڑا ہوا ہے۔ ہوٹل والا بھی سخت پریشان تھا کیونکہ اسے ایک کال ملی، جس میں کہا گیا تھا کہ ٹی وی پریزنٹر کو ”ڈیلی سٹار“ کے آدمی کے آنے سے فوراً پہلے چیک آؤٹ ہو جانا چاہیے تھا۔

چنانچہ میں بھی کسی حرامزادے کی ایسی ہی کمینی حرکت کا نشانہ بنی تھی۔ میں اس وقت سخت تھکی ہوئی تھی، قبل اس کے کہ میں ہنگامہ کھڑا کر سکتی، ایک اور ٹیکسی ڈرائیور آگیا اور مجھے میریٹ ہوٹل بھیج دیا گیا وہ بھی پوری طرح بک ہو چکا تھا، ایسا لگتا تھا کہ دنیا بھر کے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں نے اسلام آباد پر ہلہ بول دیا ہے۔

میریٹ کے ریپشنسٹ نے ظاہر تو بڑے افسوس کے ساتھ معذرت کی یا وہ اپنی اس خوبصورت لابی کے ایریا سے مجھے فوراً باہر نکال دینا چاہتا تھا، شاید میں اس وقت ان لوگوں کی طرح لگتی تھی جو نام طور پر کٹر میں پائے جاتے ہیں، چنانچہ اس نے چند ایک کالیں کیں اور مجھے کراؤن پلازا بھیج دیا۔

صحافتی مہم جوئی

میرے لئے غالباً اس سے بہتر حالات میسر آنا ممکن نہ تھے یہ ہوٹل دنیا بھر کے صحافیوں سے بھرا ہوا تھا اور برطانیہ سے ایک بھی نہ آیا تھا۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میں کچھ تفرّد پسند (Isolationist) ہوں، غول میں شریک وہ کرشکار کرنا مجھے کبھی نہیں بھایا۔ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتی تھی، مجھے اپنے کام سے غرض تھی جو میں کسی کی مداخلت کے بغیر کرنا چاہتی تھی۔ مجھے ان فرسودہ خیال ساتھیوں کی بے ڈھب گفتگوؤں سے بیزاری سی محسوس ہوتی ہے جو یہ پوچھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے کہ آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟ کیا پوچھیں گی اور اس سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ میں اپنے ”نیوز آف دی ورلڈ“ سے وابستگی کے دنوں کی بات کرتی ہوں، کہ کوئی رپورٹر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے رپورٹر سے کسی بھی صورت میں یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور نہ کوئی ایسے سوال کی توقع کرتا تھا۔ یہ کام کی راز داری اور پیشے کے محفوظ ہونے کا معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ دنیا کے انتہائی پیشہ ورانہ امور میں سے ہے جس کے لئے میں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ کام کیا ہے۔ اگرچہ اس کی شہرت مبالغہ آرائیوں اور رائی کا پہاڑ بنا دینے کی ہے لیکن اس میں زیادہ صداقت نہیں ہے۔

میں اپنے وہاں کے تجربے کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ اخبارات کبھی من گھڑت اور کردار کشی پر مبنی ستوری بناتے ہوئے 20 فیصد تفصیلات اپنے پاس روک لیتے ہیں، اگر نشانہ بننے والا شخص احتجاج کرے یا قانونی چارہ جوئی کر ڈالے تو باقیماندہ 20 فیصد باتوں کو اگلے ہفتے کی اشاعت میں عام طور پر ترک کر دیا جاتا ہے۔

وہاں سے میں سنڈے سائمنز میں گئی اور ڈیوڈ لیپارڈ کے ساتھ کام کیا۔ وہ کئی ماہ تک ”Insight“ (اصل حقائق) کی ٹیم کا سربراہ رہا پھر اسے کنٹریکٹ کی پیشکش کر کے مین نیوز روم میں تعینات کر دیا گیا۔ لیپارڈ کے ساتھ کام کرنا میرے لئے باعث فخر و مسرت تھا تاہم جب اپنے رابطوں یا ذریعہ اطلاع کو تحفظ دینے کا معاملہ سامنے آتا ہے تو وہ ایک سچ مچ کی خفیہ گلہری بن جاتا ہے اور ذمہ داری کے تعین کا مسئلہ آئے تو ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہوا جاتا ہے۔ بہر حال میں اس کی اہلیت اور طریق کار کی بے حد معترف ہوں۔ میں نے اس کے ماتحت ”انسائیٹ“ کے لئے کچھ عرصہ تفتیشی رپورٹنگ کر کے بہت کچھ سیکھا ہے، میں تصور کر سکتی ہوں کہ وہ میرے موجودہ حالات میں بھی میرا مددگار ہے گا۔

اچھا تو اب اسلام آباد کے کراؤن پلانز میں آمد کی بات کرتی ہوں، مجھے خوشی ہوئی کہ وہاں میں اکیلی ہی تھی۔ میں نے ٹیلی فون پر نیوز ڈیسک ملایا، جم مرے کو کافی خوشگوار پایا۔ اندازہ ہوا کہ میری ماں نے خود پر قابو رکھا ہے اور اسے کال کر کے مجھے فوراً واپسی کی پرواز سے منگوانے اور مجھے کشیدہ کاری کے کالم انچارج بنانے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں پسینہ پسینہ ہو رہی ہوں، جسم بد بودار ہو چکا ہے اور نہانے کی اشد ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ وہ ایک خوش مزاج اور صاحب فراست آدمی ہے، اس نے مجھے کہا کہ تمہارے پاس وقت تو کافی ہے، تین بجے سہ پہر سے پہلے پہلے ایک دو صفحے کا میٹرل تقریباً ایک ہزار الفاظ کیج دو۔ اس میں ابھی تین گھنٹے کا وقت ہے، وہاں ”کچھ اور“ پیش آیا ہو تو وہ بھی سنا۔ ساتھ ہی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

میں نے اپنی ہولڈ آل کھولی تو دیکھا کہ کسی خبیث نے زپ اور لائینگ کے درمیان کی سیلانی کو کاٹ دیا ہے، جب میں نے سب کچھ باہر نکال کر دیکھا تو تین آئیٹم غائب تھیں، میرے والد کے جرابوں کے دو جوڑے۔ اس میں موجود نہ تھے (اب ڈھونڈنے سے نہ ملیں تو سمجھ جائے گا کہ ”رڈ لے ویمن“ نے اس کی جرابوں والی دراز پر چھاپہ مارا ہے) تو تھ پیسٹ کی آدھی ٹیوب بھی خالی ہو چکی تھی، اس نے تو میرا جی متلاتا ہے۔

تاہم میرے منہ میں سے کتے کی سانس کی طرح کی بد بو آتا تو دوسری بات ہے، میں نے فرحت بخش غسل کیا اور یہ سوچتے ہوئے ہاتھ روم سے برآمد ہوئی کہ میں کس عذاب میں پھنسنے جا رہی ہوں۔ وقت ٹک ٹک کرتا ہوا دوڑا جا رہا تھا۔ سنڈے ایکسپریس توقع رکھتا تھا کہ میں ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ستوری فائل کروں جس کے لئے میرے پاس دو گھنٹے سے بھی کم مہلت رہ گئی تھی۔

واہ، میں ایک اجنبی ملک میں پھر رہی ہوں، اور تین ہوٹلوں کے ریسپشنسٹوں کے سوا کسی کو جانتی ہی نہیں ہوں۔ ان سے بھی میری کوئی بے تکلفی نہیں ہے۔ اسلام آباد شہر کے اندر گھومنے کے لئے میرے پاس موزون لباس تک نہیں۔ میرے بال بھی بد وضعی کے شاکی ہیں۔ مجھے وہاں سے روانگی سے پہلے ان کا کچھ کر لینا چاہیے تھا، لیکن اس وقت میرے پاس وقت ہی کہاں تھا؟ میں اب کیوں آہیں بھر رہی ہوں۔ کیا یہاں کے ہنیر ڈریسر زپیر کے روز، جو میری واحد ہفتہ وار چھٹی کا دن ہے، کام نہیں کرتے؟ یہ زندگی کے عظیم رازوں میں سے ایک راز ہے۔۔۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مردوں کے صرف ”نیل“ ہوتے ہیں۔ سب بے وقوفی کی باتیں میرے ذہن میں کلبلائے لگیں۔ لیکن

میں نے انہیں روک لیا اور اس کام میں مصروف ہو گئی جس کے لئے ایڈیٹر نے مجھے پابند کیا ہے۔

حضور نبی کریم کا ایک منظر

سب سے پہلے مجھے ایک انگلش سمجھنے اور بولنے والے ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ میں نے کراؤن پلازا کے ریپیشنسٹ کے پاس گئی اور اسے اپنی ضرورت بتائی۔ اس نے فوراً ایک ڈرائیور بلوایا اور ہم چل پڑے۔ مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ تو صرف ”ok“ کہہ سکتا ہے اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اسی طرح مجھے سارا سفر کرا دے گا۔ کیا خوب، واہ ری قسمت ہم پانچ منٹ بعد واپس ہوئے پہنچ گئے، میں نے پھر بڑی شائستگی سے درخواست کی کہ مجھے انگریزی بول سکے والا ڈرائیور چاہئے۔ میں پاکستانی لوگوں کو پسند کرتی ہوں کیونکہ وہ پوری طرح مددگار بننے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کبھی نہیں کہتے کہ نہیں نہیں، یہ کام نہیں ہو سکتا، جیسے بھی ہو وہ اسے کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

تاہم کراؤن پلازا کے آدمی نے اب کی بار ایسا کر دکھایا، چند منٹوں کے بعد اس نے مجھے ”پاشا“ سے ملوایا۔ جو آدھے گھنٹے کے اندر، میرا بہترین دوست بن گیا۔ خوب روانی سے انگلش بولتا تھا اور دنیا بھر میں یہ کام کرنا رہا تھا۔ بے حد خوش اطوار اور ملنسار آدمی تھا، میں جو کچھ چاہتی اسے بتا دیتی وہ کر ڈالتا وہ انتہاء سادہ، نفیس طبع اور حیرت انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی بڑی بڑی برائون آنکھیں تھیں جن میں سے خوش مزاجی جھلک رہی تھی۔ اس کا چہرہ کول تھا جسے سلیقے سے ترشی ہوئی داڑھی نے مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔ اس کے سیاہ کالے بال پیچھے کی جانب سرکنا شروع کر چکے تھے۔ لگتا تھا کہ عمر 40 برس تک ہوگی۔ جب وہ ہنستا تو سفید دانت موتیوں کی لڑی جیسے لگتے۔ سامنے کے دانتوں میں درز تھی۔ اگرچہ زیادہ لمبا نہیں تھا اوسط درجے کی باسکٹ بال گیم کھیل سکتا تھا لیکن کچھ عرصہ گھٹنے کی چوٹ کی وجہ سے بستر پر رہا تھا۔ چند دن بعد میں اسے لڑکھڑا کر چلتے ہوئے دیکھ کر صاف سمجھ جاتی تھی کہ اسے اب بھی درد محسوس ہوتا ہے لیکن وہ اس کی شکایت زبان پر نہ لاتا تھا۔

مجھے جو ہدایات ملی تھیں، ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ میں چند مقامی ریستورانوں کے مالکان اور منیجروں وغیرہ سے بھی تبادلہ خیال کروں اور پچھوں کہ سرحد پر معلق سیاسی بحرانوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے اور یہ پاکستان کو کس انداز میں متاثر کریں گے؟ عام لوگوں کے خدشات بھی نوٹ کرتی رہوں۔

چنانچہ پہلے ہم ایک چھوٹے ریستوران میں پہنچے جہاں میرا تعارف ایک منیجر سے کرایا گیا۔ ہم اس کے پاس بیٹھے، چائے پی اور گپ شپ لڑائی جو ایک گھنٹہ جاری رہی۔ مجھے جتنا کچھ مطلوب تھا، اس عرصے میں کافی حد تک حاصل ہو گیا۔ میں ہوٹل واپس آئی اور مقررہ وقت، یعنی ڈیڈ لائن کے مطابق بذریعہ فون سٹوری لکھوا دی۔ یہ صحافت کا انتہائی اہم حصہ نہیں تھا لیکن اہم اس لحاظ سے تھا کہ یہ سٹوری میری ”بائیلائن“ سمیت شائع ہونے والی تھی۔ ”یو آنے رڈ لے ان اسلام آباد“ اخبارات میں باہمی رقابت زوروں پر رہتی ہے، چنانچہ ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ”میل آن سنڈے“ کا نمائندہ ابھی تک دوپٹی ایئر پورٹ پر پھنسا ہوا ہے، کیونکہ اس کا طیارہ تاخیر سے پہنچا تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنی سٹوری فائل نہ کر سکا۔ صاف ظاہر ہے کہ ”ڈیلی ایکسپریس“ کے اندر ہی سے کسی نے ”میل آن سنڈے“ کو ٹپ دی ہوگی کہ ہم اسلام آباد جا رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے بھی اپنے رپورٹر کو ہمارے پیچھے دوڑا دیا تھا۔

مطلب یہ ہوگا کہ کئی مسلمان، عیسائی اور یہودی لقمہ اہل بن جائیں گے۔“

یہ ایک انتہائی لڑرہ خیز بیان تھا جو کسی ہیجان کے بغیر خاموشی سے دے دیا گیا، اس سے میری رو گنتے کھڑے ہو گئے۔

ہم آگے چل پڑے راستے میں، میں نے پاشا سے پوچھا کہ مولانا جس جنگ کا خدشہ ظاہر کر رہے تھے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا کہ واقعی ڈر کی بات ہے مجھے تو اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کی فکر ہے، سوچتا ہوں کہ کیا انہیں گاؤں نہ بھیج دوں۔ پاکستان کے دیگر 8 کروڑ معتدل مزاج مسلمانوں کی طرح وہ بھی جنگ چھڑنے سے خائف تھا اور اس نتائج کے بارے میں اس کا خوف بالکل بجا تھا۔

ہماری یہ گفتگو پرویز مشرف کے اپنی قوم سے اس ہیجان خیز خطاب سے پہلے کی تھی جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف امریکا کی جنگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے عوام سے بات کو سمجھنے اور ان کی حمایت کرنے کے لئے کہا تھا، وہ ایک شدید قسم کی شش و پنج میں پڑ گئے تھے لیکن ٹی وی پر ایک باوقار سیاستدان کے طور پر آئے تھے۔

ادھر سے طالبان نے پاکستان کو خبردار کیا تھا کہ اگر اس نے مغرب سے تعاون کیا تو سخت نقصان سے دوچار ہوگا، اور چند دن بعد ہمیں بتایا گیا کہ چار رسکڈ مڑائل لائنچر درہ خیبر میں طورخم بارڈر پر نصب کر دیئے گئے تھے اور ان کا رخ ہماری سمت میں تھا۔

میں نے اپنے ایک بہت اچھے دوست پال بیورکوفن کیا اور اپنی تشویش کا اظہار کیا، وہ ملٹری ایڈوائزر بھی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ رسکڈ اسلام تک نہیں پہنچیں گے تاہم مجھے راولپنڈی اور پشاور سے دور رہنا چاہیے۔ میں نے اس سے لندن کے حالات پوچھے کیوں کہ وہ مجھے بہت یاد آ رہا تھا۔

میں نے پاشا کو بتایا کہ میں افغانستان کے اندر داخل ہونا چاہتی ہوں اس مقصد کے لئے میں نے پیر کے روز سفارت خانے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیلی ایکسپریس کے نیوز ایڈیٹر ڈیوڈ لی (David Leigh) اس فیصلے پر بہت ہنساکہ میں افغانستان کے ویزے تک کے لئے کوشش کر رہی ہوں اور کہا کہ غیر ملکی صحافیوں کو تو وہاں سے ٹھڈے مار کر نکالا جا رہا ہے۔

تمہیں وہاں جانے سے کیا ملے گا، اسے چھوڑو مہاجرین کے کیمپوں میں جاؤ۔ دیکھو وہاں سے کیا کیا خبریں نکلتی ہیں۔

میں بیزاری محسوس کرنے لگی۔ دومر آقاؤں (Bosses) سے بار بار ہدایات لینا موڈ کو خوشگوار نہیں رہنے دیتا، میں پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی، میں ”ڈیلی“ اور ”سٹڈے“ دونوں کے لئے کام کر رہی تھی۔ وہ ”میڈم“ کی جھنجھٹا ہٹ سے محظوظ ہوا اور خوب ہنسا، وہ مجھے ”میڈم“ کہتا تھا۔

پھر بھی میں انہیں ایک نعمت ہی سمجھتی تھی۔ ”یہ جو ہم مرے ہے، واقعی بہت اچھا نیوز ایڈیٹر ہے۔“ میں نے پاشا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا، ”یہ بڑا پرسکون اور اپنے اوسان بحال جانتا ہے کہ ستوری کو کیسے قابل فروخت بنایا جاسکتا ہے۔ اخبار کے دفتر میں جہاں ایڈیٹر اور اس کے لفٹین (نائین) مشاورت کر رہے ہوتے ہیں کہ اگلے شمارے میں ہمنے کیا کیا دینا ہے، وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں سے ارکان عملہ کے حوصلے بڑھا رہا ہوتا ہے اور خبر کے ہر پہلو پر ان کی رائے مانگتا ہے اور پھر اپنے فیصلے بھی سنانا رہتا ہے۔“

اس کا پیشرو اس سے بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ ہماری آپس میں خاصی دوستی تھی یا میں اسے ایسا سمجھنے لگی تھی، وہ پروموٹ ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے رویے میں تبدیلی آگئی میرے لئے اس کے ساتھ ڈیل کرنا مشکل ہو گیا۔ جب اسے ہٹا دیا گیا تو مجھ سے بڑھ کر کسی کو خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے جانے کے بعد دوبارہ فرنٹ چینج پر آگئی۔ واہ کیسی نجات ملی!

ان پیشہ ورانہ باتوں سے پاشا کی سمع خراشی کرتے کرتے ہم مہاجر کیمپوں میں آپہنچے۔ بعض مناظر بڑے روح فرسا تھے۔ تلخ حقائق منہ پھاڑے سامنے کھڑے تھے، اور میں فوراً اپنے دفتر کی سیاست کو بھول گئی۔ ہمارے پاس ایک افغان فوٹو گرافر تھا جس سے ہماری پشاور میں اچانک ملاقات ہو گئی تھی، اور جیسا کہ پاکستان میں عموماً ہوتا رہتا ہے، ایک سادہ سی کارروائی ہوتی ہے تو اس کے پیچھے ایک پورا کارواں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جلدی ہی ان کا ایک رفیق کار محمد ریاض ہمارے پاس آپہنچا جو ڈان گروپ آف نیوز پیپرز سے منسلک ہے۔ محمد ریاض، جسے یہاں ہم صرف ”محمد“ کہیں گے 1999ء میں انگلینڈ میں ہوتا تھا اور کچھ عرصہ فرنٹلین روڈ لندن میں ”گارڈین“ اور ”بزنس روز“ کے دفاتر میں کام کرتا رہا ہے۔ یہ بڑا دل آویز شخصیت کا مالک ہے اور اس کا ریڈیو جی کیمپوں کے حکام میں کافی اثر و رسوخ ہے، اس سے مجھے اور میرے کام کو بہت فائدہ پہنچا جس پر میں اس کی بہت شکرگزار ہوں۔

ہم کیمپ کے اندر پھر رہے تھے اور میں اپنے آپ کو ”پانینڈ پائپر“ (ایک افسانوی ہنری سے نواز، جو بالآخر سب سے

جامعہ حقانیہ کا دورہ

مجھے بتایا گیا کہ ”میل آن سنڈے“ کارپورٹ، میرا دوست، ایان گاگر“ ہے، مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ چلو اس کے ساتھ بہت اچھی گزرے گی۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کسی اور ہوٹل میں چلا جائے، شکر ہے کہ جب بالآخر وہ پاکستان پہنچ ہی گیا تو پشاور جا پہنچا اور پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہر گیا۔

اتوار کو وہ اور میں دونوں ایک ”اسلامی یونیورسٹی“ کو دیکھنے گئے۔ جس کے بارے میں پاشا نے بتایا کہ اپنی نوعیت کا اہم ترین دینی مدرسہ ہے اور اسے پوری مسلم دنیا میں زبردست شہرت حاصل ہے، میں نے جب پاشا سے ”اسلامی ادارہ“ دیکھنے کی خواہش کا ذکر کیا تھا تو اس نے مجھے سر پر دوپٹہ لینے کا مشورہ دیا تھا چنانچہ ہم راولپنڈی چلے گئے اور ایک دکان سے سیاہ پشمینہ سائل شال خرید لی میں نے پاشا کو واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ ”کلچرل“ مسئلوں میں میری صحیح رہنمائی کرے، اور اسے یہ بھی کہا کہ اگر درست رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے میری کوئی حرکت یا بات غلط ہوئی تو اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ اس لئے پوری دیانتداری بلکہ سخت دیانتداری سے میری رہنمائی کرنا، کیونکہ میں پہلے تمہارے ملک میں کبھی نہیں آئی۔

چنانچہ میں نے ایک لمبا سیاہ ڈریس، اپنا لیدر اور اونچی ایڑی والے سینڈل پہن لئے۔ یہ لباس بہت آرام دہ تھا۔ جب ہم صوبہ سرحد کے شہر نوشہرہ میں اس ”یونیورسٹی“ (جامعہ اسلامیہ حقانیہ اکوڑہ خٹک) کے قریب پہنچے تو ایک غیر نمایاں قسم کی چونے سے سفید شدہ عمارت دکھائی دی جس کے اوپر ایک جانب سادہ سا گنبد بنا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے یہ بمشکل ہی یقین آ سکا کہ یہ مسلم دنیا کے نمایاں ترین دینی اداروں میں سے ایک ہے۔ تاہم مجھے پتہ چلا کہ ہر سال ہزاروں بارلش نوجوان یہاں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور ان میں سے 90 فیصد اپنے ہیرو اسامہ بن لادن اور طالبان کو دیکھنے کے لئے افغانستان پہنچتے ہیں۔ بن لادن کے پاس اس انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کی ازاں ی ڈگری بھی ہے، اس یونیورسٹی کو ”جامعہ حقانیہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ سیاسی طور پر بھی بہت اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ امریکن اسے ”سکول برائے دہشت گردی“ کہیں گے لیکن جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے یہ ”مرکز علوم عالیہ“ (Center of academic excellence) ہے اور ہارورڈ، آکسفورڈ یا کیمبرج کے بالکل مساوی سطح کا علمی ادارہ ہے۔ یہاں کا آٹھ سالہ کورس اسلامی علوم کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے، دنیا بھر کے مسلم نوجوان اس کی طرف مہم طیس کی مانند کھینچے ہوئے آتے ہیں، اس کے سربراہ مولانا (پروفیسر) سمیع الحق ہیں جو دفاع افغانستان و پاکستان کوئل کے چیئرمین بھی ہیں، انہیں نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ وہ لاہور میں ہیں اور پاکستان اور افغانستان کے چند بڑے بڑے علما کے ایک اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں، بعد ازاں اس رات انہوں نے صدر پاکستان، پرویز مشرف سے ملاقات کرنا بھی اور انہیں موجود سیاسی فضا کے بارے میں مشورہ دینا تھا۔

مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا، جہاں دونو جوان چٹائیوں پر سو رہے تھے۔ مجھے بیٹھنے اور انتظار کے لئے کہا گیا۔ تھوڑی دیر میں مولانا کے صاحبزادے حامد الحق حقانی آ پہنچے اور ہم چار زانو ہو کر بیٹھ گئے اور باتیں شروع کر دیں۔

اسامہ بن لادن پر الزام تراشی

حامد بھی ایک مولانا ہیں جنہوں نے مجھے بتایا کہ اس ادارے کے سنئیر اساتذہ کئی کئی بار اسامہ بن لادن سے ملاقات کر چکے ہیں۔ حامد نے کہا کہ ملاقاتیں کرنے والے علما کا تاثر یہ ہے کہ بن لادن ایک کامل درجے کا مومن ہے۔ نہایت متقی اور پرہیزگار آدمی ہے جس نے مغرب کی طرف پیٹھ موڑ لی ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ جارج بش یا ٹونی بلیر اس سے اتفاق کریں گے لیکن میں اس پر عزم نوجوان کی باتیں بڑی توجہ سے سنتی رہی۔ انہوں نے کہا کہ امریکا کی طرف سے کارروائیوں کی دھمکیوں کی وجہ سے سخت پریشان ہیں اور اس الزام کو قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد قرار دیا کہ یہ دارالعلوم متعصب اور دہشت گرد تیار کرنے کے لئے چلایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں کے طالب علم، نظم و ضبط کے خوگر ہیں دینی تعلیم کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں رکھتے، یہاں کوئی ہتھیار نہیں ہیں، حتیٰ کہ چاقو تک نہیں ہیں۔ انہوں نے امریکا کے اس الزام کی سختی سے تردید کی کہ 11 ستمبر کے حملوں کے پیچھے اسامہ بن لادن کا ذہن یا ہاتھ کارفرما تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کو افسوسناک قرار دیتے ہوئے اس سے اتنی ہی نفرت کا اظہار کیا جتنی کہ مغرب کے لوگ کرتے ہیں۔ میں نے پاکستان میں جتنے لوگوں سے اس معاملے پر گفتگو کی وہ ان وحشت ناک واقعات کو نرم سے نرم الفاظ میں بھی ایک سانحہ کہہ رہے تھے۔

حامد نے کہا، ”اسامہ جب روسیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ تو امریکا کے لئے ایک ہیرو تھا، اب وہ اسے دشمن کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ اگر لفظوں کی یہ جنگ اسی طرح جاری رہی تو یہ ایک تیسری عالمگیر جنگ بن جائے گی۔ اس کا

انتقام لیتا ہے) کی طرح محسوس کرنے لگی۔ میرے ساتھ کمپ کے حکام، پاشا، غفار بیگ اور ”محمد“ (ریاض) تھے جو مجھ سے چند قدم ہٹ کر پیچھے پیچھے آرہے تھے ان کے عقب میں درجنوں کی تعداد میں متجسس بچے چلے آرہے تھے اور ہم پھنپھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن جب میں ٹھہر جاتی وہ بھی ٹھہر جاتے اور چلنے لگی تو وہ بھی چلنا شروع کر دیتے۔ آخر میں میں معاً پیچھے مڑی اور حکام سے کہا کہ وہ میرا تعاقب چھوڑ دیں۔ میں نے بات اس لئے کہی کہ ان کی وجہ سے وہ لوگ جن سے میں کوئی بات کہوں گی یا کچھ پوچھنا چاہوں گی، وہ خوفزدہ ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے میری درخواست قبول کرنے سے انکار دیا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

پچھنے پرانے کپڑوں میں ملبوس یہ ننھی افغان بچی، اکیلی اور ناخوش بیٹھی ہوئی تھی، اس کی کوئی تعلیم نہ ہو سکی، نہ اس کے پاس کھلونے تھے اور نہ اس کی آنکھوں میں اُمید کی کوئی جھلک تھی۔ اس کی واحد تفریح یہ کیتلتی تھی جس میں کھولتے پانی کے چھینٹے کسی وقت بھی اڑ کر اس کی خالص زردی مائل جلد پر آبلے ڈال سکتے تھے۔ اسے کوئی پتہ نہیں تھا کہ اس کیلئے اگلے وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا، اور وہ اس دوزخ نمائیکہ میں مایوسیوں میں گھری بیٹھی تھی۔

زندگی کی نا انصافیوں کا کوئی شمار ہی نہیں۔ اس بے چاری سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی کہ یہ اس قسم کے حالات کی سزا وار ٹھہری؟ ان باتوں سے کسی وقت تو انسان اپنے ایمان کو مشکوک سمجھنے لگتا ہے، خواہ آپ کا مذہب کوئی بھی ہو۔ اس ممنون، بچی کی یہ کیفیت پتہ نہیں کب تک مجھے پریشان رکھے گی۔

غیب اتفاق ہے کہ آپ خواہ کتنے ہی اپنے پیشے سے مطلب رکھنے والے ہوں کبھی نہ کبھی ایسی ضرب آگتی ہے کہ آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے، اور آپ کو اپنے بچے کی یاد دلا کر آپ کے سامنے ایک سوال کھڑا کر دیتی ہے۔ جب بھی اس پیاری سی بچی کا خیال آتا ہے تو میں گلوگرنہ ہو جاتی ہوں۔

جب ہم کمپ کے مختلف حصوں میں گھومنے لگے تو ہم عفار بیگ کے ذریعے ہر کسی سے کچھ نہ کچھ پوچھتے رہے وہ افغانستان کی بولی، پشتو میں گفتگو کرتا تھا، پھر پاکستان کی زبان اُردو میں پاشا کو بتاتا۔ جو مجھے انگلش میں مطلب سمجھا دیتا۔ اس طرح ہم ایک بڑی ٹیم بن گئے، پشتو، اُردو اور انگلش تینوں زبانیں چل رہی تھیں۔ جس سے ”بین الاقوامی تعلقات“ کا قیام عمل میں آ گیا۔

بی بی سی کے عملے پر پتھر اُڑاؤ

اس روز ہمیں سویرے سویرے پتہ چلا کہ بعض افغان مہاجرین نے بی بی سی کے عملے پر پتھراؤ کیا ہے کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ برطانیہ ان کے ملک پر فضائی حملے کرنے والا ہے، دوسرے مغربی جرنلسٹ بھی اس پتھراؤ کی زد میں آئے۔ میرا خیال ہے مہاجرین کے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ ان کی چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح نمائش لگا دی گئی ہے، جو کوئی بھی باہر سے آتا ہے، اسے خیمہ بستیاں دکھائی جاتی ہیں۔ مہاجرین نے میڈیا کی ”مداخلت“ پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا، میں ان کے احتجاج کو ناجائز نہیں سمجھتی۔

میں نے یہ بات نوٹ کی کہ امدادی ایجنسیاں، اب وہاں نہیں تھیں۔ ان کے دفاتر خالی پڑے تھے۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ انہیں پاکستانی حکام نے کیمپوں سے چلے جانے کو کہا تھا کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ افغانستان پر امریکی اور برطانوی بمباری کی صورت میں افغان مہاجرین کا رد عمل کیسا ہوگا۔ یہ شبہ بھی تھا کہ ممکن ہے مہاجرین نے کیمپوں کے ارد گرد اسلحے کی بھاری مقدار چھپا رکھی ہو اور اس صورت میں وہ دوبارہ لڑنا شروع کر دیں۔

افغان پیدائشی طور پر لڑاکا ہوتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر تیرہ چودہ سال کی عمر کو پہنچتے ہی خود کار ہتھیار یا کلاشنکوف خرید لیتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی ان کی قومی تفریح ہوتی ہے اور صدیوں سے ایسا ہی چلا آ رہا ہے، کبھی آپس میں لڑتے ہیں اور کبھی مداخلت کاروں کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھ پر یہ انکشاف بعد میں ہونے والا تھا کہ ان کی عورتوں کا خمیر، ان کے مردوں کی مٹی سے بھی زیادہ سخت جگہ سے اٹھایا گیا ہے۔

پاکستان کے ریٹھیو جی کیمپوں میں لاکھوں افغان رہتے ہیں اور پشاور کو کئی پہلوؤں سے تو وسیع شدہ افغانستان پر بمباری کا سلسلہ شروع کر دیا تو ان کی اس مہم کو ملک کے اس حصے سے کوئی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔

یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ افغان درشت اور بے قابو (Ungovernable) قسم کے لوگ ہیں، غالباً ان کا مزاج کسی حد تک صوبہ سرحد کے لوگوں سے ملتا ہے جن کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملکی قوانین کو خاطر میں نہیں لاتے اور خطے میں سیاسی ایجنٹوں سے بھی بادل نخواستہ رابطے استوار کر لیتے ہیں۔

”ایکسپریس“ کے فارن ایڈیٹر گبرائیل میلانڈ نے مجھے فون کیا اور کہا کہ میں اخبار کے ٹائٹیل کے لئے کوئی زبردست جذباتی قسم کی خبر بھیجوں، میں اس کیلئے بھی کام کر رہی تھی۔ لیکن جب میری خبر اخبار میں پہنچی۔ کسی نے اس کا ذہن تبدیل کر دیا تھا، تو اس کی بجائے ایک سیدھی سی سنووری چھاپ دی گئی، جسے دیکھ کر میری طبیعت بے حد مکڑ رہوئی۔

اگلے روز پاشا اور میں افغان سفارت خانے گئے، جہاں میں نے ویزا کے لئے درخواست دی۔ میں ویزا آفس میں جانے کے لئے مین عمارت کے عقبی حصے کی طرف گئی تو مجھے صحن کے ایریا میں سے ہو کر گزرنا تھا جہاں چند مرد مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے میرے سر پر سکارف تھی اور پورا بدن ماسوائے پاؤں کے ڈھانپا ہوا تھا اور میں نے آرامدہ لیڈر کے سینڈول پہن رکھے تھے۔ ان میں سے صرف بچے دکھائی دیتے تھے ناخنوں پر میں نے قرمزی رنگ لگایا تھا۔

میری طرف سے لباس کا یہ اہتمام، ان کی تہذیب کے احترام کے طور پر کیا گیا تھا لیکن ویزا آفس کا آدمی اس سے متاثر نہ ہوا، اس نے میری درخواست کاغذوں کے ایک ڈھیر پر ڈال دی جہاں 50 اور درخواستیں بھی پڑی تھیں۔

میں نے محمد سے کہا کہ میں تو ایسے حالات میں کام نہیں کر سکتی۔ میں ایسے مہاجرین سے گفتگو کرنا چاہتی تھی جو پچھلے چند دنوں میں یہاں پہنچے ہیں۔ دس سال پہلے یا اس سے بھی پہلے آئے ہوؤں سے مجھے کچھ بھی نہیں پوچھنا۔ اس نے میری بات پاشا اور غفار کو پہنچائی چنانچہ ہم یہاں سے چھوڑ کر ایک اور کمپ کی طرف روانہ ہو گئے، اور اس میں داخل ہونے کے لئے ہمیں اجازت لینا تھی۔ میں نے پاشا سے کہا کہ اگر ہم نے اجازت طلب کی تو انہیں ”نہ“ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن اگر ہم سیدھے اندر جا پہنچے تو ان کے لئے ”ہاں“ کہنا نسبتاً آسان ہوگا۔ اس نے میری منطق سے اتفاق کیا لیکن خدشہ ظاہر کیا کہ میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔

محمد ہماری پارٹی سے الگ ہو کر کچھ سفری کاغذات لانے چلا گیا، اور اس نے پورے وثوق سے کہا کہ اسے افغانستان میں انٹری ویزا ملنے کی قوی امید ہے، مجھے اس پر بہت رشک آیا۔

بہر کیف ہم جلوزنی کمپ میں داخل ہو گئے۔ یہ پاکستان میں سب سے بڑا ریفریوجی کمپ تھا۔ اس میں بہت دگداز مناظر تھے۔ ان میں سے بعض افغان انتہائی غلیظ حالت میں دکھائی دے رہے تھے، یہ لوگ بیس سال سے بھی پہلے یعنی اس وقت آئے تھے جب افغانستان پہلی بار جنگ میں پھنسا تھا۔

یہ گھروندے کچڑ اور اینٹوں سے بنائے گئے تھے اور ان میں موسم گرما میں آنے والے تازہ ترین لوگ تھے جو عارضی کیمپوں کے خیموں میں رہ رہے تھے۔ مرد ادھر ادھر بکھرے ہوئے بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے اور بچے کھیل کود میں لگے ہوئے تھے۔ عورت کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی جو کہ مردوں کے زیر تسلط قائم معاشرے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

اگر انہیں باہر آنا پڑ ہی جائے تو ان میں سے زیادہ تر اس حال میں باہر نکلتی ہیں کہ وہ بڑے سے نیلے کپڑے میں مکمل طور پر لپٹی ہوتی ہیں جسے برقع کہا جاتا ہے، اس قدیم وضع کے غلاف کو دیکھتے ہی اس کے اندر گرمی اور جس ہونے کا گمان پیدا ہونے لگتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں مر بھی جاؤں تب بھی ایسی چیز نہ پہنوں۔ اگرچہ مغربی عورت بھی اب تک مردانہ تعصب کا شکار چلی آرہی ہے لیکن ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر حالات میں ہے۔

عورتوں کے نانٹ کا مسئلہ

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شام کے ڈھلنے سے پہلے کوئی عورت باہر نہیں نکلتی شام ہی کو انہیں حاجت ضرور یہ یا نہانے دھونے کے لئے پبلک ٹوائلٹس کے لئے جانا ہوتا ہے، اگر دن کے وقت نکل آئیں تو انہیں ”بے شرم“ سمجھا جاتا ہے۔

اس سے میری طبیعت بے حد مگد رہوتی۔ ایسا کیوں ہے کہ عورتوں سے اپنے ضروری حوائج کو بھی کنٹرول کرنے کی توقع بنادھ لی جاتی ہے؟ وہ ایسا نہ کر سکیں تو انہیں احساس شرم و حیا سے عاری سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف مرد ہیں خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، انہیں حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت اور جہاں چاہیں پیشاب کر سکتے ہیں۔ کیا آپ مردوں کو یہ کہنے کی جرات کر سکتے ہیں کہ وہ شام کا اندھیرا چھا جانے تک نانٹ استعمال نہیں کر سکتے؟ کیا آپ اس نامعقول حرکت کا تصور کر سکتے ہیں؟ میں تو اس کے کھلے نام مظاہرے دیکھتی ہوں۔

میں اس مسئلے کو اٹھانے کیلئے کوئی لطیف پیرایہ اختیار کرنے پر غور کر رہی تھی، تاکہ بات بھی کہہ دوں اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو۔ اتنے میں سامنے کا ایک منظر دیکھ کر مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک بچی چولہے کے پاس بیٹھی کیتلی میں سے ابلتے ہوئے پانی میں پتلی سی چھڑی بار بار بلارہی تھی۔ وہ اپنے کلوہوں کے بل اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا زردی مائل سانولا بے داغ چہرہ اس کے میلے کپیلے گٹھنوں پر ٹکا ہوا تھا، اس کے بڑی بڑی اور کول کول بھوری آنکھیں چہرے پر بہت نمایاں تھیں۔ اس کی خمیدہ زلفوں کی بھری ہوئی لٹیں اس کے اداس خدو خال کو مزید نمایاں کر رہی ہیں اور وہ آگ اور ابلتی ہوئی کیتلی کے خطرناک حد تک قریب بیٹھی تھی۔

یہ تو کسی بھی سانحہ کے لئے ایک دعوت تھی، لیکن میری سانس اس کی وجہ سے نہیں رُک رہی تھی، یہ بچی تو میری ڈیزی ہو سکتی تھی، دونوں تقریباً ایسی جیسی تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور گلابی گھنٹا گھنٹا گھنٹا۔

میری بچی اس وقت ایک صاف ستھری اور استری شدہ یونیا فارم پہنے اپنی دوستوں کے ساتھ اس سکول میں ہوئی جو بیٹرکس پارک کے مضافات میں لیک ڈسٹرکٹ کی خوبصورت پہاڑیوں میں بنا ہوا ہے اور وہاں سے جھیل (لے ونڈر میسر) کا حسین منظر دکھائی دیتا رہتا ہے۔ وہ ہر رات دوستوں کے ساتھ کھیل کود کے بعد گرم پانی سے غسل کر کے اجتماعی خواب گاہ میں جاتی ہے اور سونے سے پہلے ان کے ساتھ ایک دوسرے پر تکیے چھینکنے کی لڑائی کا شوق بھی پورا کر لیتی ہے۔

ہر صبح اٹھنے کے بعد گرم گرم ناشتہ کرتے ہوئے بھی دوسرے بچوں کے ساتھ اس کا ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ جاری رہتی ہے۔ ڈیزی آدمی فلسطینی ہے اور دوسرے فلسطینی بچوں کی بہ نسبت اسے مراعات بھی زیادہ حاصل ہیں۔

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ اس نے ایسا کرنے کے بعد منہ سے کیا کہا ہے لیکن مجھ پر تاثر یہ پڑا کہ میرا ویزا 9 بجے صبح تک تیار ہو جائے گا۔

پاشا نے کہا، اگر مجھے ویزا مل گیا تو وہ مجھے، سرحد پار، افغانستان کے اندر لے جائے گا۔ ”میڈم میں آپ کو اکیلے تھوڑا ہی جانے دوں گا، آپ کو تو حفاظت کی ضرورت ہے میں آپ کی حفاظت کروں گا۔“

اس دن کے لئے ہمارا پروگرام بندوکش کے بلند و بالا پہاڑوں کے سائے میں دکھائی دینے والے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جانے کا تھا جہاں بہت سی کنٹینر اور کولہ بارود تیار کئے جاتے ہیں، جہاں متعدد غیر قانونی کودام اور چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں ہیں، جن میں آٹھ آٹھ سال کے بچے اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ سنواری سن کر میرا وہاں جانے کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پبلیکیشن محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com

میری طبیعت سخت خراب ہوئی، میں حیران تھی کہ پہلے وہ یہ بتائے کہ وہ اس ہینڈ گن کے ساتھ کیا کر رہی تھی؟ لیکن اس روز میں نے ایک بہت قیمتی سبق سیکھا: اور وہ یہ کہ کبھی کھلے سامان اور بیگوں کے ساتھ ایئر پورٹس پر نہیں جانا چاہیے۔

پاشا نے مجھے ٹھوکا لگا کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور میں نے اپنے پیروں میں اُلجھے ہوئے خیالات کو جھٹکا دے کر پیچھے دھکیلا اور پاکستانی گن شاپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہاں چلتے چلتے اس نے مجھے بتایا کہ اس اسلحہ سازی کے لئے درکار دھاتیں ملک کے جنوب میں ٹوٹے پھوٹے بحری جہازوں کے لمبے سے حاصل کی جاتی ہیں۔ گاؤں میں پہنچنے کے بعد ڈھال کران سے بھدڑی شکل کی کنیں بنائی جاتی ہیں اور پھر یہ مرد اور لڑکے پرانی خراہ مشینوں کی مدد سے انہیں دیدہ زیب ہتھیار میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ کیا میں چند تصویریں بنا سکتی ہوں، اس پر مایک نے چھوٹے بچوں کو جھڑک کر دور ہٹا دیا اور اپنے آدمیوں سمیت تن کر کھڑا ہو گیا۔ جب میں نے اس سے یہ کہنے کی کوشش کی کہ کیا میں ان لڑکوں کو بھی تصویر لے سکتی ہوں، اس کا موڈ تبدیل ہو گیا اور پاشا نے مجھے کہا کہ چھوڑو جتنی جلدی ہو سکے، ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

اس نے بتایا ”ان کا خیال ہے کہ آپ ان مسیحی امدادی ورکروں میں سے ہیں جو چھوٹے بچوں کو کام پر لگانے کے مخالف ہیں۔“ یہ کتنی حیرت کی بات تھی کہ وہ ایک صحافی کو تو اپنے آس پاس دیکھنا چاہتے ہیں لیکن امدادی کارکنوں کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم روانہ ہونے لگے تو ایک اور آدمی نے میری آستین کھینچی اور کہا کہ میں اس سڑک کے پار چل کر اس کی شاپ دیکھوں۔ جب ہم پار اس کی شاپ میں پہنچے تو اس نے اپنی گاہک بکری کو کھینچ کر راستے سے ہٹایا تا کہ میں اندر داخل ہو سکوں۔ اندر دیوار پر کلاشکوفیں، نیم خودکار اور دیگر قسم قسم کی کنیں قطار در قطار آویزاں تھیں۔ سب نقلی اسلحہ تھا مگر قتل کر سکتا تھا پھر اس نے مجھے ایک گھناؤنا سا سگریٹ لائٹر کے سائز کا ہتھیار دیکھایا، یہ بھی ایک بد نما گن تھی جو ایک گولی چلا سکتی تھی۔

اس شخص نے مجھے پاشا کے ذریعے بتایا کہ یہ محض ایک ”کھلونا“ ہے اس سے گولی چل سکتی ہے مگر اس وقت تک باعث ہلاکت نہیں بن سکتی جب تک ”قاتل“ کسی کے بالکل قریب پہنچ کر گولی نہ چلا دے۔ عین اسی لمحے فضا نیم خودکار گن کی اچانک فائرنگ سے مرتعش ہو گئی اور میں بدحواس ہو کر اچھل پڑی، پاشا نے نلک شکاف تھپتھپہ لگایا اور دکاندار نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں مرتعش سے آنے والی کوئی عجیب و غریب چیز ہوں۔

دونوں مردوں نے آپس میں کوئی بات کی اور پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ باہر ایک بار پھر ریپڈ فائر ہوا اور اس کا شور پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ پتہ چلا کہ اس ضلع میں یہ قبائلی جاگیرداروں کے مابین آٹے روز ہونے والے دنگ فساد کا حصہ ہے۔ یہاں ڈکیتیاں اور لوٹ مار، زندگی کا عام چلن ہے۔

مختلف قبیلوں کے مابین لڑائیاں صدیوں سے چلی آرہی ہیں، جو کسی بھی معمولی بات پر شروع ہوتی ہیں، انتقام در انتقام کا سلسلہ نسلاً بعد نسل جاری رہتا ہے۔ پاشا نے سیانوں کے سے انداز میں کہا کہ یہاں ایک کہاوت ہے کہ اگر تمہارا ہاتھ تمہارا چچا زاد بن جائے تو اسے کاٹ ڈالو۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن میں اس کے معنوں سے اب بھی لاعلم ہوں۔ جب باہر ”خاندانی دشمنوں“ کی آوازیں تھم گئیں تو ہم باہر نکلنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھنے لگے تو میری نظر المونیم کے چمکدار روتوں میں لپٹی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاشا کو متوجہ کیا تو وہ جواب دیئے بغیر مجھے وہاں سے جلدی جلدی باہر لے آیا۔ ان ”مسکور پپر“ میں ہیروئن تھی۔ اور کھلے عام فروخت کیلئے پڑی تھی۔ میں اس پر ہر فروخت ہوئی تاہم پاشا مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا کارکی طرف لے گیا، جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس نے کہا ”میڈم بعض اوقات آپ خطرناک باتوں میں ناگ اڑا دیتی ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ آپ کہیں مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

میں نے اسے کہا، فکر نہیں خدا میرے ساتھ ہے۔ ایک دوسرا محاورہ بھی ہے شیطان اپنی دیکھ بھال آپ کر لیتا ہے۔ اس پر وہ ہنسا اور بولا اگر میں ہیروئن کی تجارت پر کچھ لکھنا چاہوں تو وہ اس کا کچھ نہ کچھ انتظام کر سکتا ہے۔ اس پیشکش پر میں بے حد خوش ہوئی کیونکہ یہ بہت اہم بات ہے افغانستان اور صوبہ سرحد کے بعض حصے دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئن پیدا کر رہے ہیں۔ طالبان اگرچہ اس کی پوری شد و مد سے تردید کر رہے ہیں، ان کی جنگی مشینری موجود ہے جو میرے خیال میں ہیروئن کی تجارت کے منافع سے چل رہی ہے۔ ان کے لیڈروں نے غالباً اس حقیقت سے اتفاق کر لیا ہے کہ یہ گھناؤنی چیز باہر سمگل ہو رہی ہے جہاں یہ اہل مغرب کی رکوں میں ہی زہر گھولے گی چلو تمہاری بات منظور، ہم اسے اپنا گلہ پروجیکٹ بنائیں گے۔

اس رات کراؤن پلازما میں آکر میں نے خبر کی ایک کاپی جم کو بھیجی اور فوٹو ایک قریب واقع کیمرہ شاپ سے ڈیویڈپ کرائے، ریزلٹ بہت اچھے آئے چنانچہ ہم انہیں لے کر ایک انٹرنیٹ کیفے میں گئے اور انہیں سکین کرا کر لندن بھیج

دردِ آدم خیل میں اسلحہ سازی

بالآخر ہم دردِ آدم خیل پہنچ گئے جس کے بارے میں، میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ ادھورا اور غیر اہم ساقصبہ ہے، یہ کسی حد تک امریکا کی ابتدائی تاریخ کے زمانے کے دیہات کی مانند ہے جنہیں وائیلڈ ویسٹ موویز میں جنگلی کبریوں والے علاقوں کے طور پر دکھایا جاتا ہے، پاشا اور میں ایک گلی کی طرف جانے لگے، جس میں ایک ایک کمرے پر مشتمل کھلے لاک اپ جیسے گیراج تھے، مرد اور چھوٹے چھوٹے لڑکے 80 سال پرانی خرا د مشینوں پر کئی کئی قسم کے ہتھیار بنا رہے تھے۔ پاشا نے ان سے مختصر سی بات کی اور انہیں میرے بارے میں بتایا کہ میں کون ہوں اور کیا پابندی ہوں؟ اس پر انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا، ایک شخص جو غالباً گیراجوں کا مالک تھا تپاک سے ملا، اس نے میرا خیر مقدم کیا اور پاشا کے ذریعے میرے سوالوں کا جواب دینے لگا۔

آپ خواہ کیسی بھی گن مانگیں یہ فوراً تیار کر دیتے ہیں، اس وقت یہاں چینی پستول بنائے جا رہے تھے، حتیٰ کہ یہ اسلحہ ساز کمپنی ”نرکو“ کا ٹریڈ مارک بھی بنا دیتے ہیں۔ یہ کتنی دیدہ دلیری ہے! انہوں نے مجھے تیس ڈالر میں ایک پستول دینے کی پیشکش کر دی لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس سے انکا مالک بہت مایوس ہوا امریکی ڈالر یہاں کی دوسری غیر سرکاری کرنسی ہے بلیک مارکیٹ کا دھندہ بھی خوب زوروں پر ہے۔

پاشا نے مجھے کھینچ کر ایک طرف کر دیا اور کہا میں نے اچھا فیصلہ کیا ہے، کیونکہ یہ کنیں قابل اعتبار نہیں ہوتیں، 50/60 راؤنڈ چلانے کے بعد کسی کام کی نہیں رہتیں۔ میں اپنے فیصلے کی داد ملنے پر بہت خوش ہوئی۔ بھلا میں کیوں گن خریدتی اور کس ضرورت کے تحت کولیاں چلاتی۔ یہ تو میرے بس میں ہی نہیں تھا۔ ہاں البتہ میں اب تصور میں ہتھیار اوئیر پورٹ پر کسٹمز کے عملہ کے تاثرات سے عاری چہروں کو دیکھ رہی ہوں، انہوں نے پوچھا تمہارے پاس کوئی قابل اعتراض چیز تو نہیں تو میں کہہ رہی ہوں کہ بس صرف ایک پستول ہے کیا یہ ٹھیک ہے ناں؟

میں یہاں ذومعنی جملہ کہنے پر معافی چہاتی ہوں، ذہن میں کبھی کبھی ایسے خیالات آ جاتے ہیں تو میں ان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتی۔ چند سیکنڈوں کے بعد میرا ذہن بیروت ایئر پورٹ پر 4/ جنوری 1997ء کے ایک واقعے کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک ہفتے سے کچھ زیادہ دن لبنان میں گزارے تھے، وہ بہت خوبصورت جگہ ہے، اور میں حسب معمول لیٹ تھی۔ میں دیوانہ وار بھاگتی ہوئی ایئر پورٹ میں داخل ہوئی اور ہولڈال اور کھلے ہوئے بیگ کو کھینچتی ہوئی آرہی تھی، مسافر سیکورٹی چیکنگ کے مراحل میں سے گزر رہے تھے، اور ان کے سامان کے ایکس ریزو غیرہ ہو رہے تھے، میں بے صبری سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میری باری آئی میرا سامان اور ہینڈ بیگ ایکس رے مشین میں سے گزرا اور میں بھی سیکورٹی چیک میں سے گزر گئی۔

جب میں دوسری سائیڈ پر پہنچی تو ایک لبنانی انسپکٹر کے ہاتھ میں میرا بیگ تھا اس نے پوچھا کہ کیا یہ میرا ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے لینے کے لئے گئی تو اس نے اسے پیچھے کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ اسے شناخت کرتی ہیں؟“ اس نے اپنا ہاتھ بیگ کے اندر ڈال کر اس میں سے ایک ہینڈ گن نکالی، جو اس کی چھوٹی انگلی کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

”میں نے گن اس سے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں“ میں نے اپنی بے گناہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے سازش کے تحت اسے میرے بیگ میں ڈال دیا ہوگا۔“ پھر میں نے سوچا، اس نے ایسا احتجاج سینکڑوں مرتبہ سنا ہوگا۔ اب تو بیروت کی کسی جیل میں ہی جانا ہوگا، میرے ساتھ یہ حرکت کیوں کی گئی ہے، میرے دوست میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے ماں کیا کہے گی؟ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ سب یہی کہیں گے کہ میں کوئی اخباری کرتب دکھانا چاہ رہی تھی جو قبل از وقت ناکام ہو گیا ہے۔

عین اسی لمحے پیچھے سے ایک عورت کے چہنچہنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر جو دیکھا، وہ میرے طرف کوئی اشارہ کر رہی تھی، اس کے چھوٹے سے بیٹے کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سیکورٹی گارڈ جھڑکتے ہوئے اسے کچھ کہہ رہا تھا۔

لبنانی انسپکٹر نے میرا بیگ مجھے واپس دیتے ہوئے الوداعی انداز میں نمٹا دیئے جانے کا اشارہ کیا، میں نے جلدی سے شکریہ ادا کیا اور اس کے نتیجے کا انتظار کئے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی پرواز تک پہنچ گئی جس کی روانگی میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔

میں طیارے میں سوار ہونے کے لئے لائن میں لگی تھی کہ میرے پیچھے آنے والے شخص نے، جس نے یہ ڈراما دیکھا تھا، مجھے بتایا کہ میں بال بال بچی ہوں، اس عورت کے لڑکے نے ازراہ مذاق یہ گن میرے بیگ میں ڈالی تھی اور جب اس کی ماں نے گن دیکھی تو الزام لگا دیا کہ میں نے اس کے بیگ میں سے اسے چوری کر لیا ہے۔

دیا۔

مثالی حالات ہوتے تو ہمارے پاس اپنا فونو گرافر ہوتا اور تصاویر فوری طور پر بھیجی جاسکتی تھیں۔ تاہم یہاں حسبِ خواہش حالات نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں اپنی سوچھ بوجھ سے ہی کام لینا پڑتا تھا، اور ایک بات یہ بھی ہے کہ میں اکیلے ہی کام کرنا پسند کرتی ہوں، دوسرے لوگوں کے کام کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

پشاور جاتے ہوئے ہم راولپنڈی کے مضافاتی علاقے میں ایک انگریز کونسل ہاؤسنگ ایسٹیٹ کے قریب جا کھڑے ہوئے جو کہ پاکستان انٹیلی جنس سروس (آئی ایس آئی) کے سابق ڈائریکٹر جنرل، جنرل حمید گل کی رہائش گاہ ہے۔ اس ملاقات کا انتظام پاشا نے کیا تھا کیونکہ وہ کسی کی کزن کے بھائی کو جانتا تھا جو جنرل حمید گل کی خالہ کے بھائی سے بنی ہوئی تھی۔ میں اس رشتہ داری کی پیچیدگیوں کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتی تھی اور نہ ایسی واقفیت کے موثر ہونے کا پوری طرح یقین آ رہا تھا تا وقتیکہ سابق جنرل نے فون پر مجھ سے بات کر لی اور اپنے گھر آنے کی دعوت دیدی۔ انہوں نے طالبان کا بڑے جوش و خروش سے ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ حال ہی میں افغانستان سے واپس آئے ہیں انہیں پچھلے ماہ ہونے والی فوجی پریڈ دیکھنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ پریڈ، ان کے کہنے کے مطابق تین گھنٹے جاری رہی، کیونکہ طالبان کی ساری کی ساری فوجی قوت ان کے سامنے پیش کر دی گئی تھی۔

جنرل حمید گل نے ان کے ٹینکوں، مزائلوں اور بموں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا کہ نوجوان طالبان یہ تصور کر کے جوش سے ساپنی ہتھیلیاں رگڑتے ہیں کہ وہ دن کب آتا جب امریکی اور برطانوی فوجی ان کے ملک پر حملہ کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ افغان زبردست لڑاکا قوت ہیں جو پچھلی صدی میں دو دفعہ برٹش آرمی سے نبرد آزما ہوئے تھے اور انہوں نے روسیوں کو بھی دس سال روک رکھا ہے۔ میں ان کی باتیں سنتے ہوئے سوچتی رہی کہ میں برطانیہ کی "M15" کی سابق ڈائریکٹر جنرل سٹیلا ریمنگٹن کے پاکستانی ہم عصر کے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کی طرح کسی کی مدح سرائی کر سکتی ہوگی۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ آئی ایس آئی کا طالبان کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور ہر سمت سے تردید ہونے کے باوجود، افغان حکومت کو سپورٹ آئی ایس آئی کی طرف سے ہی ملی تھی۔ میں نے جنرل حمید گل سے ضمانت کر کر دیا کہ میں افغانستان جانا چاہتی ہوں لیکن سفارت خانے کے لوگ مسلسل رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ وہ براہ راست بھی بات کر کے دیکھیں گے کہ میرا سفر کس طرح آسان بن سکتا ہے۔ بہر حال میں جانتی تھی راہ میں آگ ہو یا کوئی طوفان میں سرحد پار کر جاؤں گی۔

جب ہم پشاور پہنچے تو سارے ہوٹل پوری طرح بک ہو چکے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہوٹل اور "ہیڈ آئیڈ" ایک فاسٹ فوڈ کی جگہوں کے کرائے اور قیمتیں بھی چار گنا بڑھ چکی تھیں۔ یہ ایک عجیب تضاد تھا کہ نیویارک جیسا سیاح نواز شہر بھوت بنگلہ بنا ہوا تھا اور پاکستان کی ہوٹل انڈسٹری کا برتن لبالب بھر چکا تھا۔

اتجھے ہوٹلوں میں سے ایک پرل کانٹی نینٹل تھا، میں نے کسی کورٹوت دے کر ایک کمرہ حاصل کر لیا، اس سے متصل ایک آرکیڈ ہے جس میں مجھے ایک دکان نظر آئی۔ میں نے اس کی کھڑکی میں سے بغور دیکھا تو وہاں افغانستان پر ایک دلچسپ اور مخمخیم کتاب دکھائی دی، چنانچہ میں نے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اتنے میں ایک آدمی مجھے ایک طرف دھکیل کر اندر چلا گیا، یہ تقریباً چھ فٹ دو انچ کے قد والا شخص تھا، جو سیدھا اسی کتاب کی طرف بڑھ گیا اور اسے خرید کر واپس چلا گیا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ آخری کتاب تھی جسے وہ لے گیا ہے۔ یہ بی بی سی کے عالمی شہرت یافتہ نمائندے جان سمپسن کے سوا کوئی اور نہ تھا جس کی افغانستان سے متعلقہ رپورٹوں نے لاکھوں افراد کو متاثر کیا تھا۔ یہ کوئی آخری بار نہیں تھی کہ سمپسن دبے پاؤں مجھ سے آگے نکل گیا تھا۔

باوجود اس امر کے کہ میں نے خود کو بڑی مبارکبادیں اور پیٹھ پر تھکیاں دی تھیں کہ میں فوٹو گرافی میں خود کفیل ہو چکی ہوں، ڈپٹی ایڈیٹر شان رسل نے فون پر کہا کہ اسلیم فیکٹریوں کی تصویروں کی کوالٹی بہت گھٹیا ہے اس لئے میں انہیں بہتر بنا کر "Resend" کروں۔ دریں اثناء میری غفار سے اچانک دوبارہ مدد بھیڑ ہو گئی، اس نے مجھ سے بخوشی تصویریں لندن بھجوانے کے لئے لے لیں۔

اس رات میں پرل کانٹی نینٹل کی پانچویں منزل میں واقع بار میں چلی گئی جہاں میرا پرانا دوست اور "میل آن سنڈے" کا فوٹو گرافر "ایان گالاگر" (Ian Gallagher) اس حال میں سامنے کھڑا تھا کہ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بے ڈھنگے لباس میں تھا۔ میں ایان کے ساتھ پر جوش طریقے سے بغل گیر ہو گئی اور اسے بتایا کہ میں اس وقت بے حد جذباتی ہو رہی ہوں کیونکہ ہفتہ بھر میں، پہلے برطانوی سے گفتگو کر رہی ہوں۔ کچھ فاصلے پر کھڑے دوسرے لوگوں نے شور مچایا کہ..... یہ تو چیک ٹیلی ویژن کا "duo" ہے جس سے میں لاہور ایئر پورٹ پر ملی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے افغانستان میں داخل ہونے کا بندوبست کر لیا ہے، ان میں سے ایک نے بیزارگی سے ہاتھ ہلا کر اور اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھما کر، کہا، ابھی تک منصوبے ہی بنا رہے ہیں۔ میں مسکراتی ہوئی دوبارہ "ایان" کی طرف گئی اور اس کا حال احوال پوچھا اور اس نے مجھے ایک "ڈرنک" خرید کر دینے کی پیشکش کی۔

یہ اس حد تک ایک ٹرائی ہی با رہی کہ آپ کو ڈراسی "سپرٹ" کی ضرورت ہو تو آپ کو "پوری ہوٹل خریدنا پڑتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہی تصور "گیری" میں بھی چلنا ہے لیکن میں بیڑی سے چمٹی رہی۔

ریورٹر بمقابلہ فوٹو گرافر

میں نے کئی دفعہ اچھے اچھے رپورٹروں اور بڑے عمدہ عمدہ فوٹوگرافروں کو سٹوری کی کورٹج کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو الزام دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے 1990ء میں فاک لینڈ جانے کا وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے، اس وقت میں ”ناردرن ایکو“ کے لئے کام کر رہی تھی اور ریڈیڈنٹ انٹرنیٹ کمپنی ”گرین باورڈز“ کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی، میرے ہمراہ ”ٹوٹی بارٹھولمیز“ نامی فوٹوگرافر گیا تھا، میں نے اس کا تعارف ”میرا فوٹوگرافر“ کہہ کر کر لیا تھا۔

ہم غزایا، میں ”کسی کا“ فوٹوگرافر نہیں ہوں، میں نے سوچا کہ یہ بلاوجہ کو خود نمائی سے کام لے رہا ہے۔ لیکن اس کے اندر کا گھٹاؤ گہرا تھا جس کا وہ بدلہ لینا چاہتا تھا، بالآخر اسے اس کا موقع مل گیا۔ چند دن بعد وہاں اس نے چند انٹرویوز سے میرا یوں تعارف کر لیا۔ ”یہ میری تصویروں کی عنوان نویس..... Caption writer ہے۔“ واہ یہ کیسا بے تکا انتقام تھا۔

ایک اور موقع پر جب میں 1991ء میں ”سڈے سن“ کے لئے کام کر رہی تھی اور مجھے Tyneside کے فسادات کی کورٹج کرنا تھی۔ میں مظاہرین پر پولیس کا لائیو چارج دیکھنے کے لئے Scotswood کے قریب پہنچی تو پولیس گلی کے ایک سرے پر کھڑی تھی اور مشتعل ہجوم دوسرے سرے پر انتہائی غیظ غضب کی حالت میں کھڑا تھا۔

میں نے جب اپنی آفس کا سڑک کے عین وسط میں بے دھڑک روک دی تو پولیس اور مظاہرین دونوں سشدرہ رہ گئے۔ میرے ساتھ کار میں جو فوٹوگرافر تھا وہ حال ہی میں ہمارے اخبار سے منسلک ہوا تھا، اس نے فیشن اور وائلڈ لائف کی تصویر کشی میں کافی عرصہ کام کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارا ایڈیٹر کرس رٹن ہر قیمت پر کسی ایسے شخص کا ”کلوز اپ“ بنانا چاہتا ہے جو پٹرول بم پھینک رہا ہو۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے عموماً مل جاتا ہے۔“

اگر ہم اسے مطلوبہ فوٹو نہ دے سکے تو وہ ہنگامہ برپا کر دے گا۔ فوٹوگرافر پریشان ہو گیا کہ ایسا کیسے ہو سکے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم پبلک میں جائیں گے اور ان سے گپ شپ شروع کر دیں گے۔ تمہیں اپنے آپ پر تاپا پانا اور ان سے خوفزدہ ہوئے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہوگی۔ چلتے ہوئے قدم بھی اعتماد سے اٹھانا ہوں گے، اور آخری چیز جو کرنا ہوگی وہ یہ ہے کہ ہمیں چوکنا رہنا ہے۔ ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے کہ جمع مشتعل ہو کر، کوئی احمقانہ اقدام کر دے۔

وہ پھر بھی قائل نہ ہو سکا۔ خیر ہم کار سے اتر آئے۔ میں نے آہستہ آہستہ یہ باتیں پھر دوہرائیں اور اسے کہا کہ دوڑنا ہرگز نہیں، ورنہ ایک متحرک نشانہ بن جاؤ گے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، اور پھر اچانک اینٹوں اور روڑوں کی بارش شروع ہو گئی۔

میں نے اسے ہرگز نہ بھاگنے کی تلقین کی، لیکن جب مڑ کر دیکھا تو وہ جاچکا تھا، لوگوں نے پتھر اڑاتے کرتے اسے کار تک پہنچا دیا۔ بعض لفٹنگوں نے اسے اپنا ہدف بنانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ میں جھوم کی طرف مڑی ایک بار ان کی طرف دیکھا اور ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ جب میں تیزی کے ساتھ کار کی طرف جانے لگی، تو ایک روڑا اس کے بونٹ کے ساتھ ٹکرانے کے بعد میری گال پر آگیا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کار میں ہمارے درمیان کیسی گفتگو ہوئی ہوگی۔

میں جانتی ہوں کہ فوٹوگرافی واقعی ایک سائنس ہے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی تصویر نہیں کر سکتی کہ میں اس آدمی سے بہتر تصاویر بنا سکتی ہوں جو سال ہا سال فوٹوگرافی کی مشق کرتا رہا ہے لیکن جس نوعیت کا کام میں کرتی ہوں، میری اس قسم کی سنسوریز کی وضاحت کے لئے ڈیوڈ ہیلی کی سی مہارت درکار نہیں ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ میں فیشن شوٹ نہیں کر سکتی، دنکا فساد کی تصویر نہیں بنا سکتی۔ سپورٹس اینٹس میں سے قابل استعمال پورٹریٹ پکچر نہیں بنا سکتی، دنکا فساد کی تصویر نہیں بنا سکتی، اور نہ یہ جرات رکھتی ہوں کہ جیل کی گاڑیوں پر سے پھلانگ کر ان کے اندر بیٹھے ہوئے کسی خاص آدمی کی پکچر بنا سکوں۔ تاہم اب جبکہ میں نے دنیا کے ہر فوٹوگرافر کو اپنا مخالف بنا ہی لیا ہے تو میں اپنا کام بہر حال جاری رکھوں گی۔

جم مرے غیر قانونی اسلحہ فیکٹریوں کے بارے میں بھیجی ہوئی سٹوری سے بہت خوش ہوا اور مجھے چند دنوں کے لئے پشاور جانے کو کہا کیونکہ یہ وہ جگہ تھی جہاں زبردست مظاہرے ہو رہے تھے۔ میں نے کراؤن پلازا میں کمرے کا قبضہ اپنے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ اسلام آباد پر میڈیا کی یلغار کی وجہ سے اچھی رہائش گاہیں، مرغیوں کے دانوں کی طرح ناپید ہو چکی تھیں۔

میرا "سن" کے چند لوگوں سے تعارف کرایا گیا اور ہم نے تقریباً قیامی انداز میں دعوتِ مائو نو ش اڑائی۔ اپنے کام اور پاکستان میں اندازِ زیست کے بارے میں گفتگو کی اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ میں صحافت کے شہرے اصولوں پر قائم رہی اور اسلحہ فیکٹری کے ٹرپ کے ذکر سے گریز کیا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

جمعہ 21 ستمبر کو پشاور میں بہت بڑے پیمانے پر ایک مظاہرہ ہوا، میں پاشا سمیت وہاں پہنچی۔ میں پہلے بھی مظاہروں کی کوریج کرتی رہی تھی لیکن یہ مظاہرہ خاص طور پر معاندانہ رنگ لئے ہوئے تھا اور فضا میں شدید تناؤ کا احساس ہو رہا تھا۔ مسلمانوں میں جمعہ کو ویسے بھی ایک متبرک دن سمجھا جاتا ہے اور اس مظاہرے کا اہتمام ایک مذہبی اور سیاسی جماعت نے کیا تھا۔ اسلئے جوش و خروش کچھ زیادہ ہی تھا۔

پاشا اور میں چند پولیس والوں کے پاس کھڑے ہو کر یہاں سے گزرنے والی ٹولیوں کو دیکھ رہے تھے۔ میرا سر ڈھانپا ہوا تھا اور میرے کپڑے بھی ایسے نہیں تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی برہم ہو جائے۔ پھر بھی میں اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ پاشا نے سرکوشی کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ تقریباً ایک ہفتے کی رفاقت کے بحر بے کی وجہ سے میں اس کے فیصلوں اور اندازوں پر اعتماد کرنے لگی تھی۔

میں ہوٹل میں واپس آئی اور نیوز ایڈیٹر جم کوفون پر بتایا کہ میں مزید جلوسوں کی ”کوریج“ نہیں کروں گی، ساتھ ہی میں نے اسے آج کے جلوس کی روداد بتائی۔ میں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ خالصتاً مردانہ معاملہ ہے، وہاں ایک عورت یعنی میری موجودگی کوئی شاخسانہ کھڑا کر سکتی تھی۔ خواہ مخواہ کی پٹائی سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور میرے اندازے کو درست قرار دیا۔

میں اسی لمحے ہوٹل کے روم منیجرز میں سے ایک آدمی کا اور مجھے کمرہ خالی کرنے کو کہا، اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ کمرہ پہلے سے ہیکسی کے نام پر پک ہو چکا ہے۔ اب اسے خالی کئے بغیرہ چارہ نہیں تھا۔ تاہم نکلنے کے باوجود میں ”بزنس سنٹر“ میں موجود رہی اور دن بھر کے واقعات کے بارے میں کاپی فائل کرتی رہی۔ پاشا نے بتایا کہ وہ میرے لئے ”بیڈا اینڈ بریک فاسٹ“ کا انتظام کر دے گا، اور یہ کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ شخص میرے لئے بے حد مفید ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے تمام چھوٹی موٹی ضروریات اپنے ذمہ لے کر مجھے بے فکر کر دیا تھا۔

میں نے بزنس سنٹر میں، امر لینڈ کی ایک بہت اچھی رپورٹر ”مریم ڈونوے“ (Miriam Donhe) سے واقفیت پیدا کر لی، وہ چند دن پہلے درہ خیبر میں آئی تھی وہ آئرش نیشنلسٹ ڈیپارٹمنٹ کی ایشیا کارسپانڈنٹ تھی، اسے اس کے بیجنگ آفس نے پشاور بھیجا تھا تا کہ یہاں متوقع بحران، ہنگاموں یا جنگ کی صورت میں خبریں ارسال کر سکے۔ میں نے اسے اپنی درہ خیبر جانے کی خواہش سے مطلع کیا مگر اس نے بتایا کہ وہاں سارے میڈیا کا داخلہ سختی سے بند کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس کے پاس معلومات کی چند کاپیاں موجود ہیں اگر ان میں سے مجھے کوئی بات کارآمد ملے تو میں اسے اخذ کر سکتی ہوں۔ یہ اس کی بڑی عنایت تھی، میں نے اسے اپنا ”ای میل“ ایڈیس دے دیا۔ بہر حال ہر رپورٹر کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ میں اس جگہ کو خود جا کر دیکھوں۔

اتنے میں بزنس سنٹر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وہ کال لینے لگی۔ وہ ہمہ تن کاپی فائلنگ میں مصروف ہو گئی اور مجھے کہا کہ اگر میں بوکونا (کولمبیا) کے ایک ریڈیو سٹیشن سے بات کرنا چاہوں تو کر سکتی ہوں۔ میں نے وہاں کے ایک رپورٹر سے گفتگو شروع کر دی، اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں، یہاں کیا کر رہی ہوں اور 11 ستمبر کے بعد کے حالات کے بارے میں میری کیا رائے ہے؟

میں اگرچہ اپنی ”خاص خبروں“ (exclusives) کی حفاظت کی خاطر اپنی جان تک دے دینے کی قائل ہوں لیکن اپنے ہم پیش ساتھیوں کی مدد کرنے کا معاملہ ہو تو جتنا ممکن ہو میں ضرور تعاون کرتی ہوں۔ چنانچہ میں نے پادریانہ انداز میں صدر بش کے انداز میں کہنا شروع کر دیا کہ وہ ایک لوکل ٹاؤن کے شریف کی سطح کی باتیں کر رہا تھا کہ ”مجھے اسامہ بن لادن مطلوب ہے، زندہ یا مردہ، یہ ایک سپر پاور کا سا انداز خطاب نہیں تھا اور نہ ہی ایسا ہونا چاہئے تھا۔“

”میں نے کہا کہ ”اگر امریکا نے راتوں رات اپنا دستور تبدیل نہیں کر لیا، تو ہر شخص اس وقت تک بے گناہ ہوتا ہے جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو چکا ہو۔ کیا بش نے اسامہ بن لادن کی غیر حاضری میں مقدمہ چلا دیا تھا؟ بنیادی طور پر میں نے امریکا کی سخت سرزنش کی اور صدر پرویز مشرف سے اظہار ہمدردی کیا جسے ایک مشکل صورت حال میں پھنسا دیا گیا تھا، میں نے کہا کہ پاکستان کے آٹھ کروڑ اعتدال پسند مسلمانوں کی بھاری اکثریت افغانستان میں کسی قسم کی بھی فوجی ایکشن پسند نہیں کرتی۔ اس موقف پر مزید زور دیتے ہوئے میں کہتی چلی گئی کہ امریکا اور برطانیہ نے پرویز مشرف کو ڈرا دھمکا کر اپنے اتحاد میں شامل کیا ہے اور وہ سیاست کے تنے ہوئے رے سے پر چل رہے ہیں جس کا نتیجہ ان کے کیریئر کے خاتمے کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔“

سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ ”11 ستمبر کے واقعہ کی تو ہر کوئی مذمت کرتا ہے، ہمیں ایک قدم پیچھے ہٹ کر سوچنا چاہیے کہ لوگ اب تک صدمے کی حالت میں ہیں، بہت سے لوگوں کو اظہارِ صدمہ کے لئے

مناسب وقت ہی نہیں ملا اور بہت سوں کا ایسا کوئی بھی نہیں بچے گا جو ان کے لئے رو سکے۔ جنگ کی باتیں کرنا اور صلیبی جنگ وغیرہ کی دھمکیاں دینا بالکل ناجائز ہیں۔ مجھے پس منظر میں پہنی زبان میں تقریر سنائی دے رہی تھی لیکن میں نے یہ سمجھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی کہ میں ایک مصروف نیوز روم میں اس سے مصروف گفتگو ہوں۔ رپورٹر نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے تھوڑی دیر ہولڈ کرنے کے لئے کہا، اور چند منٹ بعد واپس آ کر کہا کہ براڈ کاسٹ بالکل صحیح رہی ہے۔ اوہ میرے خدا! میں سمجھی کہ میں ایک ساتھی جرنلسٹ کو ”آف دی ریکارڈ“ بریفنگ دے رہی ہوں اور وہاں جنوبی امریکہ میں لاکھوں افراد ایک دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔

میں نے مریم کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسی۔ میں وہاں سے شہلی لاؤنچ میں پہنچ گئی جہاں آبزور کا چیف رپورٹر جیسن برک (Jason Burke) بیٹھا تھا۔ پُر جوش بغل گیری اور بوسہ بازی ہوئی کیونکہ ہم بڑے عرصے کے بعد ملے تھے۔ وہ اگرچہ لندن میں ”آبزور“ کے دفاتر میں بیٹھتا ہے، یہ دراصل اس کا عقبی صحن ہے۔ وہ اس علاقے میں دو سال سے فری لانسنگ کر رہا تھا۔ اس دوران ”آبزور“ نے اسے اچک لیا کہ وہ ایشیائی امور کی خبریں فراہم کرے۔ جیسن سے میری ملاقات سنڈے ٹائمز کے ”انسائیٹ“ آفس میں ہوئی تھی، اور جب وہ یہاں سے باہر چلا گیا تو ہم کبھی کبھار بذریعہ ای میل آپس میں ملتے تھے۔ اس سے اس وقت کی ملاقات بہت اچھی ثابت ہوئی۔

کرئینا لیمب سے بحالہ تعارف

جیسن برک نے مجھے ”سنڈے نیلی گراف“ کی کرئینا لیمب سے متعارف کرایا (نوٹ، کرئینا لیمب بھی افغانستان پر ایک کتاب لکھ چکی ہے جو ”The Sewing circles of Herat“ کے نام سے چھپی ہے، اردو میں اس کا ترجمہ ”طالبان کا افغانستان“ کے عنوان سے کیا گیا ہے اور یہ ”نگارشات“ 24 مزنگ روڈ لاہور نے چھاپا ہے۔۔۔۔۔ مترجم) جیسن چلا گیا اور کرئینا اور میں کافی دیر تک محو گفتگو رہیں اور رات کو اکٹھے ڈنر کیا۔ اس کا بل اسی نے ادا کرنے کی پیشکش کی کیونکہ میرے پاس پاکستانی روپے ختم ہو گئے تھے اگرچہ میرے پاس اپنا کریڈٹ کارڈ تھا چنانچہ میں رضامند ہو گئی اور اگلا ڈنر اپنے ذمے لے لیا۔ (بہر حال تادم تحریر میں اس کا احسان نہیں اتار سکی کیونکہ اب تک ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی)۔ کرئینا لیمب کی وجہ سے چند غفتوں کے بعد تھلکہ خیز ہیڈ لائنز والی خبروں کے باعث دھوم مچنے والی تھی، یہ خبریں اس وقت بنیں جب اسے اس کے فوٹو گرافر جسٹن سڈکلف سمیت کوئٹہ پولیس سرینا ہوٹل کے کمروں سے پکڑ کر لے گئی تھی۔ اسے نومبر 2001ء میں پاکستان سے نکال دیا گیا۔ اس پر بظاہر یہ الزام تھا کہ اس نے اسامہ بن لادن کا نام استعمال کر کے ایک اندرون ملک پرواز کے لئے ٹکٹ خریدنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک مقامی اخبار کو دیئے گئے انٹرویو میں کہا تھا کہ اس نے کوئٹہ سے اسلام آباد کے لئے پی آئی اے کے آفس سے فلائٹ کا ٹکٹ خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

کرئینا سے میری خوب گپ شپ رہی۔ جس میں ہم نے دو صحافیوں کے درمیان معاشرے اور ان کے نتائج پر بھی کھل کر تبادلہ خیال کیا۔ اخبارات کے نیوز روم ایسی گرم خیریں پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنے مشاہدے کے باعث کہ ایک صحافی کیلئے کسی ایسے شخص سے راہ و رسم بڑھانا تقریباً ممکن ہوتا ہے جو صحیح معنوں میں صحافی نہ ہو۔ میں ذاتی طور پر ان کلباڑا قسم کے لوگوں سے میل جول بڑھانے سے گریز کرتی ہوں، کیونکہ میں نے اپنے کیریئر کے آغاز میں سیکھ لیا تھا کہ بعض صحافی پیٹ کے بہت ہلکے ہوتے ہیں، ان کی یہ کمزوری اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنی خبر کے جلد از جلد افشا کرنے کی خواہش کو تابو میں نہیں رکھ سکتے۔

میں اسی وقت ہماری توجہ جان سمپسن کی ایک براڈ کاسٹ کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس قوی الجشہ شخص نے ایک خفیہ مشن کے لئے برقع پر پوش عورت بن کر افغانستان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اسے ایک کھلی وکیں کے پچھلے حصے میں نیچے کر کے بٹھایا گیا تھا تا کہ اس پر عورت ہونے کا ہی گمان ہو۔

یہ بڑی مضحکہ خیز براڈ کاسٹ تھی۔ وہ اپنے کام اور مشن کے بارے میں بے پناہ جوش و جذبہ رکھتا ہے، یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن مجھے اس کی سنوری کے اندر کوئی نقطہ دکھائی نہ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ تک کوئی اہم پیغام پہنچنے سے رہ گیا ہو لیکن مجھے یہ بات سمجھ آ گئی کہ جان سمپسن نے برقع پہن کر اور افغانستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہو کر براڈ کاسٹ کی ہے۔

کرئینا اور میں دونوں اس بات پر بہت ہنسیں اور حیران ہوئیں۔ ہم اس کی جرات پر اس کی تعریف بھی کر رہی تھیں اور اسے مضحکہ خیز بھی سمجھتی تھیں۔

اس سے میرے ذہن میں ایک خیال کا پودا اُگ گیا۔ ”برقع پوشی“ اور ”دکھائی دیئے بغیر کام کر گزرنے“ کے تصورات میرے ذہن میں گھوم رہے تھے اور پودا تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔

درندہ خیبر سے آگے

اس رات میں ہوٹل کی پانچویں منزل پر بار میں گئی جہاں الکل صرف غیر ملکی مہمانوں کو پیش کی جاتی ہے، تمام شناسا چہروں پر نظر پڑی۔ ”یان گلاگر“ وہاں تھا مگر وہ تھوڑی دیر بعد آگے بچا کر نکل گیا۔ اس سے میں کچھ پریشان ہوئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس کے پاس لازماً کوئی ”exclusive“ خبر ہوگی، ورنہ وہ مجھ سے یوں کئی کتر کر نہ نکلتا، یہ صحافیوں کی ایک اور خصلت ہے جس کا مظاہرہ نہ کرنا، ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

تاہم میں نے اپنے آپ پر تابو رکھا اور نیویارک سے آئے ہوئے ایک چینی ٹرانزافوٹو گرافر سے بات چیت شروع کر دی، وہ ابھی اسرائیل میں اپنے رشتہ داروں سے مل کر آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے اب بھی گھر جانا ہے مگر ”Twin Towers“ کے بغیر نیویارک کو دیکھنا عجیب سا لگے گا۔

وہ نیویارک کے اخبار ”نیوز ڈے“ کے لئے کام کر رہا تھا اور خاص خوش طبع آدمی تھا لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کوئی دکھ چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی گرل فرینڈ بھی کچھ ناراض تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ دونوں اکٹھے سیرو تفریح کو جائیں اور ایک پورا دن ساتھ گزاریں، ادھر سے اسے پشاور کا رخ کرنے کا حکم مل گیا۔ میں نے اس کا دکھ بانٹتے ہوئے کہا کہ ہم نے ایک مشکل پیشہ اپنایا ہوا ہے، اس سے باہر کے لوگ ہماری مصروفیات کو نہیں سمجھ سکتے۔ غیر صحافیوں کیلئے صحافیوں کے حالات سمجھنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا لیکن وہ اسی پیشے میں کام کر رہی ہے، وہ ایک فوٹو گرافر ہے۔ اسی لمحے ایک لبنانی ٹیلی ویژن رپورٹر اندر آ گئی، خیر مقدمی الفاظ کے تبادلے اور ایک دوسرے کے نام اور عہدے پوچھنے کے بعد دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ یہ تانیہ مہنا لبانی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن میں تھی، دیکھنے میں حیرت انگیز لگتی تھی مگر بے حد خاموش طبع تھی تاہم وہ زبردست حس مزاح کی مالک تھی۔ مجھے اس سے فوراً محبت ہو گئی، اس نے صبح کو وہی ہنگامے اور جلوس ”سکور“ کئے تھے جو میں نے کئے تھے۔

اس نے انکشاف کیا کہ اس پر لائچیوں سے حملہ کیا گیا تھا اور ایک فرانسیسی خاتون صحافی پر پتھراؤ کیا گیا تھا، پاشا کا وجدان حسب معمول بالکل ٹھیک نکلا۔ اس پر ہم تینوں نے فیصلہ کیا، کہ یہ باتیں بیڑ سے قدرے زیادہ زوردار مشروب کا تقاضا کرتی ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک بوتل خرید لی جو بظاہر ہسکی کی بوتل لگتی تھی اور ہم نے اس کے نفرت انگیز ذائقے والی چیز کو بہت سے کوک کے ساتھ غناغٹ حلق سے اتار لیا۔

مجھے کسی کا یہ بتانا یاد ہے کہ وہ ہسکی سے زیادہ بری کوئی بھی چیز نہیں ہے لیکن یقین کیجئے کہ یہ تو بہت ہی نامصنوعی مشروب تھا، اسے پی کر مجھے گھر میں بنی ہوئی آرش پوئین یاد آئی جو میں نے ”نیو کیسل جرنل“ میں ملازمت کے دنوں ایک بار نامٹ شفٹ میں کام کرتے ہوئے پی تھی۔ اسے ہم بلاوجہ قبرستانی شفٹ نہیں کہتے تھے، میں اور دوسروں نے اس مہلک بناوٹی مشروب سے اپنا غم غلط کیا اور ساتھ ساتھ ”نامنر“ کے معے بھی حل کر رہے تھے۔

ہم وقت تو بالکل ہی بھول گئے فٹے میں اتنے دھت اور معے میں اتنے منہمک ہو گئے کہ ہم نے آخر میں صحیح جواب کے لئے ”نامنر“ کے سوچ بورڈ کو فون کر دیا لیکن آپریٹر نے ہماری بے چینی کو دور کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں بھی دوسرے لوگوں کی طرح صبح کو اخبار خریدنا ہوگا۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی تو صبح کے پانچ بجے تھے۔ چنانچہ میں ٹیکسی لے کر گھر پہنچ گئی جہاں میرا شوہر نمبر 2، پولیس مین میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ میں معاشرے لڑائی پھرتی ہوں۔ اس کی یہ جرات! یہ الفاظ ایسے مرد کی زبان سے نکلے جو ایک دوسری عورت کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا تھا اور اس نے بالآخر مجھے چھوڑ کر اسی سے شادی رچالی۔

ناہم میں یہ نہیں کہتی کہ شراب کے بھبھوکے اڑاتے ہوئے گھر واپس آنا اور یہ اصرار کرنا کہ میں ڈیوٹی پر تھی، کوئی اچھی بات تھی لیکن میں نے لڑکھڑائی زبان سے اسے اس الزام کا یہ جواب دیا کہ وہ اپنے رویے پر مجھے قیاس نہ کرے۔ اگلی صبح میں بیدار ہوئی تو خود کو پسینہ روم میں پایا اور نشہ اتر جانے کی وجہ سے سارا بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

اسلام آباد میں اس وقت تقریباً نصف شب کا عالم تھا اور ہم تینوں ولسکی اور کوک کے آخری قطرے پی رہے تھے، ہم ایک دوسرے کے بہت گھرے اور غمگسار دوست تھے۔ سب نے آپس میں رابطے رکھنے کے وعدے کئے۔ ہم ایک دوسرے کے برے وقتوں کے کامریڈ تھے۔ سب ایک کے لئے اور ایک سب کے لئے جان چھڑکنے کو تیار تھا۔ میں ڈولتی ہوئی ایلوینر کی طرف گئی اور نیچے گر اوینڈ فلور پر پہنچی جہاں میں نے ملاقات کیلئے پاشا کو بلا رکھا تھا۔ میں نے سچ مچ سیدھی لائن میں چلنے پر توجہ دی تھی کیونکہ میں اب بھی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھی کہ بہت سے مسلمان الکحل سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جنگ شروع ہو جانے کا خوف

میں پاشا کی کھٹارہ پیلی ٹیکسی میں بیٹھی اور ہم ”بیڈ اینڈ بریک فاسٹ“ (ریستوران) میں گئے جس کا انتظام اسی نے کیا ہوا تھا۔ مجھے اب بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا یاد ہے جہاں مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچایا گیا، جس میں ٹی وی، بیڈ اور ایڈجسٹڈ ہاتھ روم تھا۔ میں جلدی ہی ڈھیر ہو گئی اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا تا وقتیکہ صبح کے چھ بج گئے۔ جب آنکھ کھلی تو ایک نیچی پرواز کرنے والے جیٹ طیارے کا گرچدار شور سنائی دیا، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا جیٹ گزرا۔ ”اوہ یہ تو شروع ہو گئی“ اچانک میرے منہ سے نکلا ”خون ریز جنگ شروع ہو چکی ہے اور مجھے پتہ تک نہیں چلا“۔

میں کھسکتی ہوئی بستر پر سے اٹھی، گزشتہ رات والے کپڑے جلدی جلدی پہنے اور ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی تازہ ہوا میں پہنچی، ایک شعلہ نکلتا ہوا پایا اور بجلت خود کو کھینچتی ہوئی چھت کے اوپر چڑھ گئی، وہاں سے سامنے ایئر پورٹ کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ ”تو کیا پشانے اس“ اس بیڈ اینڈ بریک فاسٹ“ میں میری بکنگ کرادی تھی جو اس کم بخت ایئر پورٹ کے اتنے قریب ہے۔“ لیکن میں نے جو کچھ سنا تھا وہ علی الصبح کی پروازوں کی آوازیں تھیں جو ان کے عمود بلند ہوتے وقت پیدا ہوتی ہیں۔ ”اوہ میں کتنی احمق ہوں، کیا احمق ہوں، کیا سمجھ بیٹھی تھی! شکر ہے کہ قریب کوئی بھی نہیں جو یو آنے رڈ لے کو اس حال میں دیکھتا کہ وہ کل رات والے میک اپ میں ہے، ننگے پاؤں چھت پر کھڑی ہے اور اکثریت شراب نوشی کے سارے آثار دکھائی دے رہے ہیں“ میں نے اترتے ہوئے کافی احتیاط سے کام لیا اور خیر سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

ناشتے کے بعد میں نے پاشا سے درہ خیبر چلنے کو کہا اس نے بتایا کہ یہ بالکل ناممکن ہے، وہاں غیر ملکی صحافیوں کو جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔

میں نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں ”نہ“ نہیں سننا چاہتی۔ میرا حکمانہ لہجہ دیکھ کر وہ ہنسا اور کہا ”اوکے، میڈم، ہم چلتے ہیں، اگر کوئی ایک فرد بھی وہاں جا سکتا تو وہ آپ ہوں گی۔“

میرے کیمرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔“

ہم سازشیوں کے سے انداز میں ہنسے اور کاغذاتی کارروائیوں کے مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا، اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر دستاویز کی تین تین کاپیاں بنتی ہیں، اور شہر کے پار ایک اور دفتر میں بھی جانا ہے۔ سب کچھ کرنے کے بعد ہمارا رنگ تانلہ اکٹھا ہو گیا اور آگے چلنے کے لئے تیار ہوئے تو ایک عجیب بات ہو گئی۔ پولینڈ کا ایک آدمی اچانک بھاری جاپانی سیاحتی موٹر سائیکل لئے ہوئے آدھمکا۔ وہ اس مشین کو ایک ٹریلر کے ساتھ جوڑنا چاہتا تھا جو ہمارے کانوائے میں شامل ہو رہا تھا۔

میں نے افغان فوٹو گرافر غفار سے، جس کی عادت تھی کہ وہ بوتل کے جن کی طرح اچانک نمودار اور اچانک غائب ہو جایا کرتا تھا، پوچھا کہ ”یہ شخص کس کے لئے کام کرتا ہے۔“ اس پر اس نے پاشا کو بتایا کہ یہ ایک سیاح ہے۔ اس کے پاس براستہ درہ خیبر افغانستان جانے کے لئے ٹورسٹ ویزا ہے۔ اس سے مجھے یہ نقطہ سوجھا کہ میں افغان سفارت خانے سے کہوں کہ مجھے بطور سیاح کابل میں ایک ”ویک اینڈ“ گزارنے کی اجازت دے دی جائے۔

ہم روانہ ہونے ہی والے تھے کہ ہمارے ساتھ مشہور زمانہ خیبر رافٹلو رجمنٹ کا ایک جاذب نظر نوجوان آ شامل ہوا۔ پاشا نے مجھے اپنی نیکی کی فرٹ سیٹ پر بیٹھنے کو کہا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اور کہا ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ گن بردار شخص میرے پیچھے بیٹھا ہو، وہ آگے بھی بیٹھ سکتا ہے۔“

صاف ظاہر تھا کہ اسے میری نگرانی کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ وہ بھی آگے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہم دونوں پچھلی سیٹ بیٹھیں۔ چنانچہ ہمارا کانوائے چل پڑا۔ جب دڑے سے پہلے کی چیک پوسٹ پر پہنچے۔ سرکاری دستاویزات کے بندلوں کی چھان بین شروع ہو گئی۔ چنانچہ میں ٹہلنے کے لئے نیکی سے باہر نکل گئی۔

مجھے سامنے ایک بڑا ”نشان“ دکھائی دیا جس پر لکھا تھا۔ ”کوئی غیر ملکی اس پوائنٹ سے آگے نہیں جاسکتا۔“ غفار نے مجھے آواز دی کہ وہ ایک فوٹو لینا چاہتا ہے اور میں اس ”نشان“ کی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ ہمارا ہمراہی فوجی پریشان دکھائی دینے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ فوٹو فیملی البم کے لئے ہوگا۔ مجھے اس وقت گمان تک نہیں تھا کہ یہ فوٹو سات دن کے بعد اڑتا ہوا دنیا بھر کے میڈیا کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔

ہم دوبارہ درہ خیبر کی طرف چل پڑے۔ میں بے پناہ جوش میں تھی اور ایک ساتھی سے میرا مسلسل رابطہ تھا جو اہمیت ہال (حکومت برطانیہ کے دفاتر) کے ارد گرد ہمیشہ مگر گشت کرتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں مختلف رجمنٹوں کے مخصوص نشانات (crests) نوٹ کرتی رہوں، اس نے یہ بھی کہا کہ میں ایک بہت بڑے تجربے میں سے گزر رہی ہوں۔

درہ خیبر جو صدیوں سے تاریخ سازی کرتا رہا ہے۔ آج خطے میں پھیلی ہوئی کشیدگی کی وجہ سے ایک بار پھر دنیا کی توجہ کا مرکز بننے والا تھا۔ فوجی ماہرین اس کی اہمیت کو پھر اُجاگر کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی طاقتور فوجیں اور سفاک لٹیرے اس کی گھاٹیوں اور سنگ خارا کی چٹانوں کے درمیان بنے ہوئے راستوں میں سے گزرتے رہے ہیں، منشیات اور دیگر قیمتی اشیاء کی سگنگ بھی انہی راہوں میں سے ہوتی رہتی ہے۔ اب بھی اس امر کا قوی امکان ہے کہ برطانوی سپاہی ایک بار پھر اسی دڑے کے 53 کلومیٹر (33 میل) طویل راستے سے گزریں جو ہندو کش کے نامہربان سلسلہ کوہ کے گرد گرد چکر کھاتا ہوا، اور شمال مغرب میں کوہ سفید کی حدود میں سے گزرتا ہوا پشاور اور کابل کو آپس میں ملاتا ہے۔ اس کی چوڑائی 3 میٹر سے لے کر 137 میٹر (10-450) تک ہے۔

فوجی نقطہ نظر سے یہ اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی جبرائیل اور نہر سوز کی تزویری (strategic) اہمیت ہے کیونکہ یہ پاکستان کی شمالی سرحد کو افغانستان سے ملاتا ہے۔ طالبان کے خوفناک ٹائیٹل اور اسامہ بن لادن، اس کے ہر موڑ، ہر گوشے، ہر درز اور ہر سوراخ سے واقف ہیں، لیکن اجنبیوں کے لئے اس کے بل کھاتے ہوئے راستوں میں قدم قدم پر خطرات پوشیدہ ہیں۔ ان راہوں سے ناواقفیت موت کا پھندہ بن سکتی ہے۔ یہ درہ برصغیر ہند پر شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کا گیٹ وے رہا ہے اور اس کی طویل تاریخ خون ریز داستانوں اور چیرہ دستیوں سے عبارت رہی ہے۔

درہ خیبر کا کنٹرول پاکستان کے پاس ہے، لیکن جب امریکا کی طرف سے اس کے ہمسایہ ملک افغانستان پر متوقع حملے کا منصوبہ بنا اور قبائلی خطے میں کشیدگی بڑھی تو یہ سیاحوں اور میڈیا کے لئے ایک ممنوعہ علاقہ (No-go area) بن گیا۔

جب ہم چند میٹر مزید آگے بڑھے تو مجھے جرمن کیمرہ مین کا بازو اس کی لینڈ کروزر سے باہر لٹکا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی کلائی سے سٹریپ کی مدد سے بندھا ہوا بھاری ٹی وی کیمرہ ہمارے سفر کے ایک انچ کی تصویر کشی کر رہا تھا۔ راستے کی دونوں جانب کے پہاڑنا قابل تسخیر دکھائی دے رہے تھے اگرچہ ڈھلوان چٹانوں پر صدیوں سے بنے ہوئے چند دھندلے سے فٹ پاتھ بھی نظر آرہے تھے۔

سرکاری افسروں کی دعوت

ہم نے غفار کو ساتھ لیا اور صوبہ سرحد کے پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں جا پہنچے۔ وہاں ایک بڑا ہی فوجدار قسم کا سرکاری ملازم بیٹھا تھا جو ہر صحافی کی درخواست مسترد کئے جا رہا تھا۔ یہاں جمع صحافیوں کو دیکھ کر اقوام متحدہ کا گمان ہوتا تھا، جرمن، فرانسیسی، جاپانی چیک، سپینش، دو امریکی اور میں اس سے استدعا نہیں کر رہے تھے۔

میں نے بے حد منکسرانہ انداز میں اس سے پوچھا کہ کیا مجھے درہ خیبر میں سے گزرنے کے لئے سفری دستاویزات مل سکتی ہیں۔ مجھے جو جواب ملا، وہ یہ تھا:-

”کسی صحافی کو اگلے نوٹس تک، وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

جن صحافیوں کو یہ کھرا جواب پہلے مل چکا تھا، وہ واپس جا چکے تھے اور باقی ماندہ اپنے کانوں پر یہ سننے کے منتظر تھے۔ میں نے باواز بلند پوچھا..... ”کیوں؟“

وہ اس وقت تک میری طرف پیٹھ موڑ چکا تھا، (گھومنے والی کرسی کا یہی فائدہ ہوتا ہے: مترجم) میرا استفسار سن کر پھر مڑا اور وہی جملہ دوہراتے ہوئے بولا کہ میں نہیں جاسکتی اور مجھے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

اب میں بھی غصے میں آ گئی..... ”ایسا تو نہیں لگتا کہ یہاں سب فیملے آپ ہی کے ہاتھ میں ہوں، میں آپ کے پاس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اور یہ جملہ کسی معتبر آدمی کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔“

اس نے مجھے بڑی خشکیوں نظروں سے دیکھا، اور پاشا سے کچھ کہا۔ پاشا نے بھی کوئی جواب دیا۔ انسر نے پھر کچھ کہا جو ظاہر ہے کہ کوئی ناگفتنی ہی ہوگی، کیونکہ میں نے پاشا کبھی اتنا برا نہیں پایا۔

”میڈم اس نے مجھ سے ایسے بات کی ہے، جیسے میں کوئی ان پڑھ ہوں اور اس خطے کا رہنے والا نہیں ہوں۔ تاہم آپ نے اسے اتنا پریشان کیا ہے کہ وہ اب اپنے کسی اعلیٰ انسر سے بات کرنے والا ہے، اور بے حد ناراض ہے۔“ میں نے اسے بتایا کہ ”میں نیوکیسل سے آئی ہوں، اور اس لہجے میں بات کی جائے تو مغرور طبقے کو وہ بہت بری لگتی ہے۔“ مجھے یقین تو نہیں کہ وہ میری بات سمجھ سکا ہوگا، لیکن وہ زیر لب مسکرا دیا۔

پرچیاں لے جانے والا، اندر چلا گیا، اور تھوڑی دیر بعد باہر آ کر اس نے میری طرف اس طرح دیکھا، جیسے اس کے پاؤں پر کوئی گندگی لگ گئی ہو اور اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پاشا اور میں اندر گئے تو وہاں ایک وسیع ڈیسک کے پیچھے ڈپٹی چیف آف پروٹوکول شہزاد ضیاء الدین علی بیٹھا تھا، اس کے دونوں اطراف میں چمچے قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں درہ خیبر میں سے کیوں گزرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا..... ”سر، میں ایک صحافی ہوں، میری باس نے مجھے اس تاریخی دڑے پر ایک فچر لکھنے کو کہا ہے۔ میں آپ کی مشکلات سے آگاہ ہوں، مگر میرا باس آگاہ نہیں ہے۔ وہ میرے اس عذر کو نہیں مانے گا کہ مجھے وہاں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے اور وہ مجھ پر سستی اور سہل پسندی کا الزام ناند کرے گا۔“

”میں درہ خیبر پر دو کتابیں بھی خرید چکی ہوں، لیکن میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ آپ مجھے وہاں جانے دیں تاکہ میں آپ کے خوبصورت ملک کے ساتھ انصاف کر سکوں اور لفظوں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔“

اس نے اپنے ڈیسک پار سے مجھے نہایت درشتی کے ساتھ دیکھا اور پھر ذرا سی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا:- ”اچھا آپ وہاں چلی جائیں، لیکن میں آپ کو انتباہ کرتا ہوں کہ آپ دڑے کی تصویریں نہیں بنا سکتیں، ہم آپ کو ایک مسلح محافظ دیں گے، لیکن اس سفر کے دوران آپ اپنی کار میں سے باہر ایک قدم بھی نہیں نکال سکتیں۔“

میں نے اس کا پُر جوش طریقے سے شکریہ ادا کیا اور پھر باہر نکل گئی جہاں تمام دوسرے غیر ملکی صحافی دم سادھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے چہکتے ہوئے کہا ”اس آدمی نے ہاں کر دی ہے۔“ متعدد صحافیوں نے خوشی سے فضا میں گھونسنے مارے، اور لمحوں میں پرچیاں لے جانے والے پر ہر قومیت کے پاسپورٹوں کی بارش ہونے لگی۔ اگر لوگوں کی تیز نظروں (نظر بد) سے کوئی مر سکتا تو آج میں یہ کتاب نہ لکھ رہی ہوتی۔

پاشا نے مجھے تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا..... ”میڈم، پتہ نہیں آپ ایسے کام کیسے کر لیتی ہیں، بعض اوقات آپ بڑی سخت عورت دکھائی دیتی ہیں لیکن جب مہربان ہونے پر آتی ہیں تو بندے پر جادو کر کے رکھ دیتی ہیں۔“ غقرہ مکمل کر کے وہ بڑی سرور آ گئیں ہنسی ہنسا، جیسا کہ وہ کبھی کبھار بہت ہی خوشگوار موڈ میں ہو تو مظاہرہ کرتا ہے۔

وہاں جرمن ٹی وی کے عملہ کے لوگ بھی کھڑے تھے، میں نے ان کے کیمرہ مین کو سرکوشی کے انداز میں بتایا کہ ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ کا اصرار ہے کہ کیمرہ وہاں نہیں لے جایا جاسکتا۔ وہ مسکرایا اور بولا ”وہ تو میں سمجھتا ہوں، مگر مجھے

دوڑے کا بلند ترین مقام پاکستان اور افغانستان کے بارڈر سے تین کلومیٹر سے کچھ ہی کم اونچا ہوگا اور ہمارا کانوائے وہیں پہنچ کر ٹھہرا اور ہم نے وہیں پارکنگ کی۔ وہاں سے نیچے طورخم پر نظر ڈالی تو ایسا خوبصورت منظر دکھائی دیا کہ اس کی تصویر نہ اتاری جاتی تو یہ ایک سنگین جرم ہوتا۔

کیمرے اور ویڈیو لڑھکتے ہوئے باہر آئے اور اس عظیم الشان منظر کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا گیا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر غفار کو تلاش کیا وہ ایک بار پھر ”بغیر درخواست چھٹی“ پر جا چکا تھا۔ میں نے پاشا سے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ اسے تلاش کرنے چلا گیا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

خیبر اٹفلو کے ایک سپاہی نے بتایا کہ ہم جنگی نقطہ نظر سے نہایت اہم راستے کو دیکھ رہے ہیں جس کی تاریخ 326 قبل مسیح تک جاتی ہے جب سکندر اعظم اپنا لشکر لئے ہوئے آیا اور درہ خیبر کے راستے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہوا تھا۔

بعد ازاں میں نے مریم کی ”کاپی“ میں سے پڑھا کہ اہل فارس، منگول اور تاتار لشکر بھی خیبر میں سے گزرے اور وہ اپنے ساتھ اسلام لائے۔ صدیوں بعد جب ہندوستان سلطنت برطانیہ کا حصہ بنا تو برٹش انڈیا سائیڈ سے درہ خیبر کا دفاع برطانوی فوجیں کرتی رہیں۔

افغان جنگوں کے دوران یہ درہ اینگلو انڈین سپاہیوں اور مقامی افغانوں کے مابین پیشمار جھڑپوں کی آماجگاہ بن گیا، جن میں جنوری 1842ء کی وہ لڑائی خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں 16 ہزار انگریز اور ہندوستانی سپاہی ہلاک ہو گئے۔ (یہ پہلی تین جنگوں میں سے پہلی جنگ کا آخری سال تھا)

انگریزوں نے 1879ء میں اس درہ میں سے سڑک نکالی جسے 1920ء کے عشرے میں شاہرہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی دورانیے میں ریلوے لائن بھی بچھا دی گئی لیکن اس کی افغان سائیڈ اب ناقابل مرمت حالت میں پڑی ہے۔ یہ بے حد افسوسناک اور شرمناک بات ہے، میں شرط لگاتی ہوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں ریلوے کا سفر کرہ زمین کے سب سے بڑے ٹرین کے سفروں میں شمار ہوتا۔

جنگوں اور جھڑپوں کی لعنتوں نے غربت کی لعنت کو جنم دیا۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ بھاری سرمایہ بھوں اور توپوں کے کولوں پر صرف کرنے کی بجائے انسانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر دیا جاتا تھا اور ان شاندار راستوں اور پٹریوں کی حفاظت کی جاتی؟

پھر میں بہت سی رجمنٹوں کے امتیازی نشانات دیکھے جو برطانوی فوجیوں نے چٹانوں پر اپنے ہاتھوں سے کندہ کئے تھے۔ یہ بے حد پُراثر کندہ کاری ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ میری نظر غفار پر پڑی، میں اس کے ساتھ رڈ وقیح کرنے کے لئے گئی۔ پاشا نے میرا منہ بند رکھوانے کے لئے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور بولا کہ ”غفار اپنے خیبر اٹفلو کے ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا اور میرا خیال ہے کہ جب کانوائے آگے چلتے ہوئے دائیں طرف مڑے تو ہم بائیں طرف مڑ کر طورخم اور بارڈر کی طرف ہو جائیں گے۔“

جنگی بات یہ ہے کہ غفار بڑی ہی حوصلہ شکن شخصیت ہے، اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو میں اسے اسی وقت اور فوراً ایک زوردار بوسہ دیدیتی۔ پھر اس نے میری کئی تصویریں بنائیں جن میں، میں ہاتھ میں نیم خودکار رائفل اٹھائے ایک سپاہی کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اسے اپنا چھوٹا ”نکن“ کیمرہ دیا تھا اس نے میری ایک ایسی تصویر بھی بنائی جس میں مجھے قدیم دور کی ملکہ برطانیہ بوڈیشیا کی مانند دکھایا گیا، میں نیم خودکار رائفل تھامے ہوئے بلندی سے افغان بارڈر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک ایسی تصویر تھی کہ مجھے ایسے کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہونا تھا، کم از کم اس وقت میرا یہی اندازہ تھا۔ میں کتنی پھوہڑ ہوں کہ میں اپنے دوپٹے کا ایک کونہ جو اس رائفل کے گریڈپٹ گیا تھا، الگ کرتے کرتے اس کا ”سیفٹی کیچ“ ہٹا بیٹھی، اور خیبر اٹفلو سپاہی جو عام طور پر بہت بہادر ہوتے ہیں اور مقابلوں کے لئے جان تک لڑا دیتے ہیں پل بھر میں منتشر ہو گئے۔ تاکہ میرا دوپٹہ چھڑاتے چھڑاتے یہ نہ چل جائے۔ ان میں سے ایک نے معاً اسے مجھ سے چھین لیا۔

جب مجھے احساس ہوا کہ میں کیا کرنے چلی تھی، میرا تو خون ہی جم گیا اگر یہ بہادر روح، مجھے غیر مسلح نہ کر دیتی پتہ نہیں کیا سانحہ رونما ہو چکا ہوتا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سب لوگ میری بدحواسی پر ہنس رہے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں چہروں پر ایسے تاثرات پہلے بھی دیکھے ہیں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں نے ٹیری ٹوریل آرمی میں اپنی بنیادی تربیت شروع کی تھی۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ یہ تربیت درہ خیبر میں اوسان خطا کر دینے والے اس واقعہ کے بعد سات روز سے بھی کم عرصے میں میرے لئے کتنی کارآمد ہوگی۔

میں ”ٹی، اے“ (ٹیری ٹوریل آرمی) میں اس وقت شامل ہوئی جب میں 1990ء میں ”Northern Echo“ کے لئے ڈائنگٹن میں کام کیا کرتی تھی۔ اس میں میری شمولیت ابتداء محض ایک شرط کے طور پر ہوئی۔ بعد میں مجھے اس سے واقعی دلچسپی ہو گئی اور اس کی بدولت اچھے اچھے لوگوں سے میل ملاقات کا موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ جم میکنش اور میں نے اپنے چار مشترکہ دوستوں کو ایک ڈنر پارٹی دی، یہ دوست اسی کی طرح ناظم بریا پولیس فورس کے ارکان تھے اور ان دنوں سنڈرلینڈ میں تعینات تھے۔ ڈنر میں گپ شپ خوب جاندار ہوئی اور کہانیاں سنائی جاتی رہیں۔ زندگی کے حقیقی واقعات سے زیادہ کوئی چیز دلچسپ نہیں ہوتی، اور پولیس ملازمین کے گروپ کی کہانیاں تو خاص طور پر زندہ دلانا اور تہہ بہہ آورہوتی ہیں۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں آ گئے، ایک کونے میں ٹی وی چل رہا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں اپنی اپنی برائڈی اور ہاسکی تھی۔ سب اونچی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر بات یہ چل نکلی کہ اگر ہم اپنی موجودہ ملازمت میں نہ ہوتے تو کیا کر رہے ہوتے۔ مردوں نے کہا کہ ہم سیکورٹی کے شعبے میں چلے جاتے، لڑکیاں کہنے لگیں کہ ہم نرسنگ کرتیں۔ کیونکہ ہم پہلے ہی فرسٹ ایڈ سے کافی آگاہ ہیں اور خون دیکھ کر ہم خوفزدہ بھی نہیں ہوتیں۔ پھر مارچی رولینڈ نے جو کہ بڑی باصلاحیت پولیس ملازم ہے (بعد میں وہ اپنے خوفناک حملے میں معزور ہو جانے کی وجہ سے فورس سے نکال دی گئی تھی) مجھ سے پوچھا، اچھا تم بتاؤ کہ تم کیا ہوتیں؟

میں سوچتی رہی، سوچتی رہی، اور میری خاموشی ناقابل برداشت ہو گئی تو جمنے اڑا رہا تھا۔ ”اگر اس سے بین اور کاغذ واپس لے لو تو یہ بالکل بیکار شے رہ جائے گی۔“ یہ سن کر میں آگ بگولہ ہو گئی۔ میری یادداشت میں فوجی کی طرف سے میری ٹوریل آرمی میں ریکرٹمنٹ کا ایک اشتہار ابھرا میں نے اعلان کیا ”اچھا یہ بات ہے، میں تو فوج میں بھی جاسکتی ہوں۔“ اس پر سب نے بلند قہقہے لگائے۔

فوجی ملازمت کسوں اور کسے؟

جم نے ایک بار پھر طنز کیا۔ ”تم تو پائیر کور میں غیر سرکاری فوجی بھی منتخب نہیں ہو سکتی ہو۔“ مجھے بہت طیش آیا مگر میں اپنے جذبات پر پردہ ڈالنے میں کافی ماہر ہوں۔ میں نے فوراً ”0800“ نمبر پر کال کی جو کہ میری ٹوریل آرمی کے اشتہار پر دیا ہوا نمبر تھا اور ان کے لئے اپنا نام اور ایڈریس چھوڑ دیا۔

ایک اینڈ کے بعد فون کی گھنٹی بجی، آرمی کی طرف سے ایک نہایت نفیس آدمی میری کال کا جواب دے رہا تھا۔ میں کسی قدر گھبرائی، اور اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ مجھے فوج میں نہیں جانا چاہئے تاہم جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ وہ بہت نفیس آدمی تھا، میں ڈرہم سٹی میں ”آرمی کیریئر آفس“ کا ایک چکر لگانے پر تیار ہو گئی۔

میں سبزی مائل نیلگوں سوٹ میں ملبوس تھی، جسے میں اس وقت تک بہت پسند کرتی رہی جب کسی نے کہہ دیا کہ میں اس لباس میں ”بارکلیز“ بنک کی ملازم لگتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر جم کہتا ہے کہ میں بیکار محض ہوں تو آرمی بھی یہی کہہ دے گی اور مجھے ملازمت کی پیشکش نہیں کرے گی۔ وہاں پہنچی تو مجھے بہت حیرت ہوئی کہ انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ میں بطور جرنلسٹ، ان کے لئے واقعی بہت مفید ثابت ہوں گی۔

ایک خاکی وردی میں ملبوش شخص نے مجھ سے پوچھا کیا آپ نے میری ٹوریل آرمی کے پبلک انفارمیشن آفس کا نام سنا ہے؟ آپ کو TAPIO بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح آپ کو ایک خود کار طریقے کے مطابق آفیسر رینک مل سکتا ہے۔

میں سوچ رہی تھی.... وہ تو کہتا تھا کہ میں پائیر کور میں ایک پرائیویٹ ملازم بھی بھرتی نہیں ہو سکتی کیا اب بھی کچھ سمجھے ہو کہ نہیں، میکفوش! چلو تمہارے لئے پہلا سبق یہی ہونا چاہیے کہ: ”کسی رڈ لے کو ہرگز چیلنج نہیں کرنا چاہئے۔“ چنانچہ میں ولٹ شارٹر میں لینڈ فورسز ہیڈ کوارٹر میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہونے کے لئے چل پڑی۔ یہ ایک بڑی مرعوب کن عمارت تھی۔ مجھے جوئیٹ دیا گیا، وہ یہ تھا کہ میں NATO ایکو پیمٹ کے پچاس پوزوں کو شناخت کروں فوجی خواتین کے بارے میں مختصر سی تقریر کروں اور ایک کاغذ پر دیئے گئے حقائق کی بنیاد پر اخبارات کے لئے ایک رپورٹ مرتب کروں۔ میں نے پہلا سوال یوں حل کیا کہ نیوکیسل پبلک لائبریری میں جین کی لکھی ہوئی ڈیفنس ٹکس کا دو دن خوب توجہ سے مطالعہ کیا اور جو کچھ اخذ ہو سکا اس کے مدد سے جواب لکھ لائی۔

دوسرا سوال بے حد اعصاب شکن تھا جبکہ تیسرا کوئی خاص بات نہیں تھی کہ اخبار نویس ہوتے ہوئے میں ایک قابل اشاعت رپورٹ تیار نہ کر سکتی۔

جب مجھے براؤن رنگ کا لفافہ، جس پر ”آن ہر میچ میز سروس“ کے الفاظ نمایاں دکھائی دے رہے تھے، موصول ہوا تو یہ پڑھ کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہ ”میں منتخب کر لی گئی ہوں، مجھے رائل سگنلز ڈپارٹمنٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے اور مجھے فوراً تربیت شروع کرنی ہے۔“ میں فوراً کٹ لینے پہنچ گئی۔ جب واپس آئی تو جم وہاں میرا منتظر بیٹھا تھا، اس کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا ”لوگ محض عشق لڑانے کے لئے میری ٹوریل آرمی میں جاتے ہیں۔“

اب قہقہہ لگانے کی باری میری تھی۔ میں اس آدمی پر ہرگز اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال میرا حوصلہ جوں کا توں رہا اور میں اپنی کٹ کوتر تیب دینے میں لگن رہی۔ میں سینڈ ہرسٹ ملٹری اکیڈمی کے 9 ماہ کے فاسٹ ٹریک کورس کی بجائے بنیادی فوجی تربیت کے لئے تیار وہ رہی تھی۔

وہاں تربیت کے دوران جو کچھ سکھایا گیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہتھیاروں کو کیسے استعمال کرنا ہے، ان کے پرزوں کو الگ الگ کیسے کرنا ہے اور دوبارہ جوڑ کر فائر کیسے کرنا ہے۔ اس سے پہلے ہمیں ٹریننگ ودفیو دکھائی گئی جس کے ذریعے یہ بات بتائی گئی کہ ہتھیار کیوں خراب ہو جاتے ہیں، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بعض زخم گن کو ملط استعمال کرنے کی وجہ سے آتے ہیں۔

جب مجھے پہلی بار پستول دیا گیا تو میں بہت ڈری ہوئی تھی اور کانپ رہی تھی۔ مجھے فائرنگ رینج میں لے جا کر بتایا گیا کہ اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اپنا بازو کھڑا کر دوں، ایک انسٹرکٹر میری مدد کو پہنچ جائے گا۔ میں نے نشانے پر دو فائر ہی کئے تھے کہ پستول جام ہو گیا، چنانچہ میں نے بازو بلند کیا اور پیچھے مڑ کر سب کے سامنے اسے تان کر کھڑی ہو گئی۔

اس پر تمام مرد اور خواتین سپاہی سر نیچا کر کے زمین کے ساتھ لگ گئے اور انسٹرکٹر نے مجھے سخت ڈانٹا، اس نے اینگلو سیکسن زبان میں نہیں بلکہ فوج میں مروجہ زبان میں اپنی جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ گن کو نیچے رکھ دو۔ میں نے فوراً تعمیل کی۔ اس نے ایسی بے ہودہ اور درشت زبان استعمال کی جو پہلی بار کسی نے میرے بارے میں استعمال کی تھی۔ اس نے کہا: ”کبھی گن کسی کی طرف سیدھی نہ کرنا، تا وقتیکہ سامنے دشمن کھڑا ہو۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ گن چل جاتی تو تو کسی کو قتل کر دیتی۔“ وہ اتنا قریب آ کر ڈکرا رہا تھا کہ اس کی ناک میری ناک کو تقریباً چھو رہی تھی۔

میں چاہتی تھی کہ یہاں زمین میں کوئی سوراخ ہوتا تو میں اس کے اندر دھنس جاتی۔ میں نے دل میں قسم کھائی کہ آئندہ ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔

تاریخ اپنے آپ کو انوکھے طریقوں سے دوہراتی ہے اور میں یہاں دراہ خیبر میں ایک بار پھر خاکی لباس والے لوگوں کو پانہ ڈھونڈنے کے لئے سر چھپاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میں پریشان ہو گئی اور اس ڈرامائی منظر سے ہٹے ہوئے آہستگی سے سڑک کی طرف چل پڑی تاکہ یہ ظاہر ہو کہ میں محض منہ میں ڈالے ہوئے مکھن کو نگھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں اس انتظار میں تھی کہ غفار کب آتا ہے، تاکہ وہ پاشا اور میں طورخم بارڈر کی طرف چلے جائیں۔ چند دن پہلے لاکھوں افغان مہاجرین کا بارڈر پر مجمع لگا ہوا تھا لیکن پاکستان نے اپنے دروازے بند کر لئے اور انہیں داخل ہونے سے روک دیا، غفار نے ایک ڈرائیور، کو جو کسی طرح داخل ہو گیا تھا، بتایا کہ سب کے سب مہاجرین چلے گئے تھے جیسے ہر کوئی عالمگیر جنگ کا انتظار کر رہا تھا۔

ہمارا چھوٹا سا تانلہ سڑک کی دوسری جانب اکٹھا ہو گیا تاکہ گھرواپسی کا سفر شروع کر سکے۔ پاشا اور میں جم کر کھڑے ہو گئے جبکہ غفار کافی دیر تک ایسے سپاہی سے بحث مباحثہ کرتا رہا اور اس نے واپس آ کر بتایا کہ سمجھوتہ نہیں ہو سکا میرا افغانستان جانے کا منصوبہ ایک بار پھر ناکام ہو گیا، مجھے ایک گونہ خوشی پھر بھی ہوئی کہ چلو اتنا مشہور دروازہ تو دیکھ لیا ہے اور ہم واپس چل پڑے۔

میں پرل کانٹنٹنٹل میں جا پہنچی اور اس کی پانچویں منزل کے بار میں ایان گالاگر اور فوٹو گرافر کو پایا۔ یہ ہمارے ”مقررہ اوقات“ سے بعد کا وقت تھا تاہم ان سے بات کرنے میں کوئی ہرج نہیں تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اب تک کیا کرتے رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک تو پاکستان کے روایتی لباس حاصل کئے ہیں اور وڑھ آدم خیل میں بننے والی گنوں کے بارے میں ایک خبر بنائی ہے۔

میں ایک دم چونکی اور بتایا کہ میں بھی دو دن پہلے وہاں گئی تھی۔ ہم نے اپنے نوٹس کا موازنہ کیا خاصی خوشگوار گپ رہی، اسی دوران میں بار سے کھسک گئی اور جم کو ٹیلی فون کیا۔ میں نے اسے کہا: ”دیکھئے یہ غالباً اتفاق ہے لیکن ”میل آن سنڈے“ نے گن فیکٹری پر ہماری ستوری چھاپ دی ہے، مجھے قوی شبہ ہے کہ ”ایکسپریس“ کے اندر کا کوئی آدمی ”میل آن سنڈے نیوز ڈیسک“ کے ڈیوڈ لین کو میری سرگرمیوں سے براہ مطلع کرتا رہتا ہے۔ میں نے یقیناً کسی کو راز دار نہیں بنایا، اگر پھر بھی وہاں بات پہنچ جاتی ہے تو وہ یہاں سے ہرگز نہیں جا رہی ہے۔“ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ ایان گالاگر نے بھی اپنے نیوز ڈیسک سے یہی گفتگو کی ہوگی۔

اس شام کو ہم واپس اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ میں نے پاشا کو بتایا کہ ڈیلی ایکسپریس کا ایک رپورٹر ڈیوڈ سمیت کل صبح سویریش شہر میں پہنچ رہا ہے، میں نے ایک رات پہلے ڈیوڈ کو فون پر بتایا تھا کہ میں کہیں نہ کہیں اس کے سونے کا بندوبست کر دوں گی اور اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ایک ٹیکسی کا بھی انتظام کر دیا جائے گا۔

اس نے پوچھا کہ کیا مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے، میں نے کہا: ”ہاں پلیز کوئی اچھی سی ٹوتھ پیسٹ لیتے آنا، میں

وہاں سے جو پیسٹ لائی تھی وہ میرے بیگ میں سے چرائی گئی ہے، اور پاکستان سے جو خریدی تھی، انتہائی گھٹیا ہے، اس میں نمک زیادہ پڑا ہوا ہے۔“

خدا کا شکر، کہ وہ پہنچ رہا تھا، بات صرف ٹوتھ پیسٹ کی نہیں تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں ایک دن کی چھٹی کر لیا کروں گی، میں یہاں کچھ گھومنا پھرنا اور دیکھنا بھالنا بھی چاہتی تھی۔ میں جب ہوٹل میں پہنچی تو ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے مجھے چھاڑیوں میں سے پیچھے کی طرف گھسیٹ کر نکالا گیا ہے۔ استقبالیہ شاف مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ مجھے ہمیشہ پرانے مال کے خریدار کی طرح بے وقت آتے جاتے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

صبح میں نے نیچے جا کر ناشتہ کیا، گھوم پھر کر کھانے کی اشیاء، پلیٹ میں رکھ کر لاتی رہی۔ میں اگرچہ مصالحوں دار غذا نہیں کھاتی تاہم ہلکے مصالحوں والے گوشت شوربے کی ڈش کھانے کی کچھ عادی ہو چکی ہوں۔ بعد میں دو فرنی انڈے کھا کر اول الذکر ڈش کا اثر زائل کر دیا۔ میں نے اپنے آپ کو شاباش دی کیونکہ ایک نہت سے پاکستان میں ہونے کے باوجود میں نارمل جا رہی تھی۔

اگست 1992ء میں بھی جب میں دمشق میں بھی غیر محتاط کھانوں کی وجہ سے پیٹ میں مروڑ اور پچش میں مبتلا ہو گئی تھی اور بری طرح نڈھال تھی، سات ماہ کی ڈیزی میرے پیٹ میں تھی، مجھے فوراً قبرص پہنچا دیا گیا جہاں تین دن، ڈاکٹر شب و روز میری دیکھ بھال کرتے رہے۔ اس سے پہلے میں ایک سال سے زائد عرصہ شام کے لیڈر احمد جبریل سے انٹرویو مانگ رہی تھی۔ جب بالآخر اس کے رابطہ کاروں نے ”ہاں“ کر دی تو میں جانے لگی مگر معالجوں نے اس حالت میں مجھے وہاں جانے سے روکنے کی کوشش کی تو میں نے کہا، نہیں میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔

احمد جبریل کا نام امریکہ کو انتہائی طور پر مطلوب افراد کی فہرست میں شامل تھا، جہاں تک میرا تعلق ہے میرے لئے یہ بے حد اہم انٹرویو تھا، اگرچہ بعد ازاں ”لاکربی“ کی بمہنگ کے سلسلے میں کسی اور کو سزا دیدی گئی تھی۔ اس سانحہ کی رات کو میں ”لاکربی“ میں تھی اور یہ مجھے بہت واضح طور پر یاد تھا اور اب بھی خوب یاد ہے۔ اس کا مجھ پر بہت اثر پڑا تھا اور آگے بھی کئی سال تک مجھ پر اثر انداز ہوتا رہا۔ یہ پرواز فرینکفرٹ سے براستہ لندن نیویارک جا رہی تھی کہ دھماکہ ہو گیا۔ طیارے میں سوار افراد (مسافر بمعہ عملہ) اور برسر زمین ہلاک ہونے والوں کی حتمی تعداد 270 تھی۔

میں ان دنوں نیوکیسل جرنل“ کے ہیڈ آفس میں کام کر رہی تھی، میری ڈیوٹی ڈے شفٹ میں تھی اور چھ بجے شام تک کام کرنا ہوتا تھا۔ میں اپنا کام ختم کر کے نکلنے والی تھی اور ”وائس ہالٹن“ جو اسی وقت رات کی شفٹ کے لئے آیا تھا، پولیس ایسولینس اور فائر بریگیڈ کو کالیں کر رہا تھا۔ اس نے چیختے ہوئے نیوز ایڈیٹر نام پیرسن سے کہا کہ بارڈرز میں کسی طیارے کا حادثہ ہو گیا ہے، ہم ان سوچوں میں تھے کہ شاید رائل ایئر فورس کے جیٹ طیاروں کی نیچے اڑانوں سے کوئی مسئلہ پیدا ہوا ہوگا۔

تاہم میں نے ادھر ادھر کا چکر لگایا تا کہ کوئی سراغ مل سکے۔ مگر جلدی ہی پتہ چلا کہ کوئی بہت ہی لرزہ خیز واقعہ ہو گیا ہے۔ میں اور ”وائس ہالٹن“ نے فوراً رضا کارانہ طور پر جانے وقوع پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں جھپٹ کر میری کار میں بیٹھے اور لاکربی کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ 21 دسمبر 1988ء کی شام سات بج کر 20 منٹ کا وقت تھا۔ میرا پاؤں اس وقت تک فلور بورڈ پر ہی رہا جب تک ”A69“ سے نکل نہیں گئے ہم ”گرینا گرین“ کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ ”لاکربی“ صرف پندرہ میل شمال مغرب میں تھا لیکن جونہی ہم موڑوے کی طرف مڑے یہ تقریباً سات میل نیچے تک جام پائی گئی۔ رکنے کے نشان جگہ جگہ ہمیں رکنے کے لئے کہہ رہے تھے، مگر میں ایسی رکاوٹوں کو کب خاطر میں لانے والی تھی۔ ہر پولیس چیک کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بے دھڑک شہر کے وسط میں جاڑو کا۔

© - جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

شہر پر خوفناک سناٹا طاری تھا۔ فضا میں طیارے کا ایندھن جلنے کی بد بو سی ہوئی تھی۔ گہری اور بدبودار دھند کی وجہ سے کوئی چیز بھی واضح طور پر نظر نہیں آرہی تھی۔ گلیاں اور سڑکیں ایسی دکھائی دے رہی تھیں جیسے کسی دیوہیکل صنعتی جاروب کش نے ٹنوں کے حساب سے نٹ بولٹس اور لوہے کے ٹوکڑاں لکڑے یہاں الٹ دیئے ہیں۔ لوگوں کی زبائیں کو یا لنگ ہو چکی تھیں اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ جیسے کوئی سلوموشن پکچر چل رہی ہو۔

”وائین“ ایک سمت میں چل پڑا اور میں دوسری طرف نکل گئی۔ چند مقامی سکاٹش رپورٹروں کو چھوڑ کر، ہمارا اخبار پہلا وہ پرچہ تھا کہ اس نمائندے بے جھجکت تمام یہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم بکھرے ہوئے اجزا کو جوڑ کر واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ایک لوکل پے فون استعمال کرنے کی کوشش کی مگر یہ ”ڈیڈ“ تھا علاقائی اخباروں کے بجٹ موبائل فونوں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے جو بہر حال ان دنوں اینٹ کی شکل کی بھاری سی چیز ہوتے تھے، اور آجکل تو بالکل ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ میں نے ارد گرد دیکھا تو ایک لاری نظر آئی جس کیب میں سے کئی ”ایریل“ باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس فون ہے؟ میں نے جلدی سے اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کیا تو اس نے کہا کہ فوراً گاڑی کے اندر کود پڑو۔ واہ! یہ تو ”جرنل“ کا ایک موبائل ڈسٹرکٹ آفس تھا جس میں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ میں نے اپنی ”کاپی“ فوراً فائل کر دی۔

جب میں فون کی دوسری جانب کے مانیٹسٹ، ”کاپی ٹیکر“ کو خبر لکھوانے لگی تو میں نے ایک پراسرار لاری ڈرائیور کا ذکر کیا جس نے ایک ہیرو کی طرح، میری خاطر اپنی گاڑی مین روڈ پر روک کر ٹریفک بند کر دی تھی۔ اس پر مجھے آواز آئی۔ ”اے بے وہ میں تھا جو اس وقت یہ گاڑی چا رہا ہوں، کیا واقعی مجھے ایک ہیرو سمجھ رہی ہیں؟“ میں پھر کاپی ٹیکر کی طرف متوجہ ہوئی اور کہا۔ ”پراسرار لاری ڈرائیور کے الفاظ حذف کر دو۔ میں تمہیں ایک نام اور ایک ایڈریس دے رہی ہوں اور جو واقعہ رونما ہوا، اس کی عنقریب مفصل رونا دہناؤں گی۔“

بہر حال خیر گزری، بعض اوقات انسان کو کچھ سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ میں نے ”وائین“ کو چھپنا مار کر گاڑی میں سوار کر لیا اور اس نے اپنا اکٹھا کیا ہوا مواد فائل کیا، ہم نے دبے پاؤں دوڑتے ہوئے سب پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ سام پیئرسن بے حد خوش ہوا اور ہم رات بھر صبح تین بجے تک کے ایڈیشن کے لئے کام کرتے رہے۔ میں جس طریقے سے واقعات بیان کر رہی ہوں ممکن ہے کہ وہ سنگدلانہ لگتا ہو لیکن ایک صحافی کو ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ حقائق اکٹھے کرنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے تاکہ قاری کے سامنے پورا منظر آجائے۔ صحافی پر نہ رشت طاری ہونی چاہیے اور نہ ہی اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹنا چاہئے۔ صرف بات آگے پہنچانی چاہئے آنسو صرف اپنے طور پر بہانے چاہئیں۔

یہاں نیوکیسل میں مقیم نام نہاد نیشنل رپورٹر کٹھڑی میں بندھے چوہوں کی مانند دکھائی دیئے مگر مشہور و معروف صحافی کلائو کرمر (ڈیلی مرر) ورڈوگ وائسن (ڈیلی سن) بھی موجود تھے۔ ڈوگ اس وقت آرٹڈیل سنٹر میں کمرس کی شاپنگ کر رہا تھا۔ پیغام ملنے پر مانیٹسٹ سے فوراً اپنی گاڑی پر یہاں پہنچا تھا۔ راجر سکاٹ (ڈیلی میل) اور الن بیکسٹر (ڈیلی ایکسپریس) ایک قتل کے بارے میں سنڈرلینڈ میں ہونے والی پریس کانفرنس میں سے اٹھ کر آئے تھے۔ کرمرس بونے اپنے چہرے پر ہشاشت سجائے بیٹھ کر گلاسگو پر واز سے آیا تھا۔ وہ اس وقت ”ڈیلی سٹار“ کی کمرس پارٹی میں شریک تھا کہ اسے فوراً ادھر کا رخ کرنا پڑا، اس کی شہر یہ ہے کہ یہ اپنی شراب نوشی پر پورا قابو رکھتا ہے۔ اور واحد آدمی ہے جو ہمیشہ آمادہ سفر رہتا ہے۔ میں یہاں خاص طور پر جو بات بتانا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ ”وائین“ اور میں ان سے کچھ فاصلے پر رہے کیونکہ ان کے بھاری موبائل فونوں کی بیڑیاں ختم ہونا شروع ہو گئی تھیں، اور ہم نے اپنے ”ڈسٹرکٹ آفس“ کو ہر قیمت پر مخفی رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

یہاں کے واقعات نے مجھے جو جذباتی اور نفسیاتی صدمے پہنچائے تھے وہ چند دن بعد میرے داخلی وجود میں سرایت کرنے لگے۔ میں اندر سے ٹوٹنے لگی، میں نے سوچا کہ مجھے شاید کوئی پیشہ ورانہ جذباتی مشاورت درکار ہوگی، شاید اس کے لفظوں ہی سے گھاؤ مندمل ہو سکیں، مگر کوئی ڈھارس بندھوانے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنے شوہر جم سے اس کا ذکر کرنے کی کوشش کی اس نے میرا فقرہ بھی مکمل نہ ہونے دیا اور کہا کہ وہ پولیس فورس میں اس سے بھی زیادہ بھیانک مناظر دیکھ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اس سے بدتر واقعات نہیں دیکھے ہوں گے، یہ ایسا دعویٰ کیسے کر سکتا تھا۔ تاہم اس کے بعد میں نے اس موضوع پر اس سے کوئی بات نہیں کی۔

یہ بالکل سچ ہے کہ اس خوفناک واقعے کے بعد میں کبھی کمرس ٹھیک طور پر نہیں مناسکی۔ خدا جانے، ”لاکربی“ کے لوگ اور بد قسمت طیارے کے مسافروں کے لواحقین ہر سال یہ تقریباً کیسے مناتے ہوں گے! بعض اوقات جب

کوئی تہواری موسم آتا ہے، میں اس وقت خواہ کہیں بھی ہوں، میرا ذہن فوراً اس سرحدی شہر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کی خوشیاں ہمیشہ کے لئے ماند پڑ گئی ہیں اور یہاں کے ہر باسی کے دل پر زخموں کے انمٹ نشان پڑ گئے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے دوا ایسے والدین کے انٹرویو کئے تھے جو اس سانحے کے وقت ٹی وی پر "This is your life" پر وگرام دیکھ رہے تھے، اور ان کے دو بچے "کرمس ٹری" کے نیچے کھیل رہے تھے کہ ایک خوفناک دھماکے نے ان کے گھر کو بلا کر رکھ دیا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جنہش کرتے دھڑام سے طیارے کی نشستوں کی ایک قطار کھڑکی کو توڑتی ہوئی اندر آ گئی جس پر تین مرے ہوئے مسافروں کی پھولی اور جلی ہوئی لاشیں اب بھی چپکی ہوئی تھیں۔

یہ تصویر میرے ذہن پر ہمیشہ منقش رہے گی۔ میں اس کی کیا تو جیہہ کر سکتی ہوں؟ اور انہوں نے اپنے بچوں کو کیسے سمجھایا ہوگا؟ کہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا ہے۔ یہ تجربہ بار بار میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ غالباً میں "بعد از صدمہ خلیل اعصاب" (Post-traumatic stress disorder) میں مبتلا ہو چکی تھی۔ نہ دن کو چین ملتا تھا، نہ رات کو سکون کی نیند سو سکتی تھی۔ لیکن میرے پیشے کا تقاضا تھا کہ خبر نگاری کو ذاتی صدمے سے الگ کر کے دیکھوں اور صرف خبریں جمع کرنے سے سروکار رکھوں۔ یہی وجہ تھی کہ احمد جبرائیل سے انٹرویو لینا میرے لئے بے حد اہم تھا۔ میں اس سے ڈوبڈوبات کرنا چاہتی تھی۔ اس سے کسی حد تک "لاکربی" کی اس رات کے واقعات کے حوالے سے بات اگوانے کی ناممکن چیز کو ممکن بنانا چاہتی تھی چنانچہ میں دمشق پہنچ گئی۔ اگر میں اس سے پورا اعتراف جرم کرانے کی توقع کر رہی ہوتی تو مجھے یقیناً مایوسی ہوتی۔

وہ ایک نرم خو اور معتدل مزاج شخص تھا، اس کے چہرے پر بزرگانہ شفقت کا نور جھلکتا تھا اور گہری آنکھیں اپنے اندر کوئی کرب چھپائے ہوئے تھیں۔ ہم ایک ترجمان کی مدد سے گفتگو کر رہے تھے، اس نے اس واقعہ کی ذمہ داری سے صاف انکار کیا، میں نے اس سے یہ سوال تین دفعہ مختلف انداز میں پوچھا لیکن اس کا جواب وہی تھا۔ میرے لئے اس سے زیادہ جارحانہ انداز اختیار کرنا ممکن نہیں تھا اور خاص طور پر اس وقت جب وہ مسلح محافظوں سے گھرا ہوا تھا، اور سب کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔

آدمی تلاش نہیں کر لیتا۔ یہ بندوبست بہت مناسب رہے گا۔ میں اس پر اعتماد کر سکتی ہوں۔ اسے ابھی تک فلیٹ سٹریٹ کے خشک اور خشکی مزاج لوگوں کی ہوائیں لگی۔

وہ دن میرے لئے بہت ہی بد مزہ رہا، میں نے زیادہ تر وقت اپنے کمرے اور اپنے بیڈ میں گزارا۔ میرے کپڑے کم پڑنے لگے تھے کیونکہ میرے زیادہ پسندیدہ ملبوسات ہوٹل لانڈری میں پڑے تھے۔ چنانچہ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کر ”اسامہ بن لادن ٹی شرٹ“ پہن لی جو اس ہفتے کے شروع میں پاشا نے مجھے دی تھی۔

مردوں کی ”نا سوجھی“

دن بھر ہوٹل کا ایک ملازم بار بار میرے دروازے پر دستک دیتا رہا اور پوچھتا رہا کہ کیا مجھے کسی خاص چیز کی ضرورت ہے اور یہ بھی پوچھتا رہا کہ کیا میں روم سروس سے خوش ہوں۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ میرے دل میں مردوں کے لئے عزت مزید بڑھ جاتی اگر ان میں سے کوئی آکر مجھ سے یہ پوچھتا ”کیا کچھ پینا پلانا پسند کرو گی، کیا میں تم سے کچھ دل لگی کر سکتا ہوں۔“ اس خاص قسم کی پیشکش پر بھی میری طرف سے انکار ہی ہوتا، مگر دلچسپی ذرا بڑھ جاتی، یہ کیا ہے کہ یہ بار بار ایک تھکا دینے والی بات پوچھتے جا رہا تھا۔ ”کیا چاہیے؟“ تاہم کئی گھنٹوں کے بعد جب دروازے پر ایک مانوس سی دستک سنائی دی۔ دروازہ کھولا تو سوال ویسا ہی تھا جیسی توقع تھی۔ میں نے کہا ”ہاں ایک خاص ہی چیز کی ضرورت ہے، کیا تم میرے لئے ٹیمپنز (Tampons) کا ایک باکس لا سکتے ہو میرا پیر یڈا بھی ابھی شروع ہوا ہے۔“ وہ یہ سکر ایسا شرمایا کہ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، اور غائب ہو گیا۔

چند ہفتے پہلے، اسلام آباد آنے سے قبل میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی تھی، میں اس کے لئے خاصی پُر جوش رہتی تھی میں اس سے اپنے وہاں کے دنوں میں اکثر ملتی جلتی تھی اور ہم انٹرنیٹ پر پیغامات کا بھی تبادلہ کرتے تھے، اس تو ار کو اس نے خاص طور پر ایک پیغام بھیجا اور پوچھا کہ کیسی ہو؟ میں نے اپنی خیریت کی اطلاع دینے کے بعد اس سے پوچھا، کہ آج کے ”سُنڈے“ ایکسپریس میں میری چھپنے والی خبریں تمہیں کیسی لگیں؟ صاف ظاہر ہے کہ میں اس سے داد تحسین چاہتی تھی۔ میں اس کے جواب کی منتظر تھی کہ رک رک کر لکھا ہوا جواب موصول ہوا۔ میں نے آج کا اخبار خریدنے کا تکلف نہیں کیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں اس وقت اسلام آباد میں تھی اور صاف بات ہے کہ میں فون اٹھا کر اس پر گالیوں کی بوچھاڑ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسی پیغام پر اکتفا کی..... ”Big Mistake“ میرے گھر واپس آنے تک، اس نے کئی بار مجھ سے فون پر کال کی مگر میں نے پہلے کی سی سرگرمجوشی کے ساتھ جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا، اور زیادہ تر مرد اس معاملے میں نا سمجھ ہی ہوتے ہیں۔ اخبارات میری زندگی ہیں اور یہ میرے لئے زندگی بھر ایک مضبوط قابل اعتبار اور ٹھوس چٹان کی طرح ایک سہارا رہے ہیں، تاوقتیکہ ڈیزی پیدا ہو گئی۔ کئی بوائے فرینڈز اور شوہر آئے اور گئے میرے لئے میری جاب سے اہم کوئی بھی نہیں تھا۔

یہ جاب میری لئے ایک معقول آمدنی، بہت سی سپورٹ، متحرک رکھنے کا ایک ذریعہ، ایک پُر خطر مہم، ایک دل بہلا وا، ایک لذیذ کھانوں کا اہتمام اور ایک قابل اعتماد دوستوں کا نیٹ ورک ہے جبکہ ڈیزی میرے لئے ایک غیر مشروط محبت ہے۔ البتہ ایک چیز جس کا مجھے شدید ارمان ہے، ناپید ہے اور وہ ہے، صبح کے وقت بیڈ میں بغلگیری، گرمجوشی، مہستری اور وہیں ناشتہ۔ تو آؤ لڑکیو، سب مل کر گریہ کریں۔ آخر ہم میں ایسی خوش نصیب کتنی ہوں گی جنہیں یہ چیز روز ملتی ہوگی؟

مجھے معلوم نہیں کہ مردوں کو کیا کیا ارمان ہوں گے۔ میں کافی عرصہ سے مردوں کو سمجھنے کی کوششوں سے دستبردار ہو چکی ہوں۔ اکیسویں صدی میں مرد ہونا بھی یقیناً ایک مشکل مسئلہ بن چکا ہے کیونکہ عورتیں کمزور اور نکٹھو مردوں کو پسند نہیں کرتیں اور ساتھ یہ بھی ہے کہ انہیں بے ڈھنگے بے وقوف اور بے ہودہ مرادانگی کا مظاہرہ کرنے والے مرد نہیں بھاتے۔ نہیں مجھے بھی گرد و پیش میں ہونے والی بہت سی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ تین شادیوں کی ناکامی کے بعد میں نے سوچا ہے کہ اب میں اپنی مادرانہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اور صحافت کے تقدس کا پرچم بھی سر بلند رکھوں گی، اپنی بہترین صلاحیتوں کو بھی انہی کے لئے وقف کروں گی اور دونوں کے ساتھ انصاف کروں گی۔ میں نے حال ہی میں اپنے ایک اچھے دوست ”باری اتوان“ کے ساتھ ڈنر کیا جو لندن سے نکلنے والے ایک عربی اخبار القدس کا ایڈیٹر ہے۔ اپنے سابق شوہروں کے گلے شکوے کرتے ہوئے میں نے کہا: تم غالباً جانتے ہو کہ میں اس امر کی ایک عمدہ مثال ہوں کہ طے شدہ شادیاں (arranged marriages) اتنی زیادہ بری نہیں ہوتیں۔“ اس نے میری طرف غور سے دیکھا لیکن اپنی سنجیدگی کو زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکا اور یوں ہنسنے لگا جیسے اس پر قہقہوں کا دورہ پڑ گیا ہو۔

”اتوان باری“ دنیا کے ان چند صحافیوں میں سے ہے جنہوں نے اسامہ بن لادن کا انٹرویو کیا تھا۔ وہ اس موضوع پر میڈیا کا ایک باضابطہ مبصر ہے اور گیارہ ستمبر کے بعد سے مسلسل کیمروں کی آنکھ کے سامنے اسامہ کے بارے میں سوالوں کا جواب دیتا رہا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات اس واقعہ کے کئی ماہ بعد ہوئی تھی جب اس نے ”بدنام زمانہ

دکھوں کا موازنہ

میں نے ایک نیا حربہ اختیار کیا اور جذباتی انداز میں ان مناظر کی تصویر کشی کی، جو میں خود دیکھ کر آئی تھی مثلاً کاٹھ کباڑ میں پھنسی ہوئی انسانی لاشوں اور ایک بچے کے جسم کے ٹکڑوں کا ذکر کیا جو چھپ پر بکھرے ہوئے تھے اور ان مصیبت زدہ لوگوں کی حالت زار کی طرف توجہ دلائی جن کا مشرق وسطیٰ کی سیاست میں کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنی حالت بھی بتائی کہ ان مناظر نے مجھے شدید ذہنی کوفت اور جذباتی دھچکوں سے دوچار کر دیا ہے۔

اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی دلی کیفیت کا اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اظہار شروع کر دیا، اس نے اگر جدار انداز میں کہا۔ ”ہم تو ہر روز کاٹھ کباڑ کے لمبے سے اپنے بچوں کے بکھرے ہوئے اعضا پھتے ہیں، ہماری یہ حالت اسرائیلی بموں کا نتیجہ ہے، آپ کو ”لا کر بی“ کے واقعہ سے پتہ چل گیا ہے کہ ہم کن چیرہ دستیوں کا شکار ہیں۔ آپ نے تو اس کا ذائقہ پہلی بار چکھا ہے، ہم تو اس کے عادی ہو چکے ہیں۔“

الفاظ بہت سخت مگر نپے تلے تھے جن سے اس کی دلی نفرت کی گہرائیوں کا صاف اندازہ ہو رہا تھا۔ الفاظ کے پیچھے دھکوں کی کراہٹوں اور مایوسیوں کے انبار محسوس ہو رہے تھے، اس کی آواز کی لرزش دھکوں ہی کی غمازی کر رہی تھی۔ تاہم اس نے ”لا کر بی“ میں فلائیٹ 103 کے سانحہ کیب ارے میں تفتیشی ٹیم کے ساتھ کسی بھی غیر جانبدار ملک میں تعاون کرنے کی پیشکش کی لیکن نیوکیسل میں ”سندھ سن“ اور پھر ہمارے ”سٹر پیپر“ سکاٹ لینڈ آن سنڈے“ کے ذریعے کی گئی اس پیشکش کا دوسری جانب سے کوئی مثبت جواب نہیں دیا گیا۔

میں اس کے ساتھ کئی گھنٹے رہی، انٹرویو کے آخر میں میرے معدے میں شدید درد ہونے لگا اور جب اس نے الوداع کہی تو میں نے شکر ادا کیا۔ معلوم نہیں میں اتنی تکلیف کو کس طرح دبائے بیٹھی رہی، جب میں واپس اپنے ہوٹل پہنچ کر باتھ روم میں داخل ہوئی تو میرا پیٹ پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

معلوم نہیں کہ مجھے اتنی تکلیف کیوں ہوئی حالانکہ میں بہت محتاط رہی۔ میں نے گوشت، مچھلی، مرغیات اور پھل وغیرہ کھانے سے گریز کیا۔ دانت بوتل کے پانی سے برش کئے اور اپنی ڈرنکس میں آئس شامل نہیں کی پورا دن بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ بستر پر تر پتی رہی۔ پھر میں دمشق سے نکلنے کے لئے ہمت کر کے ایئر پورٹ پر پہنچی اور وہاں سے قبرص گئی جہاں میں اپنی بے بی کے باپ داؤد زارورہ سے ملی، اور اس نے مجھے نکوشیا میں ایک کلینک میں پہنچایا۔

ڈاکٹر نے تفصیلی معاینہ کیا اور میں نے جتنی چیزیں کھائی تھیں، ان کے بارے میں پوچھا۔ اس سے مجھ پر مناشف ہوا کہ میں نے ایک مقامی طور پر تیار شدہ آئس کریم کھائی تھی۔ جس کا ذائقہ تو بہت اچھا تھا مگر اس کے اجزاء غیر صحتمندانہ تھے۔ میں نے خود سے کہا۔ ”یو آئے رڈ لے تو بڑی احمق عورت ہے، آئس کریم تو بالکل پانی ہوتی ہے، اس سے تو مقامی سوق (بازار) سے نلکے کا پانی پی لینا بہتر تھا۔“

دمشق کے تجربے کے بعد میں، اپنی غذا کے بارے میں بہت محتاط ہو گئی ہوں، اس لئے اسلام آباد میں صرف دو فرائڈ انڈوں کا ناشتہ کرتی رہی، یہ ہوٹل اگرچہ بہت ماڈرن تھا، اس کے گرد اگر د علاقے میں ٹائلٹ کی مناسب سہولت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ قضاے حاجت کے لئے کڑوں بیٹھ کر اپنا توازن کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

جونہی میں نے ناشتہ ختم کیا، ڈیوڈ سمیتھ آ پہنچا، وہ ایک ”تکلیف دہ سفر کر کے آیا اور بے حد تھکا ہوا تھا۔ وہ ٹوٹھ پیسٹ کی دوٹیوہیں لے کر آیا تھا۔ اس نے ایئر پورٹ سے لائے جانے کے لئے پاشا کو بھیجنے پر میرا بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا طیارہ صبح چار بجے یہاں پہنچا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی اور ہم گرجموشی کے ساتھ بغلگیر ہوئے میرے لئے اپنے دوست علاقے کے کسی فرد سے ملاقات بڑی مسرت انگیز تھی۔ وہ زیادہ دیر ٹھہرنے کیلئے نہیں آیا تھا اس نے بتایا کہ ممکن ہے کہ وہ پشاور چلا جائے۔

میں نے اسے درہ خیبر کے بارے میں اپنی کتابوں میں سے ایک کتاب دی اور تاکید کی کہ وہ اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرے کیونکہ یہ ایک بہت بڑا تجربہ ہے۔ ڈیوڈ بہت اچھا نوجوان ہے، ایک عمدہ صاحب قلم ہونے کے علاوہ نفیس عادات و اطوار کا مالک بھی ہے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ انٹرویو لیتا ہے اور جن لوگوں کے انٹرویو لے رہا ہوتا ہے وہ بھی اس سے بہت خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ جی لگا کر کام کرتا ہے اور بے حد جفاکش بھی ہے۔ جس دن اس کے پاس کوئی کام نہ ہو تو شاید وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں یہ بات یقین سے اس لئے کہتی ہوں کہ وہ ہمیشہ دفتر میں ہی پایا جاتا ہے، اور میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔

میں نے پاشا سے کہا کہ میں اس سے اگلی صبح ملوں گی اور وہ ایک دن کی چھٹی کر سکتا ہے لیکن اس نے رضا کارانہ طور پر کہا کہ وہ ڈیوڈ کو گھمانے کے لئے لے جائے گا۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ جب تک سمیتھی (ڈیوڈ سمیتھ) اپنا الگ

آدمی تلاش نہیں کر لیتا۔ یہ بندوبست بہت مناسب رہے گا۔ میں اس پر اعتماد کر سکتی ہوں۔ اسے ابھی تک فلیٹ سٹریٹ کے خشک اور شکی مزاج لوگوں کی ہوائیں لگی۔ وہ دن میرے لئے بہت ہی بد مزہ رہا، میں نے زیادہ تر وقت اپنے کمرے اور اپنے بیڈ میں گزارا۔ میرے کپڑے کم پڑنے لگے تھے کیونکہ میرے زیادہ پسندیدہ لباسات ہوٹل لانڈری میں پڑے تھے۔ چنانچہ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کر ”اسامہ بن لادن ٹی شرٹ“ پہن لی جو اس ہفتے کے شروع میں پاشا نے مجھے دی تھی۔

مردوں کی ”ناسمجھی“

دن بھر ہوٹل کا ایک ملازم بار بار میرے دروازے پر دستک دیتا رہا اور پوچھتا رہا کہ کیا مجھے کسی خاص چیز کی ضرورت ہے اور یہ بھی پوچھتا رہا کہ کیا میں روم سروس سے خوش ہوں۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ میرے دل میں مردوں کے لئے عزت مزید بڑھ جاتی اگر ان میں سے کوئی آ کر مجھ سے یہ پوچھتا ”کیا کچھ پینا پلانا پسند کرو گی، کیا میں تم سے کچھ دل لگی کر سکتا ہوں۔“ اس خاص قسم کی پیشکش پر بھی میری طرف سے انکار ہی ہوتا، مگر دلچسپی ذرا بڑھ جاتی، یہ کیا ہے کہ یہ بار بار ایک تھکا دینے والی بات پوچھے جارہا تھا۔ ”کیا چاہیے؟“ تاہم کئی گھنٹوں کے بعد جب دروازے پر ایک مانوس سی دستک سنائی دی۔ دروازہ کھولا تو سوال ویسا ہی تھا جیسی توقع تھی۔ میں نے کہا ”ہاں ایک خاص ہی چیز کی ضرورت ہے، کیا تم میرے لئے ٹیمپنز (Tampons) کا ایک باکس لا سکتے ہو میرا بیڈ ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔“ وہ یہ سکر ایسا شرمایا کہ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، اور غائب ہو گیا۔ چند ہفتے پہلے، اسلام آباد آنے سے قبل میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی تھی، میں اس کے لئے خاصی پُر جوش رہتی تھی میں اس سے اپنے وہاں کے دنوں میں اکثر ملتی جلتی تھی اور ہم انٹرنیٹ پر پیغامات کا بھی تبادلہ کرتے تھے، اس تو ار کو اس نے خاص طور پر ایک پیغام بھیجا اور پوچھا کہ کیسی ہو؟ میں نے اپنی خیریت کی اطلاع دینے کے بعد اس سے پوچھا، کہ آج کے ”سنڈے ایکسپریس“ میں میری چھپنے والی خبریں تمہیں کیسی لگیں؟ صاف ظاہر ہے کہ میں اس سے دو تحسین چاہتی تھی۔ میں اس کے جواب کی منتظر تھی کہ رک رک کر لکھا ہوا جواب موصول ہوا۔ ”میں نے آج کا اخبار خریدنے کا تکلف نہیں کیا۔“ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں اس وقت اسلام آباد میں تھی اور صاف بات ہے کہ میں فون اٹھا کر اس پر گالیوں کی بوچھاڑ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسی پیغام پر اکتفا کی..... ”Big Mistake“ میرے گھر واپس آنے تک، اس نے کئی بار مجھ سے فون پر کال کی مگر میں نے پہلے کی سی سرگرمجوشی کے ساتھ جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا، اور زیادہ تر مرد اس معاملے میں ناسمجھ ہی ہوتے ہیں۔ اخبارات میری زندگی ہیں اور یہ میرے لئے زندگی بھر ایک مضبوط قابل اعتبار اور ٹھوس چٹان کی طرح ایک سہارا رہے ہیں، تاوقتیکہ ڈیزی پیدا ہو گئی۔ کئی بوائے فرینڈز اور شوہر آئے اور گئے میرے لئے میری جاب سے اہم کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ جاب میری لئے ایک معقول آمدنی، بہت سی سپورٹ، متحرک رکھنے کا ایک ذریعہ، ایک پُر خطر مہم، ایک دل بہلاوا، ایک لذیذ کھانوں کا اہتمام اور ایک قابل اعتماد دوستوں کا نیٹ ورک ہے جبکہ ڈیزی میرے لئے ایک غیر مشروط محبت ہے۔ البتہ ایک چیز جس کا مجھے شدید ارمان ہے، ناپید ہے اور وہ ہے، صبح کے وقت بیڈ میں بغلگیری، گرمجوشی، ہمستری اور وہیں ناشتہ۔ تو آؤ لڑکیو، سب مل کر گریہ کریں۔ آخر ہم میں ایسی خوش نصیب کتنی ہوں گی جنہیں یہ چیز روز ملتی ہو گی؟ مجھے معلوم نہیں کہ مردوں کو کیا کیا ارمان ہوں گے۔ میں کافی عرصہ سے مردوں کو سمجھنے کی کوششوں سے دستبردار ہو چکی ہوں۔ اکیسویں صدی میں مرد ہونا بھی یقیناً ایک مشکل مسئلہ بن چکا ہے کیونکہ عورتیں کمزور اور نکلے مردوں کو پسند نہیں کرتیں اور ساتھ یہ بھی ہے کہ انہیں بے ڈھنگے بے وقوف اور بے ہودہ مرادانگی کا مظاہرہ کرنے والے مرد نہیں بھاتے۔ نہیں مجھے بھی گرد و پیش میں ہونے والی بہت سی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ تین شادیوں کی ناکامی کے بعد میں نے سوچا ہے کہ اب میں اپنی مادرانہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اور صحافت کے تقدس کا پرچم بھی سر بلند رکھوں گی، اپنی بہترین صلاحیتوں کو بھی انہی کے لئے وقف کروں گی اور دونوں کے ساتھ انصاف کروں گی۔ میں نے حال ہی میں اپنے ایک اچھے دوست ”باری اتوان“ کے ساتھ ڈنر کیا جو لندن سے نکلنے والے ایک عربی اخبار القدس کا ایڈیٹر ہے۔ اپنے سابق شوہروں کے گلے شکوے کرتے ہوئے میں نے کہا: تم غالباً جانتے ہو کہ میں اس امر کی ایک عمدہ مثال ہوں کہ طے شدہ شادیاں (arranged marriages) اتنی زیادہ بری نہیں ہوتیں۔“ اس نے میری طرف غور سے دیکھا لیکن اپنی سنجیدگی کو زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکا اور یوں ہنسنے لگا جیسے اس پر قہقہوں کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ”اتوان باری“ دنیا کے ان چند صحافیوں میں سے ہے جنہوں نے اسامہ بن لادن کا انٹرویو کیا تھا۔ وہ اس موضوع پر میڈیا کا ایک باضابطہ مبصر ہے اور گیارہ ستمبر کے بعد سے مسلسل کیمروں کی آنکھ کے سامنے اسامہ کے بارے میں سوالوں کا جواب دیتا رہا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات اس واقعہ کے کئی ماہ بعد ہوئی تھی جب اس نے ”بدنام زمانہ شخصیت“ کا وہ انٹرویو کیا تھا جس کی دنیا بھر میں دھوم مچ گئی تھی۔

میں پاکستان اور افغانستان جانے کی منصوبہ بندی کر رہی تھی اور صاف ظاہر ہے کہ میں کسی کی طرح ”خاص قسم کا“ انٹرویو کرنا چاہتی تھی اور اس کے لئے مجھے اس کے کچھ اشاروں اور رہنمائی کی ضرورت تھی اس نے مجھے بتایا کہ بن لادن بے حد محتاط آدمی ہے، تمہارے پاس کوئی بھی الیکٹرانک چیز حتیٰ کہ کلائی کی گھڑی تک نہیں ہونی چاہیے۔ اس نے بتایا کہ کئی آدمی مجھے بن لادن سے ملوانے کا وعدہ کریں گے لیکن کوئی بھی وعدہ پورا نہیں کر سکے گا اور مجھے اپنے طریق کار کے بارے میں ہوشیار رہنا ہوگا۔

مجھے احساس ہو گیا کہ اس کے لئے مجھے بڑے پارٹینر پڑیں گے، اور پیچ در پیچ فاصلے طے کرنا ہوں گے۔ احمد بریل کو یہ مفت خواہ طے کرتے کرتے تقریباً ایک سال لگ گیا تھا۔ اس تناظر میں دیکھا تو اندازہ ہوا کہ مجھے شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ درکار ہوگا۔ تاہم آپ جانتے ہی ہیں جیسا کہ کہاوت ہے ”آہستہ آہستہ چل کر بندر کو بھی پکڑا جاسکتا ہے۔“

میری ایک خاص عادت بھی ہے، مجھے پتہ نہیں کہ یہ اچھی یا بری۔ اگر مجھے اپنے مقصد کے صحیح ہونے کا یقین ہو تو میں نہ پیچھے ہٹی ہوں اور نہ بددلی سے دوچار ہوتی ہوں۔ ہاں البتہ اگر میں اس نتیجے پر پہنچ جاؤں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں تو میں ناکامی کا داغ قبول کرنے کی بجائے وہ راستہ ہی ترک کر دیتی ہوں۔

میں ناکامی سے اس لئے نفرت کرتی ہوں کہ میں خود کو منفی سمجھنے سے نفرت کرتی ہوں۔ میں منفی راہوں کی راہی نہیں ہوں۔ جب میں پریشان ہو جاؤں تو میں ایک ذرا سا کراہت انگیز کھیل کھیلتی ہوں جو میں نے 1960ء میں ہیلے ملز کی فلم ”پولیانہ“ میں سے اخذ کیا تھا۔ پولیانہ ایک یتیم بچی تھی جو پریشان ہو جاتی تو ”گلیڈ گیم“ کھیلا کرتی تھی۔ جب اس کی زندگی میں کوئی افسوسناک واقعہ پیش آ جاتا تو اس وقت وہ کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچنے لگتی جو اسے خوشی سے سرشار کر سکے۔ میں سوچتی کہ پولیانہ کی تین شادیاں ٹوٹ گئی ہوتیں اور بیشتر رشتے جڑتے جڑتے درہم برہم ہو چکے ہوتے تو وہ ”گلیڈ گیم“ کیسے کھیلتی؟ تاہم اس نقطے پر میرا افغانستان میں داخل ہونے کا عزم اور میرا اپنے کام کی عظمت پر یقین چٹان کی طرح ناقابل شکست تھا۔ کون جانتا ہے کہ میں بھی ایک دن اپنا اصل مقصد حاصل کرنے، یعنی اسامہ بن لادن کا انٹرویو کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

ڈبیری، ڈانور اور خطرات

پاشا مجھے لے جانے کے لئے سویرے سویرے ہی آپہنچا۔ میں نے اسے کہا کہ اسلام آباد میں افغان سفارت خانے کا ایک اور چکر لگانے کی ضرورت پڑ چکی ہے۔ میرا یہ خیال کہ مجھے ویزا ایک روز پہلے 9 بجے مل جائے گا، سکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقے میں پھیلی ہوئی کہر کی طرح ثابت ہوا۔ تاہم میں نے ڈلے رہنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

میں نے اپنے ڈھانچے ہوئے سر کے ساتھ دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا، ویزا انسر کو اکھڑا ہوا پایا۔ اس نے میرے استفسار پر تھکے ہوئے انداز میں کہا ”میرے پاس ویزا کے لئے پانچ سو درخواستیں پڑی ہوئی ہیں، انہیں مکمل چھان بین کے لئے قابل بھیجا جائے گا، فی الحال کسی کو ویزا نہیں دیا جا رہا ہے، اگلے ہفتے آجانا۔“

میں نے اس کے جواب کو خاطر میں لائے بغیر کہا۔ ”میں آپ کے لئے ملک سے فوراً چلی جانا چاہتی ہوں اور جو کچھ ہونے جا رہا ہے اس کی ایک متوازن سی روایت اور قلمبند کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بہت سے قبائلی بارڈر کی طرف جا رہے ہیں تاکہ اگر امریکا حملہ کر دے تو افغان ہسپتالوں میں پہنچائے جانے والے زخمیوں کے لئے خون کا عطیہ دے سکیں، آپ مجھے ویزا دیدیں تو پاؤ ڈیرہ پاؤ خون میں بھی دیدیں گی۔“

اس کو میری پیشکش پر یقین نہ آیا، اس نے میری طرف چونک کر دیکھا، ممکن ہے کہ اس نے مجھے پاگل سمجھا ہو یا وہ ایک کافر کے خون کو ناپاک سمجھ کر اسے قبول کرنے کے نتائج سے گھبرا گیا ہو۔ تاہم اس کے جذبات سے عاری اور پتھر کی طرح سخت چہرے سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا ہمدردی حاصل کرنے کا حربہ ناکام ہو گیا ہے اور مجھے ویزا جلد ملنے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

جب میں خالی ہاتھ واپس لوٹی تو پاشا نے قہقہہ لگایا۔ ”آپ ناقابل شکست نہیں ہیں، آخر کار اپنے ہی جیسے آدمی سے آپ کا پالا پڑا ہے۔“ میں نے کہا، بلی کی کھال کھینچنے کے کئی ایک طریقے ہیں، اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہم دونوں کو سر جوڑ کر سوچنا ہوگا۔

پھر ہم ایک اور سرکاری دفتر کی طرف رواز نہ ہو گئے جہاں کشمیر کیلئے ویزے جاری ہوتے ہیں، میں نے دفتر میں درخواست پیش کرتے ہوئے متعلقہ انسر کو بتایا کہ میری چند دن ہی کی چھٹی ہے اور میں اس خطے میں بطور سیاح جانا چاہتی ہوں۔

اس نے میرے کاغذات وصول کرتے ہوئے بے اعتنائی سے کہا ”ہم تین ہفتوں میں آپ کو بتا دیں گے۔“ اور اٹھ کر چل دیا اور میری اگلی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ میں انتہائی شکستہ دلی سے باہر نکل آئی۔ میں کشمیر میں اس لئے

داخل ہونا چاہتی تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں البدر نام کی ایک دہشت گرد تنظیم کے تربیتی کیمپ ہیں، جو امریکیوں کی بمباری کا ایک ”جائزہ“ نشانہ بن سکتے ہیں۔

میں نے پاشا کو اپنے منصوبے بتائے اور ہم دونوں اسلام آباد کے گرد و نواح میں البدر مجاہدین کے متعدد چھوٹے چھوٹے بد وضع دفاتر دیکھتے رہے۔ میں ہر دفتر میں اپنا بطور پرنس جرنلسٹ تعارف کراتی رہی اور ان سے تربیتی کیمپوں کے بارے میں پوچھتی تھی جس پر وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے اور مسکرا دیتے۔ پاشا مداخلت کر کے ان کی حیرت دور کرنے کی کوشش کرتا اور انہیں اردو میں بتایا کہ میں کون ہوں اور میری آمد کا مقصد کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ وہ میرا تعارف ٹھیک ہی کرانا تھا۔ ایک دفتر میں اس کی ان سے گفتگو خاصی لمبی ہو گئی۔ میں ان کی مسکراہٹوں اور ترجمانی کا مطلب بھی کچھ سمجھنے لگی تھی۔ نگاہوں کا مطلب بھی سمجھنے لگی تھی غالباً وہ ان سے یہ کہہ رہا تھا یہ ایک معمولی سی چیز ہے بالکل بے ضرر ہے اور نیک نیتی سے گھوم پھر رہی ہے۔ ایک مجاہدین آفس میں ہماری ملاقات ممتاز نامی ایک نوجوان سے ہوئی، اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے دورہ کشمیر کا انتظام کر دے گا۔

پھر ہم ایک پرنٹر کے پاس گئے کیونکہ مجھے چند بزنس کارڈز کی ضرورت تھی، میرے پاس موجود کارڈ لندن کے تھے جن پر ”ایکسپریس“ کا معروف اور معرکہ انگیز صلیبی ”لوگو“ چھپا ہوا تھا، اسے یہاں استعمال کیا جاتا تو لوگوں پر غلط اثر پڑنے کا خدشہ تھا۔ پرنٹر نے وہ کارڈ بغیر ”لوگو“ کے ری پروڈیوس کر دیا۔ میں اس نشان کو اس لئے بھی دور کرنا چاہتی تھی کہ صدر بٹ نے دہشت گردوں کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان کیا تھا، یہ ”لوگو“ مجھے اس مہم سے جوڑ کر اسلام دشمن جذبات بھڑکار رہا تھا۔ میں مسلمانوں کو مشتعل کر کے تو یہاں کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔

© - جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

جاتا ہے۔ اگر وہ کام لے سکتے تو ہم ان کے لئے عظیم اثاثہ بن سکتے تھے، میں بڑی متفکر رہی، دراصل انہیں ہمیں استعمال کرنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔ میں نے پریس کانفرنس کے مواد میں سے کچھ ”ڈیلی ایکسپریس“ کے فارن ایڈیٹر گبرائیل ملانڈ کو بھیج دیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرا رفیق کارڈیوڈ سمیت، پشاور کی طرف کھسک رہا ہے۔

اسلام آباد..... الکحل فری زون

میرا دن انہی الجھنوں میں گزرا ابھی میں ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے فون پر اپنے والدین کی مزاج پرسی کی، وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ جاس (ماں) کو جب معلوم ہوا کہ اسلام آباد ”الکحل فری زون“ ہے تو وہ میرے بارے میں کافی حد تک مطمئن ہو گئی۔ وہ شراب نوشی سے بے حد متفکر ہے۔ جب میری بہن ویو (viv) اسے بتاتی ہے کہ میں چٹا رے لے لے کر شیمپین پیتی ہوں تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اسے اسراف بے جا اور دولت کو آگ لگا دینے کے مترادف سمجھتی ہے۔ میں جب بھی گھر جاتی ہوں تو ہر کسی کو بتاتی ہوں کہ میں بیٹی فورڈ کے کلینک جا رہی ہوں۔ سگریٹ پیتی ہوں اور نہ شراب، سبزیاں استعمال کرتی ہوں اور کچھ پھل کھا لیتی ہوں، یہ ونامن سی سے بھرپور ہوتی ہیں اور صحت کی ضامن ہیں۔

اس نے پاشا کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ میری بہت اچھی دیکھ بھال کر رہا ہے، اس نے پاشا سے گفتگو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، میرے لئے یہ بات بہت پریشان کن صورت ہوتی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ جان سمپسن اور کیٹ ایڈی کا بھی ایسے پیچھا نہیں کیا جاتا ہوگا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اس ہفتے کے لئے کیا مصروفیت سوچ رکھی ہے میں نے کہا، فی الحال تو مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ اس دوران کیا کیا وقوع پذیر ہوگا اور میں اس سے کیسے نمٹوں گی؟ شاید پرسکون ہفتہ ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کہ میں اسے ویزے کے لئے تین بار افغان سفارت خانے کے چکر لگانے کی پریشانیوں سے نہ تو آگاہ کر سکتی تھی اور نہ یہ بتانے کی جرات کر سکتی تھی اور نہ ہی اپنے دوپرو جیکٹوں کا اظہار کر سکتی تھی۔

ماؤں میں چھٹی حس بھی موجود ہوتی ہے، اور میری ماں تو مانچسٹر میں چولپے پر پکتی ہوئی کو بھی کی بو کو بھی سونگھ لیتی ہے۔ اس نے مجھے کشمیر کا رخ کرنے سے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا ”اگر تو وہاں گئی تو وہ تجھے اغوا کر لیں گے اور ہم تجھے کبھی نہیں پاسکیں گے، بس اپنی پکی ڈیزی کا ہی خیال کر لینا، اس بے چاری کو ماں کی ضرورت ہے۔“ میرے اندر عجیب سا احساس پیدا ہوا، کیونکہ میں اپنی ماں سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی، اور نہ ہی کسی اور سے، چنانچہ میں نے خاموشی میں ہی خیریت سمجھی۔

جہاں تک ڈیزی کا تعلق ہے، مجھے اسے یہ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا کہ میں اسلام آباد میں ہوں، جب اسے معلوم ہوا تھا کہ میں نیویارک نہیں گئی تو وہ بہت مطمئن ہوئی تھی، اگرچہ اسے یہ معلوم کر کے حیرت ہو گئی کہ میں کہاں جا پہنچی ہوں۔ میں اسے ہر رات فون کرتی لیکن صرف اتنا بتاتی کہ میں بیڈ پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اسے کل یا اگلے دن یہ بتا ہی دینا ہوگا کیونکہ اسے جمعہ کا دن میرے ساتھ لندن میں گزارنے اور ویک اینڈ کے دوران میری ہمراہ رہنے کی توقع ہوگی۔ میری ماں اور باپ نے کہا تھا کہ وہ اسے گاڑی پر خود لے آئیں گے اور اسے دوبارہ ملاقات کے منتظر ہوں گے ڈیزی کو اپنے نانا کے ہمراہ باغ اور گرین ہاؤس کے گرد گھومنے اور اپنے کتے کے ساتھ کھیلنے سے زیادہ کسی چیز کا شوق نہیں ہے۔ میں اس کتے بلکہ ہر کتے سے نفرت کرتی ہوں۔ کیونکہ وہ گندی چیزوں کو چانتے چانتے آپ کے چہرے کو بھی اسی طرح چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ حرکت میری کتاب زندگی میں بے حد نفرت انگیز ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ڈیزی کتے کے پلے کی تلاش میں ہے، اُمید ہے کہ ذرا بڑی ہوگی تو اس شوق سے باز آ جائے گی۔

تاہم اس رات میں نے اپنے نیوز ایڈیٹر کو ایک ای میل بھیجی تا کہ وہ منگل کی صبح کو ہونے والی کانفرنس میں شرکت کرے تو اسے میرے ہفتے کے پروگرام کے بارے میں پورا علم ہو جائے، میں نے اسے یہ ای میل بھیجی تھی:

”ہیلو باس، میں البدر کے آفس میں گئی۔۔۔ یہ وہی کیمپ ہیں جن کے بارے میں انڈین انٹیلی جنس اور سی این این ٹریننگ وڈیوز میں کر کیا گیا ہے کہ ان کا تعلق افغانستان اور کشمیر کے کیمپوں سے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں گپ شپ کے لئے لاہور جاؤں، لیکن انہیں اس کی زیادہ اُمید نہیں ہے۔ دو سال کے دوران کسی مغربی جرنلسٹ کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ انہیں اجازت دینے پر رضامند کیا جاسکتا ہے۔

پھر میں حزب المجاہدین کے دفتر میں گئی، کشمیر میں انہوں نے بھی ٹریننگ کیمپ قائم کر رکھے ہیں، یہ نئے دہشت گردوں کی فہرست میں ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں اور مذاکرات کے بارے میں بھی سنجیدہ ہیں۔

ہم (پاشا اور میں) نے ایک نوجوان مجاہد سے دوستی کر لی ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ ہمیں اپنی حفاظت میں، ہموار راستوں سے وہاں پہنچا دے گا۔ اگر ہم ان دو میں سے کوئی ایک روٹ بھی اختیار کر لیں جس کے بارے میں بات

میرا یہ دن بیکار ہی گیا، چنانچہ ہم کافی پیسے چلے گئے تاکہ اس ہفتے کے پروگراموں پر غور کیا جاسکے۔ میں نے سوچا کہ اگر کشمیر کے تربیتی کیمپوں تک رسائی ممکن نہیں تو پھر واحد متبادل راستہ افغانستان جانے پر زور دینا ہے۔ ستوری بہت اچھی بن رہی تھی کیونکہ لاکھوں لوگ افغانستان جانا چاہتے تھے۔ میں نے پشاور سے پوچھا کیوں نہ چند افغان عورتوں سے ملاقاتیں کی جائیں۔ اس نے کئی فون کالیں ملائیں، پھر اس نے مجھے اپنا موبائل پکڑواتے ہوئے بتایا کہ کوئی مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ لائن پر دوسری جانب کے شخص نے کہا کہ وہ مجھے افغانستان قصبہ ”داؤرباہ“ میں پہنچا سکتا ہے۔ اس کے لئے بس 1200 ڈالر دینا پڑیں گے۔

میں غصے میں آگئی۔ ”کیا تم مجھے صرف بارڈر کے علاقے میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر پہنچانے کے 1200 ڈالر مانگ رہے ہو، کیا میرا سر پھر چکا ہے کہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکوں۔ پہنچانا ہے تو جلال آباد یا اس کے مضافات میں پہنچاؤ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو رہنے دو“ یہ کہہ کر میں نے موبائل پاشا کو واپس دے دیا۔ پاشا نے اس شخص سے کچھ مزید کہا اور اس کی آواز میں شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ ویٹر ہماری طرف دیکھ رہا تھا، اسی طرح پیچھے بیٹھا ہوا بے ضرر سا شخص جو اخبار پڑھ رہا تھا، وہ بھی متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس اجنبی کو غور سے دیکھا تو اسے جلدی جلدی کچھ لکھتے ہوئے پایا، اس پر میں گھبرا گئی۔

میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ الفاظ لکھ کر پاشا کو متوجہ کیا۔ ”آہستہ بولو، پیچھے آئی، ایس، آئی (پاکستانی اٹلی جنس) کا کارندہ کچھ نوٹ کر رہا ہے۔“ پاشا نے نظر ڈالتے ہی فون بند کر دیا، ہم اٹھ کر الگ الگ راستوں پر ہو گئے، اور پھر اس کی پرانی سیلو کار کے پاس پہنچ گئے۔ جسے اس کے مسلسل چلاتے ہوئے ایئر کنڈیشن سے بہت نقصان پہنچ چکا ہونا چاہیے تھا، مگر انجن پرانا ہونے کے باوجود کام کرتا رہا۔ اس اثنا میں، کیفے میں بیٹا ہوا آدمی جا چکا تھا اور ہم واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسلام آباد میں ہوٹلوں کے ارد گرد آئی ایس آئی کے ایجنٹ اکثر گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، جو خاص طور پر میڈیا والوں کی سرگرمیاں نوٹ کرتے ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ”بونے“ کے پیچھے کھڑا ویٹر بھی آئی ایس آئی کا رندوں میں سے تھا۔ اسے ویٹر کے کام کا اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ چمچے کا سیدھا سر اکون سا ہے، وہ پلیٹیں ادھر ادھر کرتے کرتے ”ڈیوٹی“ دے رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کسی کام کے لئے کہہ دیا جائے تو وہ شش و پنج میں پڑ جاتا تھا، کہ کیسے کروں؟

افغان سفیر رپورٹروں کے زخمی

واپس جاتے ہوئے ہمیں افغان سفارت خانے سے گزرنا تھا، وہاں محسوس ہو رہا تھا اندر کوئی پریس کانفرنس جاری ہے کیونکہ اس کے ارد گرد کی گلیوں میں ٹی وی والوں کی وینیں اور کاریں کھڑی تھیں، رپورٹروں کی بھی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو باغ میں طالبان کا سفیر اپنا تازہ بیان پڑھ کر سنار ہاتھا۔ زیادہ تر نامہ نگار گھاس پر بیٹھے تھے جبکہ غیر ہموار زمین پر تین ناگوں والے سٹول پر رکھے ہوئے کیمروں سے تصاویر بن رہی تھیں۔

سی این این کی چیف انٹرنیشنل کارپانڈنٹ کو شینا امپورمٹا عبدالسام صعیف پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی اور اتنے زور سے پوچھ رہی تھی کہ ہر کوئی جان لے کہ وہ کیا پوچھ رہی ہے، اسی طرح دوسرے بھی سوالوں کے گولے پھینک رہے تھے۔ دیانتداری کی بات یہ ہے کہ ان رپورٹروں کو کچھ ”مارکیٹنگ ایڈوائس“ یا صحافتی آداب سیکھنے کی ضرورت تھی۔ میں اوپر سے گھوم کر باغ کی دائیں طرف گئی اور جاپان کے روزنامہ یوموری شیمون کی نوپنہ میں بیورو چیف سسومو آرائی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اس سے میری صبح کو ملاقات ہوئی تھی، ہم دونوں افغانستان کے ویزا کے لئے دوڑ بھاگ کر رہی تھیں۔

عین اسی وقت ایک کمزور سا بوڑھا رپورٹر جو درخت کی ایک اُچی ٹہنی پر کسی طرح ٹکا ہوا تھا دھڑام سے اپنے ایک ساتھی کے سر کے اوپر آگرا، ہمارے ساتھ کھڑے لوگوں نے گھبرا کر اُدھر دیکھنا شروع کیا، اتنے میں ہجوم میں سے ایک گھبراہٹا ہوا رپورٹر اپنی کھوپڑی ملتا ملتا برآمد ہوا، میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور شور کیا۔ ”وہ رہی، جنگ کی پہلی کاپی!“ کچھ لوگ بے ساختہ ہنس دیئے، ایک بھاری پگڑ باندھے ہوئے دراز ریش شخص نے جو طالبان سفارت خانے کا انسر تھا، مجھے شعلہ بارنگاہوں سے دیکھا۔ غالباً یہ بے چارہ جس مزاح سے بالکل عاری تھا۔

اس پریس کانفرنس کا ایک عجیب ہی نقشہ تھا، تقریر بھی تھی، درمیان میں قرآنی آیات بھی پڑھی جا رہی تھی، الٹ پلٹ سوالات کئے جا رہے تھے، پوچھنے والوں کو اسی انداز میں جوابات مل رہے تھے، اس میں شرکت کرنے والوں کا تعلق چالیس سے کچھ زائد ملکوں سے تھا۔

مجھے پریس کانفرنس کرنے والوں کی نا تجربہ کاری پر بھی افسوس ہو رہا تھا، انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ میڈیا سے کیسے نمٹنا

چیت چل رہی ہے تو کم از کم ایک دن کے لئے اسلام آباد سے باہر جانا پڑے گا، اور اگر کامیاب ہو گئے تو دو دن لگ جائیں گے۔

پھر میں نے اسے افغانستان جانے کے بارے میں پروگرام بتاتے ہوئے کہا کہ:
 ’اگر حالات سازگار رہے، ہر چیز حسب توقع وار ہوئی تو ہم دونوں آپشنز سے کام لیں گے، لیکن یہ تو پاکستان ہے ناں۔ یہاں ’فورا‘ یا ’جتنی تاریخ‘ کے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ سیدھے طریقے سے کام کرانے کی کوشش ایسے ہی ہے جیسے بچہ گاڑی کو دلدل میں سے گزارا جائے۔

میں دونوں میں سے کسی بھی ایک راستے کو اختیار کر لوں گی لیکن آپ کی رہنمائی میں کروں گی۔ ڈیوڈ سمیت تادم تحریر پشاور میں ہے آج میں نے ’ڈیلی‘ کے لئے طالبان کانفرنس میں سے تقریباً آٹھ پیرا گراف فائل کئے ہیں۔ یہ کام رضا کارانہ طور پر کیا ہے تاکہ ان سے ہمارے تعلقات خوشگوار رہیں۔ کیونکہ ہم ’سندھ‘ والے ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہنے والے لوگ ہیں۔ افغان ویزا کے بارے میں میں سردست کوئی خبر نہیں، اس کے لئے ان کے پاس 500 سے زائد درخواستیں پڑی ہیں۔ میں نے ایک عورت کے بارے میں سنا ہے کہ جس نے اتوار کے روز کے اخبار میں صفحہ مراسلات میں میری رپورٹ پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگر اس کی بات اتنی ہی صحیح ہے تو یہاں لوگ مظاہرے کیوں کر رہے ہیں اور کولیوں کا نشانہ کیوں بن رہے ہیں پھٹنال کہیں کی۔“

میرا آخری پیرا گراف اس عورت کے حوالے سے تھا جو حال ہی میں پاکستان گئی تھی اور اس نے اخبار کے صفحہ مراسلات میں اپنا ایک خط چھپوایا، اس کا کہنا تھا کہ یہاں طالبان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔ ان کی تحریک سے ہر کوئی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ صحافی خبط عظمت میں مبتلا ہوتے ہیں، یہ بہت ہی حساس روحیں ہوتی ہیں جن کی انا بھی بے حد پھونک (fragile) ہوتی ہے، اگر آپ ان کا دماغ درست کرنا چاہیں، تو ان کے اخبار کو فوراً مر اسلہ لکھ کر اصل صورت حال واضح کر دیں۔

گھونٹ پی لوں۔“ وہ میری ہم ذوق اور ہمزاز ہے۔ میں اپنی پریشانیاں اسے نہ بتاتی تو کسے بتاتی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں ہوٹل میں گرجوش مردوں کا قحط پڑا ہوا ہے، آخر میں نے تنگ آ کر ”روم سروس عارضہ“ اور ٹیمپن ٹرک استعمال کرنے سے بھی نجات پالی ہے۔ اس نے مجھے اس پرداددی اور کہا، اچھا، اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔

کوئی تیس سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ فون پھر بجا، اس بار یہ ڈپٹی پولیٹیکل ایڈیٹر ٹم شپمین تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی پارٹی میں سے ہی بول رہا تھا۔ پولیٹیکل لوگوں کو خبریں ہی اکٹھی کرنا ہوتی ہیں، خواہ وہ جہاں بھی ہوں۔ میں نے ہیلو وغیرہ کے بعد اسے بتایا کہ ”میں ابھی ابھی تمہاری باس سے گفتگو کر رہی تھی۔ وہ کسی کمبخت دعوت ناؤ نوش میں مشغول ہے اور میں ایسے ملک میں پھنسی ہوئی ہوں جہاں الکحل ممنوع ہے، زندگی پھکی بلکہ بدمزہ ہو چکی ہے۔“ ٹم شپمین، جسے ساتھی خیر کہہ کر پکارتے ہیں، بات کاٹتے ہوئے بولا، ”میں بھی اسی پارٹی میں ہوں جس میں JHB شریک ہے۔ اس نے مجھے تم سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا ہے۔ تم بالکل پاگل عورت ہو مگر مجھے اچھی لگتی ہو، جس سنوری پر کام کر رہی ہے خدا کرے کہ وہ اچھی رہے۔“

چند لمحے بالکل خاموشی رہی، پتہ نہیں وہ کیا کہتے کہتے رہ گیا پھر فون بند ہو گیا۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا ہم بالکل الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں، میں یہاں ہونے کی وجہ سے لیبر پارٹی کی سلاٹ کانفرنس میں شرکت سے محروم ہو گئی۔ بالکل کانفرنس سے تو نہیں البتہ اس سے متعلقہ سرگرمیوں اور تیاریوں کے کاموں میں حصہ لینے سے محروم ہو گئی ہوں جن میں ہم مزاج اور ہم ذوق لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور جاموں کے جام لندھاٹے جاتے ہیں۔ ایسی تقریبات ایک قسم کا جشن مے نوشی ہوتا ہے۔

سوچا، چلو یو این کلب چلتے ہیں، نہیں نہیں، میرے ذہن میں کئی خیال آتے رہے۔ ہر نیا خیال پہلے خیال کو مسٹر دکر دیتا تھا۔ افغانستان جانے کا خیال ابھر تو اس کا پلڑا سب سے بھاری نکلا، چنانچہ میں بیٹھ گئی اور چند نوٹس لکھے۔ میں نے ایک صحافی ساتھی، ”اسٹھر آکسفورڈ“ کو فون کرنے کا سوچا جس نے اسلام آباد میں آ کر افغانستان پر ایک کتاب لکھی تھی۔ چند روز قبل یہاں کی ایک سرکاری عمارت میں اس سے میری اچانک ملاقات ہوئی اور پھر ہم نے اکٹھے ڈنر کھایا تھا اس طرح ایک پرانی واقف کار سے ملاقات کر کے مجھے بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔

تاہم میرا دماغ پروگراموں کی ایک پٹاری بنا ہوا تھا، چنانچہ میں نے اسے کال کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے میری توجہ بٹ جاتی۔ میں اپنی چھوٹی سی فرنیچر کی طرف گئی اور کشید کئے ہوئے پانی کی بوتل نکال لائی۔ مجھے اپنے اوپر بہت ہنسی آتی۔ میں نے کبھی ایسے دن کا تصور تک نہ کیا تھا کہ میں کبھی ایسی منی بار میں جاؤں گی جس میں سے ٹھنڈے تھ پانی کی ایک بوتل نکال لایا کروں گی۔ چہ جائیکہ ایسی صبح دیکھوں کہ شراب کے نشے کے نتیجے میں ہونے والی اعصاب شکنی پر قابو پانے کی کوشش کرنا پڑتی۔ میرا ذہن پھر افغانستان میں آوارہ گردی کرنے لگا کہ میں درحقیقت کتنا بڑا خطرہ مول لینے جا رہی تھی۔ میں نے سب امکانات کا موازنہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔ پھر میں نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ میری پوزیشن میں اگر دوسرے لوگ ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ میں نے اپنی ایک جنگی نامہ نگار دوست ”میری کولوین“ (Marie Colvin) کے بارے میں سوچا جو دنیا کے ہر خطے کے صحافیوں کے لئے ایک قابل تھلید نمونہ ہے، اگر وہ میری جگہ ہوتی تو یہی کرتی جو میں کرنے والی تھی۔ وہ بے حد جرات مند اور باصلاحیت ہے، علاوہ ازیں وہ لکھنے کی بھی بے پناہ اہلیت رکھتی ہے اس لئے اسے بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

میری کولوین سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوتی جب ہم دونوں ”سندھ نامتھر“ میں کام کرتی تھیں۔ ہمارے گپ شپ اس وقت ہوتی تھی جب وہ تھوڑی سی دیر کے لئے فورٹریس دیپنگ میں آتی تھی۔ یہ جگہ ”دی نیو آف دی ورلڈ“ ”دی سن“ اور ”دی نامتھر“ کا بھی مستقل مسکن ہے۔ (یہ چاروں اخبارات انٹرنیشنل نیوز پیپر میگیٹ، رپورٹ مردوک کی ملکیت ہیں) ورنہ وہ ایسے مضامین لکھ رہی ہوتی جو دنیا بھر کے جنگ زدہ خطوں میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، اس نے حال ہی میں کہا ہے اور بالکل ٹھیک کہا ہے کہ جنگی رپورٹ کبھی بے روزگاری کا شکار نہیں ہوتا۔

اپریل 2001ء میں اس کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپیں، جب وہ سری لنکا میں سرکاری فوجوں اور تامل ٹائیگرز کے چھاپہ ماروں کے درمیان چھڑپوں میں پھنس کر شدید زخمی ہو گئی تھی۔ حکومت کا کہنا تھا کہ تامل باغیوں نے اس پر اس وقت گولی چلائی جب وہ ”واپو نیوا“ میں ان کے زیر قبضہ ایریا سے نکل کر ہر امن ایریا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ تاملوں کا موقف اس سے برعکس اور بالکل صحیح تھا۔ اس کے سر، چھاتی اور بازوؤں میں چھروں کے چار زخم تھے۔ تاہم ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے زخم جان لیوا نہیں تھے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس واقعہ سے اس کی بائیں آنکھ کی بینائی زائل ہو گئی ہے۔

میری ای میل میں مزید الفاظ یہ تھے:

”لندن میں میرے ذریعہ اطلاع کے مطابق جب تک پوپ چلا نہیں جاتا اور جیل سٹرا (برٹش فارن سیکرٹری) واپس نہیں آ جاتا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جمعہ کو غالباً کاروائی نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مسلمانوں کا ایک مقدس دن ہے، اس سے مسلمانوں کے رد عمل کی شدت مزید بڑھ جائے گی اور انہیں یہ کہنے کی شہہ ملے گی کہ بش صلیبی جنگ چھیڑ رہا ہے۔ سب کو آداب اور پیغام محبت: یو آنے رڈ لے۔“

پوپ جان پال کی دعائیں

ای میل بھیجنے سے پہلے میں سی این این دیکھ رہی تھی اور میں نے تازقستان میں پوپ جان پال کی تصاویر دیکھی تھیں۔ اس نے دورے کے لئے ان علاقوں کا انتخاب کیا تھا جو اب ممکنہ طور پر جنگ کی زد میں آنے والے تھے، اس نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو باہمی امن کی فضا میں رہنے کی تلقین کی اور سلامتی کی دعا کی تھی۔ اس 81 سالہ بزرگ نے کہا تھا ”میں خداوند تعالیٰ سے دلی طور پر دعا کرتا ہوں کہ دنیا میں امن و آشتی رہے۔ جو کچھ ہو چکا، ہمیں اسے گہری مناقشت کی طرف نہیں لے جانا چاہیے اور مذہب کو ہرگز امتیاز رکھا عث نہیں بنایا جانا چاہیے۔“ یہ ایک نہایت دانشمند شخص کے دانشمندانہ الفاظ تھے لیکن مجھے محسوس ہوا کہ نہ وائیٹ ہاؤس ان کی پرواہ کرے گا اور نہ ہی ڈاؤننگ سٹریٹ ان پر کان دھرے گی۔ تاہم ”آستانا“ میں سنٹرل مدد آف ہوم لینڈ سکور میں منعقد ہونے والی اس رسم عشاء ربانی (ماس) میں پچاس ہزار کا ہجوم، ان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر جھوم رہا تھا۔

یہ دنیا کی ایک عظیم مذہبی شخصیت کی تازقستان میں آمد اور پیغام امن دینے کا منظر انوکھا اور ورائے حقیقت خصوصیات کا حامل تھا۔ تقریب ایسے مقام پر منعقد ہو رہی تھی جہاں یورپ ایشیا سے بغلگیر ہوتا ہے اور اسلام عیسائیت سے آتا ہے۔ تازقستان اس افغانستان کا پڑوسی ہے جو سامہ بن لادن کا گھر بنا ہوا ہے۔ ایک طرف پوپ دعائے امن کے لئے ہاتھ اٹھا رہا تھا اور دوسری جانب مغربی فوجیں یلغار کے لئے تیاریاں کر رہی تھیں۔

میں نے بعد میں جب جم سے رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے ایڈیٹوریل کانفرنس میرے منصوبوں کا ذکر کیا تو بعض لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے کھلے رہ گئے اور بعض لوگ گم صم ہو گئے۔ میں نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا، ”یا تو انہیں ان میں سے کسی ایک منصوبے کی منظوری دینا ہوگی یا میں یونہی ادھر ادھر گھومتی رہوں گی، اور اس وقت تک کچھ نہیں کروں گی جب تک بمباری شروع نہ ہو جائے اور اس کی نوبت ہفتے دس دن کے بعد ہی آئے گی۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ آپ میرے اس کام پر خوش ہیں، میں خوش نہیں ہوں۔ میں یہاں مزے سے بیٹھی انگوٹھے گھماتی رہوں گی جو کہ ایک پرانے قسم کا کھیل ہے، اگرچہ مجھے یو این کلب کی طرف سے کھلی دعوت ملی ہوئی ہے، ان کے ہاں الکحل کی فراوانی ہے اور دوسرے سامان عیش و طرب کی بھی کوئی کمی نہیں۔ اچھی طرح سوچ لیجئے۔ آج تو ابھی منگل ہے، اگر میں اندر جا سکی تو یہاں سے کل رات روانہ ہوں جاؤں گی جبکہ تفصیلات کو کل صبح حتمی شکل دیدی جائے گی۔“ اس کے بعد وہ ایڈیٹرناؤ سنڈ سے مزید گپ شپ کے لئے چلا گیا۔ میں نے دعا کی کہ کہیں وہ پیچھے سے میری رسی نہ کھینچ لے۔

میں اس رات یو این کلب جا کر کوئی تندوتیز الکحل مشروب پینا چاہتی تھی لیکن کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں کیا کرنے والی ہوں اور میری سنوری کی قدر و قیمت کیا ہوگی؟ صاف ظاہر ہے کہ اس میں خطرے کا عنصر موجود تھا لیکن آپ جو کچھ بھی کریں اس میں کسی نہ کسی حد تک خطرہ تو ہوتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے خطرہ ہوتا ہے، ٹیکسی لینے میں بھی خطرہ ہوتا ہے اور 11 ستمبر کو بے شمار لوگ اس سے دوچار ہو گئے تھے، جبکہ نارل زندگی گزارنے کی کوشش بھی خالی از خطر نہیں ہوتی۔ کیا کسی سنوری کے لئے خطرہ اس لئے نہ مول لیا جائے کہ آپ، اپنے ساتھ بیتی ہوئی کہانی سنانے کے لئے موجود ہی نہیں ہوں گے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وہ میری بہترین دوستوں میں سے ایک تھی ”جولیا ہارٹلے بریور“ (Julia Hartley Brewer) جسے ہم پیارے JHB کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔ یہ بے حد ملنسار اور ہمدرد و غمگسار روح کی مالک ہے اور ”سنڈے ایکسپریس“ میں پولیٹیکل ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہے، وہ مجھے اس وقت فون پر بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت ایک بڑی شخصیت اور کوئی زیادہ بڑی بھی نہیں، کے ساتھ بورنماؤتھ کے ہائرکلف ہوٹل میں بیٹھی، میری پسندیدہ شراب شیمپین کی چسکیاں لے رہی ہے اور وہ اس ہوٹل میں عورتوں کی آزادیوں کے لئے ہونے والے مظاہروں کے سلسلے میں منعقد کانفرنس کی کوریج کے لئے آئی ہوئی ہے۔

وہ بولی۔۔۔ ”اوعیاش عورت! میں جانتی ہوں کہ تو کیا کرتی پھر رہی ہے، مجھے تیرے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ تو جہاں سے وہاں اچھی شراب منقود ہے، چنانچہ میں نے سوچا چلو تمہاری جگہ میں ہی چند

سرلنکا کے حکام نے بعد میں بتایا کہ میری کولون کے پاس حکومت کی طرف سے جاری کردہ شناخت نامہ موجود تھا لیکن اس نے باغیوں کے زیر قبضہ علاقے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں لی تھی۔ تاہم مجھے طالبان کے سفارت خانے میں جا کر یہ بات معلوم ہو گئی کہ نامہ نگار حالت جنگ میں بارڈر پار کرتے وقت شاذ و نادر ہی اجازت نامے لیتے ہیں۔

بعد ازاں میری نے اپنے دورے کا مقصد یہ بتایا: ”میں نے علاقہ وانی کے دیہات کا سفر کرتے ہوئے زیر دست انسانی بحران پایا، اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی اور نہ ہی اخبارات میں اس بارے میں کچھ چھپ سکا تھا، لوگ فاقوں میں رہ رہے تھے۔ بین الاقوامی ایجنسیوں کو خوراک تقسیم کرنے سے روک دیا گیا، نہ دوائیں تھیں نہ گاڑیوں، واٹر پیپوں یا روشنی کے لئے ایندھن اور نہ زخمیوں کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام تھا۔

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر میری نے تفتیشی رپورٹنگ نہ کی ہوتی تو دنیا تالموں کی حالت زار کے بارے میں مکمل طور پر بے خبر رہتی، یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ایک طرف لوگ اس کی بہادری پر داد دے رہے تھے۔ یہ آج کی صحافت کا ایک افسوسناک رویہ ہے لیکن ایسا کہنے والے میڈیا کا ایک کینہ پرور اور محروم ذوق طبقہ ہیں جو جرأت مند صحافیوں پر صرف پتھر اؤ کرنا ہی جانتے ہیں۔

یہ باصلاحیت پیشہ ور خواتین مجھے ہمیشہ جوش و جذبہ اعتماد کی دولت سے سرشار کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے میری بچی کو جنم دینے کے فیصلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈیزی کا وجود غالباً میری زندگی کا بہترین کارنامہ ہے، میں اس پر بجا طور پر فخر کرتی ہوں۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ حمل قرار پانے پر مجھے کتنا صدمہ پہنچا تھا۔ یہ ناقص کنڈوم کا نتیجہ تھا، میرا پہلا فیصلہ ”ابارشن“ (اسقاط) کرالینے کا تھا۔

میں نے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیا اور بعد میں ایک سپیشلسٹ سے ملی اور دونوں کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا کہ میں بچے کو جنم دینے پر موت کو گلے لگانے کو ترجیح دوں گی۔ مجھے یاد ہے کہ سپیشلسٹ نے مجھے کہا کہ میں اس وقت 33 برس کی ہو چکی ہوں، میرا جسمانی کلاک مجھے متنبہ کر رہا ہے کہ اب کے بچے کو نہ جنم دیا گیا تو شاید آئندہ کبھی حمل قرار نہیں پائے گا۔

میں نے کہا ”اچھا ٹھیک ہے میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں، اگلے پیر کو اوں گی۔“ یہ کہہ کر میں اس کے آفس سے نکل آئی۔ اس ”ویک اینڈ“ پر مجھے تھامس ریجنل نیوز پیپر (TRN) ٹریننگ کورس کے لئے بھیج دیا گیا، جو انتظامی عہدوں پر فائز عورتوں کی پیشہ ورانہ قابلیت بڑھانے کے سلسلے میں تھا۔ اس وقت میں ”سڈے سن“ میں اسٹنٹ ایڈیٹر تھی اور ابتداءً اس کورس میں شرکت کرنے والی ”TRN“ کی پہلی خاتون نیوز ایڈیٹر تھی۔ اس میں ہر قسم کی شرکاء موجود تھیں ان کے ساتھ کام کرنا فی الواقعہ ایک ولولہ انگیز تجربہ تھا۔ میں ذہین عورتوں کے ساتھ میل جول کو ویسے بھی پسند کرتی ہوں، یہ تو ہر لحاظ سے میرے لئے پسندیدہ ترین شخصیات تھیں۔

جب میں نے ان میں سے ہر ایک سے فرداً فرداً گفتگو کی تو مجھے احساس ہونا شروع ہو گیا کہ ماں بن جانے سے پیشہ ورانہ زندگی میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ ایک اور سینئر خاتون جس سے میں نے بات کی ”سنگل“ یعنی بغیر شوہر کے تھی لیکن اس کے ساتھ اس کے ضعیف ماں رہتی تھی جو ذہنی طور پر معذور تھی اور اس کا مرض ”Alzheimers“ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ بات اس کے لئے تقریباً ایک معمول بن چکی ہے کہ اسے نیوز روم میں سے بلا لیا جاتا تھا، کیونکہ اس کی ماں، سوتے وقت پہنے جانے والے کپڑوں میں باہر نکل کر پارک میں گھومتی ہوئی پائی جاتی تھی۔

بعد ازاں میں دارالحکومت کے باہر کونسلر آفسز میں گئی اور اپنا تعارف کرایا۔ میں نے ان کے میڈیا کے سربراہ کو بتایا کہ میں برطانوی جرنلسٹ یو آنے رڈ لیہوں اور ایک برطانوی اخبار "سٹنڈے سن" کے لئے کام کر رہی ہوں، میں آپ سے "ایان ڈیولین" کے متعلق آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے اگلے روز آنے کا کہہ دیا۔

پھر میں چیک پوائنٹ پر چلی گئی اور بڑی آسانی سے گرین لائن عبور کر کے ٹرکس سیکٹر میں داخل ہو گئی۔ میں نے اپنا تعارف بطور جرنلسٹ نہیں کرایا کیونکہ اس سے لوگ خواہ مخواہ چونک جاتے ہیں، چنانچہ میں نے اپنا پیشہ میسر سٹانلسٹ لکھوا دیا۔

کریینا میں پہنچ کر میں "گرمزبی" کے انہی دو تجارت پیشہ افراد سے ملی، جنہوں نے مجھے آنے کی دعوت دی تھی۔ ہم نے نہایت خوشگوار شام گزاری شراب کی چسکیاں لیتے اور گپ لگاتے رہے بعد میں انتہائی لذیذ کباب بھی کھائے پھر میں نہلتی ہوئی ایک قریبی ٹورسٹ آفس جا پہنچی اور وہاں موجود لڑکیوں میں سے ایک سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں ایک برطانوی صحافی ہوں تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، اس نے فوراً ٹیلی فون اٹھایا اور کسی سے بات کی اور میرے طرف مڑ کر پوچھا "کیا آپ ہمارے مسٹر آٹورازم سے ملنا پسند کریں گی؟ وہ آپ سے جمعات کو ملاقات کریں گے، ہم آپ کے لئے بارڈر پر کاربھیجیں گے۔"

مجھے بات بہت پسند آئی۔ چنانچہ میں نے کہا میں ضرور آؤں گی۔

گلے روز میں "ایان ڈیولین" سے ملنے گئی اور بعد ازاں دو گفتوں میں سے باقی ماندہ عرصے میں تقریباً ہر روز ہی اس سے ملاقات کرتی رہی۔ میں اپنی سکاپی اور اکروتری میں برطانیہ کے خود مختار اڈوں (BASES) پر بھی فوج میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتی رہی جن سے میں سیرینوریل آرمی (T.A) کے ذریعے ملی تھی۔

یہاں آنے سے کافی دن پہلے میں تنظیم آزادی فلسطین (PLO) کے دفاتر میں اپنے رابطہ کار سے دوبارہ ملنے گئی تھی۔ اس نے مجھے لٹچ پر مدعو کیا تھا، جس کے بعد ہم ٹروڈون ماؤنٹین گئے اور ایک جزیرے کی مشہور شراب "منیرئیر" نوش کی۔

بعد ازاں اس نے راستے میں کار روک لی اور ہم چہل قدمی کے لئے جنگل میں چلے گئے۔ میں نہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میں کچھ گھبراہٹ تھی خاص طور پر اس وقت ڈر لگا جب زمین پر بکھرے ہوئے خالی کار تو سوں پر نظر پڑی۔ ہم فلسطین کی صورت حال پر باتیں کرتے جا رہے تھے۔ لیکن میں ساتھ ساتھ ادھر ادھر کوئی بڑا سا ڈنڈا بھی تلاش کر رہی تھی تاکہ اگر یہ میرے قریب آجائے تو میں اس کا سر پھونک سکوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے یرغمال بنا لیا جائے اور بوری میں بند کر کے بیروت بھیج دیا جائے تاکہ میں ٹیری ویت (Terry waite) کے ساتھ جاملوں۔

جاسوس ہونے کا شہ

تاہم ایسی نوبت نہ آئی اور ہم چلتے ہوئے کار کے پاس آگئے لیکن مجھے اس وقت پتہ چل گیا کہ اس کا میڈیا سے یا تو بالکل کوئی تعلق نہیں اور اگر ہے تو بس واجبی سا۔ وہ دراصل اعلیٰ جنس افسر تھا۔ اس نے میرے بارے میں ایک رپورٹ فائل کی جس میں اس نے کہا کہ "میں کسی قسم کی جاسوس ہوں اور غالباً موساد سے روابط رکھتی ہوں۔" میں یہ بات ضرور کہوں گی کہ یہ رپورٹ بڑی حد تک قابل قبول معلوم ہوتی تھی۔ جس کی بنیاد پر PLO نے میرے واپس آتے ہی میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اس میں ان پر یہ انکشاف کیا گیا تھا:

"یو آنے رڈ لے اس ملکی میں یو آنے این میکفوش کے نام سے داخل ہوئی اور ایک پارٹمنٹ بلاک میں ایک اور نام سے، دومردوں کے ہمراہ داخل ہوئی۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے ٹرکس سیکٹر میں آنے جانے کی کافی آسانی حاصل ہے۔ اسے یہاں آنے کے چار دن بعد ایک سرکاری لیموزین لینے آئی، جسے ایک شو فر چار ہا تھا۔ اس طرح وہ دوسری بار ٹرکس سیکٹر میں داخل ہوئی۔ وہ برطانیہ کے خود مختار اڈوں میں آنے جانے کے لئے سرکاری آئی ڈی استعمال کرتی ہے۔ لندن میں "دی سن" کے نیوز روم سے پتہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہاں کام نہیں کرتی۔ اس کا لب و لہجہ غیر ملکی ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں عورتوں کا روایتی ڈر خوف نام کو بھی نہیں اسے دور دراز کے جنگلات میں طویل چہل قدمی کے لئے لے جایا گیا تو وہ بلا تھک چل پڑی اور انتہائی اطمینان سے نہلتی رہی۔"

میں اس رپورٹ میں مذکور ہر نقطے کی وضاحت کر کے انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔ میرے دورے کے کوئی مجرمانہ یا مفسدانہ مقاصد نہیں تھے۔ مجھے یہ بات بہت مضحکہ خیز لگی کہ ان کے خیال میں ہر کوئی "مجسٹی" کی طرح کونینز انگلش پر قدرت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ انہیں اس سے پہلے دریا ئے نائن کی وادی میں رہنے والوں لب و لہجہ سننے کا اتفاق نہیں ہوا اور مجھ پر اسرائیلی ہونے کا گمان کر بیٹھے۔

یہ فائل کرنل داؤد زارورہ کے حوالے کی گئی جو تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کی اعلیٰ جنس کا سربراہ تھا۔ اس نے

ایک اور خاتون مارین سمپسن جو اب ڈین "ٹی آر این" پیپرز سے تعلق رکھتی تھی، اس کے تیرہ تیرہ سال کے دو جڑواں بچے تھے اور وہ حال ہی میں طلاق کے مقدمے سے فارغ ہوئی تھی، میں سب سے زیادہ ہیلن مارش سے متاثر ہوئی جو "یونگ نیوز" میں ایک اسٹنٹ ایڈیٹر تھی۔ اس کی شادی فلیٹ سٹریٹ کے ایک صحافی سے ہوئی تھی، لیکن بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کی شوہر سے علیحدگی ہو گئی۔ کیونکہ اس پر انکشاف ہوا کہ اس کا شوہر تقریباً ایک سال سے ایک اور عورت سے ناجائزہ تعلقات استوار کئے ہوئے ہے۔ اس نے اپنا گھر فوراً فروخت کر دیا اور 700 پاؤنڈ ساتھ لے کر اپنی ماں کے پاس، گلاسگو میں چلی آئی۔ یہاں ہیلن نے نئے سرے سے زندگی شروع کی، جاب تلاش کر کے، ایک مکان حاصل کیا اور بچے کی نگہداشت کے لئے ایک خادمہ کا انتظام کر لیا۔ تاکہ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ میں اس کی سٹوری سے بہت متاثر ہوئی جو اس نے نہایت حقیقت پسندانہ طریقے سے سنائی۔

اتوار کی رات، میں نے گھر سے نیوکیسل جاتے ہوئے، گزشتہ دو دنوں کے واقعات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا "لعنت بھیجو مشکلات پر، میں خواہ دنیا کی عظیم ترین ماں کہلا سکوں یا نہ، مگر میں ایک بچے کی ماں ضرور بنوں گی۔" میں نے اس شام سپیشلسٹ کو اس کے گھر کے نمبر پر فون کیا اور اسے اپنے فیصلے سے مطلع کیا، جس پر اس نے جواب دیا۔ "مس رڈلے مجھے اس پر بے پناہ خوشی ہوئی ہے، میری دلی تمنا ہے کہ مجھے ایسی کئی کالیں موصول ہوا کریں، مجھے یقین ہے کہ آپ اس فیصلے پر بھی پشیمان نہیں ہوں گی۔ یہ بے حد مناسب اور درست سوچ ہے" اور واقعی اس نے درست کہا تھا۔

فلیٹ میں میرے ساتھ رہنے والی کیرول وائنس مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ بغلیگر ہوئی۔ اس نے بھی مبارکباد دیتے ہوئے کہا "تمہیں اس پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوگا۔"

پھر میں نے داؤد کو فون کیا تاکہ اسے اپنے فیصلے سے مطلع کر کے ذہنی کوفت سے نجات دلاؤں جو میری چند روز پہلے کی باتوں سے اسے ہوئی تھی۔ میں نے اسے اسقاط کے فیصلے سے مطلع کیا تھا، اس پر وہ بے حد مغموم ہوا، میں نے اپنے ذہن میں حمل کا مسئلہ حل ہونے تک اس سے تعلقات نہ رکھنے کے بارے میں طے کر لیا تھا۔ اس سے پریشان ہو کر اس نے قبرص میں تنظیم آزادی فلسطین کی کونسل سے تبادلہ کرا کر تنظیم کے عراقی یا لیبائی سفارت خانے میں تعیناتی کی درخواست دیدی تھی۔ میرے خیال میں وہاں اس کا مرتبہ "فرینچ فارن لچن" کے مساوی ہونا چاہیے تھا۔

ڈیری کا "باب" کون تھا؟

داؤد سے میری پہلی ملاقات 1991ء کے موسم گرما میں نکوشیا میں ہوئی تھی جہاں میں ساؤتھ شیلڈز کے ایک کارپنٹر "ایان ڈیولین" سے ملنے گئی تھی جو وہاں جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا، اس کے ہمراہ تنظیم آزادی فلسطین کے دو "دہشت گرد" بھی یہی سزا کاٹ رہے تھے، یہ تینوں 1980ء کے عشرے میں "لارناک" کے محاصرے کے سلسلے میں پکڑے گئے تھے جس میں ایک یاٹ میں سوار موساد کے تین ایجنٹ بھی ہلاک ہو گئے تھے۔

میری داؤد سے کم و بیش تین سال سے خط و کتابت چل رہی تھی، اور وہ بالآخر اس بات پر رضامند ہو گیا تھا کہ میں اس سے ملاقات کر سکتی ہوں چنانچہ میں نے دو ہفتے کی چھٹی لی اور بذریعہ طیارہ اس کے پاس جا پہنچی۔ میں "سندے سن" کے لئے کام کر رہی تھی جس کے پاس بجٹ بہت کم تھا اس لئے سفر کے آدھے اخراجات میں نے برداشت کئے اگرچہ میں نے جم سے طلاق لینے کی کارروائی شروع کر رکھی تھی لیکن میری پاسپورٹ پر اس کا خاندانی نام میکفوش ابھی چل رہا تھا جبکہ کریڈٹ کارڈز "رڈلے" کے نام سے تھے میں نے جنوب مغربی قبرص میں پافورس میں ایک پارٹمنٹ لے رکھا تھا جو ایک اور نام سے تھا۔

میں قبرص پہنچی تو میں نے ایک کارکرائے پر لی جو آخری گاڑی تھی، اس پر میرے پیچھے کھڑے دو انگریزوں کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اب ان کے لئے سفر مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں اپنے ساتھ بٹھالیا۔ جب ہم "پافوس" میں پہنچے تو ہم آپس میں گھرے دوست بن چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ وہ شمالی مشرقی لنکن شائر میں "گرمزبی" میں رہتے ہیں اور مچھلی کی تجارت کرتے ہیں یہاں ان کا شمالی سیکٹر میں کوئی کاروباری تعلق ہے۔

میں نے انہیں رات کو اپنے پارٹمنٹ میں قیام کی پیشکش کی جو انہوں نے انتہائی تشکر کے ساتھ قبول کر لی۔ یہ پارٹمنٹ خاص اہم تھا، اس میں معقول سائز کے تین بیڈروم تھے۔ اگلی صبح ہم اکٹھے نکوشیا تک کار میں گئے وہاں اتر کر وہ چلے گئے۔ انہوں نے مجھے ٹکس سیکٹر میں اپنے پاس مدعو کیا، تو میں نے کہا کہ میں انہیں سہ پہر کے وقت قصبہ کیرینیا میں ملوں گی۔ پھر میں سنٹرل جیل کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں اگلے روز ملاقات کے لئے فارم وغیرہ پُر کئے۔

خالد کوفون کیا کہ وہ مجھ سے اس کی ملاقات کا بندوبست کرے۔ یہ ملاقات بڑی غارتگر ثابت ہوئی۔ جونہی میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑیں تو میں اس پر مرثیٰ۔ یہ ملاقات برقی اثرات رکھتی تھی، میں مسحور ہو کر رہ گئی، اور میں اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ ”پی ایل او“ کی اعلیٰ جنس سیکشن کا آدھا عملہ اوور نائٹ لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون ہوں اور کیا کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے اپنے باقی ماندہ چند دن ایان ڈیولین سے ملاقاتیں کرنے میں گزارے اور راتیں داؤد کی نذر رکھیں۔ جس کے بارے میں، میں کہتی ہوں کہ یہ بے حد شریف النفس شخص ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک سرمایہ کار (inventor) ہے۔ اس کی بات پر شک کرنا خود پر شک کرنے کے مترادف تھا۔ مجھے اس وقت قطعاً معلوم نہیں تھا کہ میں جنوینی لبنان کے ”فتح لینڈ“ کے سابق کمانڈر اور انسانی نوری شخصیت ابو حکیم کے روبرو بیٹھی ہوں جسے آج بھی بہت سے فلسطینی احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ فتح لینڈ 1970 سے 1978ء تک یا سرعرات کی الفتح پارٹی کے زیر کنٹرول رہا۔

جب میں نیوکیسل میں واپس آئی تو میرے پاس دھماکہ خیز قسم کی سٹوری تھی جسے نئے ڈپٹی ایڈیٹر ٹونی فراسٹ نے چنگھاڑتی ہوئی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور ٹیلی ویژن پر بھی دکھا دیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جس پر مجھے سب رفقاء کار کی طرف سے مبارکبادیں ملیں۔ ہم اپنے دفتر سے ملحقہ بار ”پرنٹر ز پائی“ میں گئے اور خوب پی کر، اظہار مسرت کیا۔

داؤد اور میں آپس میں رابطے میں رہے اور وہ چند ماہ بعد نیوکیسل کے علاقہ ”لیزر ڈیسس“ میں میرے گھر آیا اور میں نے اس کا اپنے ایک نہایت قریبی دوست مارٹن شیپٹن سے تعارف کرایا جو ”ناردرن ایکو“ میں تفتیشی رپورٹر تھا، ان کے مابین بھی کچی دوستی کا آغاز ہو گیا۔ تقریباً یہی دن تھے کہ داؤد نے یہ دھماکہ خیز انکشاف کیا کہ وہ دراصل کون ہے اور وہ کیا کام کرتا ہے۔ اس وقت تک میں ٹیریوریل آرمی میں کیپٹن کے عہدے پر پہنچ چکی تھی، اس طرح مفادات کا تصادم ایک قدرتی امر تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے اعلیٰ انسروں کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ہمارے ”باہمی تعلقات“ کیا گل کھلاتے ہیں؟

نئے سال کی آمد پر میں حاملہ ہو چکی تھی اور ماہ اپریل میں فوجی مشقوں کے لئے قبرص چلی گئی۔ میں ٹی اے رجمنٹ میں ”لوکل بوائے“ سٹوریز کر رہی تھیں۔ یہ رجمنٹ چھ ماہ کے لئے فاک لینڈ زجا رہی تھی تاکہ مقامی انفنٹری کمپنی کی مدد کر سکے۔ یہ سٹوری بے حد اہم تھی کیونکہ ٹی اے رجمنٹ کے سپاہیوں کو پہلی بار فل نائٹ پوزیشن کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔

چونکہ میں اپنی انچارج آپ تھی اس لئے میں جب چاہتی ہوں سے باہر چلی جاتی اور نکوشیا کے مضافات میں داؤد کے فلیٹ میں جا پہنچتی اور مجھے کسی کورپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ایک رات کیا ہوا کہ میں اس کے لاؤنج میں فل برٹش آرمی کٹ سمیت محو استراحت تھی کہ خالد اپنے باس سے ملنے آدھمکا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ مجھے ریمبو جیسے لباس میں ملبوس وہاں مینی پا کر اس پر کیا ہتی ہوگی۔

بعد ازاں اس نے یہ بات داؤد کی پہلی بیوی کو بتادی جو ایک لبنانی عورت تھی اور ”پی ایل او“ کے ساتھ گہرے رابطے رکھتی تھی۔ میرے خیال میں اس نے یہ واقعہ یا سرعرات کورپورٹ کر دیا اور بتادیا کہ داؤد دوساد کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا ہے اور وہ دراصل برطانیہ کا سیکریٹ ایجنٹ ہے۔ اس پر پی ایل او کی صفوں کے اندر شدید کھلبلی مچ گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ وقت آچکا ہے کہ میں اپنے کمانڈنگ آفیسر کرنل ڈیوڈ میکڈائن کو صاف بتادوں۔ ویسے یہ ڈیوڈ بھی بے حد خوبصورت اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔

جب میں قبرص سے واپس آئی اور جھانک کر کرنل میکڈائن کو دیکھا، وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ میں نے اسے اپنے حاملہ ہونے کی خبر سنائی۔ اس نے بتایا کہ اسے یہ معلوم کر کے بڑا سکون آیا ہے کیونکہ برطانوی فوج میں غیر شادی شدہ ماؤں سے متعلق ایک فراخ دلانہ روایت پائی جاتی ہے۔ پھر اس نے تھوڑا وقفہ کرنے کے بعد آہستگی سے پوچھا ”اس کا باپ کون ہے۔ کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہے، کیا یہ کسی شادی شدہ انسر کی کارستانی ہے؟“ میں نے کہا ”نہیں سر، یہ شادی شدہ انسر نہیں، اس میں تھوڑا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کرنل ہے مگر برٹش آرمی کا نہیں۔“

وہ ڈیسک پر ذرا آگے ہو کر بولا ”یو آ نے کس آرمی کا؟“

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا کہ یہ ”پی ایل او“ کا کرنل اور ان کی اعلیٰ جنس کا سربراہ ہے۔ کرنل نے میری طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا ”ہمیں یہ گفتگو یہی ختم کرنا پڑے گی یو آ نے.... مجھے اس امر کی کچھ تحقیق کرنا پڑے گی کہ ہم کسی مصیبت کو تو دعوت نہیں دے رہے، اس کے بارے میں کسی اور سے کچھ نہ کہنا۔“ مجھے احساس ہوا کہ وہ اس بات کو کہیں دور پہنچتے ہوئے پارہا ہے اور اسے کچھ اطمینان بھی ہے کہ میں ”نچلے درجے کے انسروں“ کے ساتھ گل نہیں کھلا رہی ہوں۔

مجھے یقین ہو گیا کہ میرے لئے اس سے ڈسپلین کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا دوسری جانب قبرص میں داؤد کو فوراً پی ایل او کے ہیڈ کوارٹر میں طلب کر لیا گیا جو اس وقت تیونس میں ہوتا تھا۔ لیکن اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کے ذاتی معاملات زیر بحث نہیں لائے جانے چاہئیں۔ جس پر اس کی تنخواہ کم کر دی گئی۔ اس کے دفتر کے ٹیلی فون منقطع کر دیئے گئے اور یا سر عرفات اور اس کے مابین لفظوں کی جنگ شروع ہو گئی۔ عرفات اپنے احکامات کی تعمیل کرانے کا عادی چلا آ رہا تھا اور اس کا منظور نظر (وہ اسے ذاتی طور پر اپنا محبوب کہا کرتا تھا) اس معاملے میں کچھ بھی سننے پر تیار نہیں تھا۔ داؤد دوسم گرما میں میرے پاس آیا اور بتایا کہ اس پر لعنت و ملامت کی بارش ہو رہی ہے۔

اس نے بتایا ”میں نے انہیں بتایا ہے کہ ہم شادی شدہ ہیں، ہمارا ایک معاشرہ ختم ہو چکا ہے۔ ہماری کہانی سارے خطے میں پھیل چکی ہے۔ اسے محبت کی بہت بڑی کہانی قرار دیا جا رہا ہے۔ لوگ محو حیرت ہیں۔“ میں یہ سن کر محظوظ ہوئی کہ پورے مشرق وسطیٰ میں میری دھوم مچ گئی ہے۔ میرے معتمد دوست نوٹو گرافر مائیکل سکاٹ نے ہم دونوں کی شادی کی تصاویر بنائیں جو سارے قبرص اور تیونس میں پھیل دی گئیں۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ پی ایل او کے ایک دہشت گرد سے میرے خصوصی انٹرویو کی کوشش نے کیا کیا رنگ کھلائے ہیں، اور اس سے مجھ سمیت کئی لوگوں کی زندگیوں بدل گئی ہیں۔ میں جان بوجھ کر مصیبتوں کو تلاش نہیں کرتی، مصیبتیں مجھے تلاش کر لیتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنڈے ٹائمز کے میڈیا ایڈیٹر نکولس ہیلن نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ تم صحافت کی طرف سے ایک لہر اٹا ہوا مکہ ہو۔

چنانچہ اب میں اسلام آباد میں تھی اور ایک اور ”ایڈوینچر“ پر روانہ ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہوں لیکن اس سارے آپریشن کو کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہوا پارہی تھی۔ یہ بھی سوچ ہی تھی کہ کیا میں اپنے والدین، اپنی بہنوں اور ڈیزی، اور اپنے قریب ترین دوستوں کو خط لکھنا شروع کر دوں۔ مگر ان کی فہرست بہت طویل ہوتی جا رہی تھی لہذا ناقابل عمل تھی۔ یہ پولیانا قسم کی چیز نہیں تھی۔

اس امر کا بھی واضح امکان تھا کہ مارٹن اور جم، منصوبے پر عمل درآمد روک دیں اور میں نے یہاں تک سوچ لیا تھا کہ میں اپنے فون کا سوچ ہی آف کر دوں گی لیکن ایسا کر دیتی تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہر حال میں آگے ہی بڑھ رہی تھی۔

تقریباً آدھی رات ہو چکی تھی، میں 24 گھنٹے سے بھی کم وقت میں افغانستان کے اندر پہنچنے والی تھی۔ میں نے دوستوں اور افراد خاندان سے فردا فردا مختصر سی گفتگو کر لی تھی اور میرے آخری کال ڈیز کی کوٹھی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے تجھ سے بہت محبت ہے اور اس نے مجھے بذریعہ ٹیلی فون ہی ”بوسہ“ دیا۔

میں نے اپنی بیٹی سے کہا ”ہمیشہ یاد رکھو: اگر مجھے چاہتی ہو یا تمہیں میرے ضرورت محسوس ہو تو اپنی آنکھیں بند کر کے مٹی کے بارے میں سوچنا شروع کر دینا، میں فوراً پہنچ جاؤں گی۔ کہو کیا یہ بات تمہیں یاد رہے گی، کہو ناں، ہاں ضرور یاد رہے گی، کیوں ڈیز کی ایسا ہی ہے ناں؟ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ باتیں ہمیشہ یاد رکھو اور اچھی طرح یاد رکھنا۔“ میری حیرت انگیز بیٹی نے جواب دیا ”جو کچھ بھی ہوگا، امی! کیا آپ میرا ہر تھ ڈے تو نہیں بھولیں، کیا بھول گئیں؟ یہ بدھ کو ہے۔ اچھا تو اب میں چلتی ہوں، ہم اس وقت کھیل رہے ہیں، بائی۔“

اس کے ساتھ ہی لائن ڈیڈ ہو گئی۔

میری رات کی نیند بے سکونی کی تھی۔ لیکن میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں جب بھی میرے ذہن پر کوئی دھن سوار ہو، میری رات گروٹوں میں ہی گزرتی ہے۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں چاہوں تو اس منصوبے کا ”پلگ“ اب بھی باہر کھینچ سکتی ہوں۔ اگر میں نے خود کو زیادہ مغموم پایا تو یقیناً یہی کروں گی۔

میں ناشتے کے لئے خلی منزل پر اتری تو میرے ساتھ وہ جوشیلی امریکی فوٹو گرافر بھی آگئی جو نیویارک کی کسی ایجنسی کے لئے ایشیا کے مختلف ممالک میں تصویریں بناتی تھی۔ وہ زور درنج اور سخت جان بھی تھی، میں اسے ناراض کرنے سے بچنے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور بڑی محتاط رہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے منصوبے سے متعلق کچھ نہ بتایا تا کہ اگر وہ میرے ساتھ جانا چاہتی تو جاسکتی تھی۔ یہ بتانے کی وجہ یہ تھی کہ جیسے میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں اکیلے کام کرنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ اس کے جسم پر کافی چوٹیں اور خراشیں آئی ہوئی تھیں، اس کے باوجود وہ جلسے جلسوں اور ہنگاموں کی تصاویر بناتی رہتی تھی۔

میں نے حسب معمول فرائیڈ انڈوں اور مصالحہ دار کریم کا ناشتہ کیا۔ پھر ہوٹل کے بزنس سنٹر میں جا کر جم مرے کو یہ ای میل بھیجی:

”تو میرے مہم پر روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، یہ ایسی تیاریاں ہیں کہ میں نے اس سے پہلے ایسی کبھی نہیں کیں۔ اگر میں کامیاب ہو گئی تو میں جانتی ہوں کہ مجھے پیٹھ پر بہت تھپکیاں ملیں گی، اور نا کام ہو گئی تو نا عاقبت اندیش اور پر لے درجے کی احمق کہلاؤں گی۔“

اس دنیا میں کوئی بھی ایسا کام نہیں جسے مکمل طور پر محفوظ اور خطرات سے پاک کہا جاسکتا ہو۔ یہ حقیقت ہزاروں سال نیویارک پر 11 ستمبر کو واضح ہو گئی تھی۔ تاہم طالبان کے زیر کنٹرول افغانستان میں کوئی بھی مغربی صحافی موجود نہیں اور ہمیں یہ جاننے کی اشد ضرورت ہے کہ وہاں اندر کیا ہو رہا ہے۔ خواہ ایک آدھ فوٹو ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے پورا یقین ہے کہ میں بخیریت رہوں گی، میری تحفظ ذات کی جہلت خاصی قوی ہے، اور بھی کئی لوگ یہ خطرہ مول لے رہے ہیں، لہذا میں بالکل اکیلی نہیں ہوں۔ مسکین نامی ایک شخص میرا گائیڈ ہے، اس کا تعلق صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے سے ہے۔

ہم کوہندو کش میں سے ایک قدیم روایتی روٹ اختیار کریں گے۔ یہ راستہ پاکستان کی سرحدی چوکیوں سے ہٹ کر جاتا ہے اور ہم اسے چار پہیوں والی گاڑی سے طے کریں گے۔ پھر تقریباً دس کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد جلال آباد کے نواح تک گھوڑوں پر جائیں گے، جہاں اسامہ بن لادن کا ایک اڈہ ہے۔ اگرچہ ہم اس سے کافی دور سے گزریں گے۔ وہیں کہیں رات ٹھہرنے کے بعد پیچھے ہٹ آئیں گے اور میں جمعہ کی سہ پہر کو سنوری فائل کروں گی۔

افغان عورت کا سفر واپس

میں نے ہر ممکن احتیاط کر لی ہے۔ بال رنگ لئے ہیں اور جلد بھی رنگدار کر لی ہے، کپڑے بھی پرانے اور افغان وضع کے ہیں اور جوتے بھی روایتی پہنوں کی۔ مسکین لوگوں پر یہ ظاہر کرے گا کہ وہ اپنی بوڑھی ماں کو افغانستان سے لانے جا رہا ہے۔ اس کی بیوی (یعنی میں) کو لگی ہے۔ ہمارے پاس نیم خود کار ہتھیار ہوں گے، بعض مقامات پر مسلح محافظ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہمارے پاس جو شناخت موجود ہے، وہ ہم بارڈر پر پاشا کے حوالے کر جائیں گے۔

میں اپنے اہل خاندان کو خطوط وغیرہ لکھنے والی تھی، مگر اب یہ ارادہ ترک کر رہی ہوں۔ میں جمعہ کو سنوری فائل کروں گی، اور آپ سے جتنی بھی جلدی ہو سکا، رابطہ قائم کروں گی۔ کیا یہ سب مکمل ہونے پر مجھے 2000 ڈالر بھجوائے جا سکتے ہیں، ان کے ساتھ یہی فیس طے پائی ہے۔ اس کام میں تعاون کرنے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں جب تک بحریت اسلام آباد واپس نہ پہنچ جاؤں انہیں ایک پائی تک نہیں ملے گی۔

پشاور میں بعض دھوکہ باز لوگ 1200 ڈالر کے عوض افغانستان لے جانے کی پیشکش کرتے ہیں مگر جانے والوں کو وہاں بمشکل پاؤں رکھنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ یہ بہت بیودہ بات ہے۔ اگر اس سفر کے دوران ہماری طالبان سے ملدھ بھیڑ ہوگئی تو پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا۔

میں انتظار کر رہی ہوں کہ وہ وقت کب آتا ہے جب میں آپ کو ایک اچھا سفیر اور مصدقہ خبریں فائل کر سکوں۔ پھر میں نے ڈیوڈ سمٹھ کو کال کی جو کوئٹہ میں تھا اور ڈیلی ایکسپریس کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ میں ”سندے“ کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ میں ”سندے“ کے لئے کیا کر رہی ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ یہ مت پوچھو بعض اوقات منہ سے نکل جانے والی بات سنوری کی ”ہائی لائن“ کو چھین لیتی ہے۔

وہ بولا ”میں اندازہ لگا سکتا ہوں مگر کیا یہ جم میرے کا آئیڈیا ہے؟“ میں ہنسی اور کہا ”نہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ اس پروجیکٹ پر نظر ثانی کے لئے زور دے رہا تھا، اور یہ سارے کا سارا پروجیکٹ میرا اپنا ہے۔“

ڈیوڈ سمٹھ اس لئے کوئٹہ گیا تھا کہ جنوب میں مہاجرین کا بحران سنگین ترین شکل اختیار کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اشتعال انگیزیوں اور کشیدگیوں میں اتنی شدت بڑھ چکی ہے کہ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، اس کی انتظامیہ کو مسلح گارڈ مقرر کرنا پڑ گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر صورت حال ابھی سے یہ ہو چکی ہے تو اس وقت کیا ہوگا جب وہاں بم گرائے جا رہے ہوں گے؟ میں نے اسے محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا کہ میں اس ہفتے کے آخر میں تم سے رابطہ قائم کروں گی۔

ٹم شپمین نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ڈیوڈ سمٹھ کا خیال رکھوں، کیونکہ یہ اس کا قریبی دوست ہے اور اسے پہلی بار اتنی بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ لیکن اسے کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اندر سے اگر چہ ڈرا ہوا تھا مگر ظاہر یہ کر رہا تھا کہ وہ خود اعتمادی سے مالا مال ہے، اور اس نے ایک اچھے گائیڈ کا بھی انتظام کر لیا تھا۔

میں کچھ دیر ہوٹل کے ارد گرد گھومتی رہی اور پھر وائٹ ہال میں اپنے آدمی کو ”ٹیکسٹ میسج“ بھیجا۔ اس نے مجھے کہا کہ تم پاگل ہو گئی ہو اور کہا کہ مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ اس پر میں نے بھٹا کر ایک ای میل بھیجی جس میں اس پر واضح کیا کہ مجھے لکچر کی ضرورت نہیں، میں صرف حوصلہ افزائی چاہتی ہوں اس پر اس کی طرف سے قدرے مثبت جواب ملا۔ پھر میں نے اپنے دوست پال بیور (ملٹری ایڈوائزر) کو فون کیا اور اس کے لئے ایک پیغام چھوڑا کہ وہ مجھے کال کرے کیونکہ میں اس سے اوپر والوں کو ایک آئیڈیا دینا چاہتی ہوں۔

پھر پاشا کی کال آئی جس میں اس نے بتایا کہ وہ شام کو مجھے لینے آئے گا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی کار کی سروس کر رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے اور کیا ہر کوئی اپنی جگہ خیریت سے ہے اور جو کچھ انہوں نے کرنا ہے، وہ بھی OK ہے۔ جواب ملا ”ہاں ہر کوئی ٹھیک جا رہا ہے۔“

اس کے بعد میں بزنس سنٹر چلی گئی اور طالبان کے بارے میں بڑھنا شروع کر دیا۔

غلطاب جھوٹی، سزا سنائی

چند ایک ویب سائٹس چیک کرنے پر اس انکشاف پر میں حیران رہ گئی کہ طالبان کا مقصد دنیا میں ایک قدامت

پسند ترین اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ یہ کوئی کھیل تماشا والے لوگ نہیں تھے اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی بڑی بڑی سزائیں دے رہے تھے۔ ان کے ہاں تفریح طبع کا ہر کام اور خوشیوں سے متعلقہ ہر چیز ممنوع تھی ماسوائے اس کے کہ اس کا کوئی تعلق مذہب سے جانتا ہو۔ چنانچہ ٹیلیوژن، میوزک، فلمیں، سیٹیا بجانا، ڈانس، گانے اور تالیاں پیٹنا وغیرہ سب کچھ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ میں ”نیو کیسل یونائیٹڈ“ کی گریجویٹ رہی ہوں، میں تو سینٹ جیمز پارک میں 90 منٹ تک بھی ہنسے ہنسائے اور سیٹیاں بجائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر میں افغانستان میں ایسی حرکتوں کی مرتکب ہوتی تو جان گنوا بیٹھوں گی۔ اور ان کے ہاں تو بلند آواز سے صرف اللہ اکبر پکارا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں۔

میں اس کے نیچے مزید ممنوعات کی فہرست پڑھتی چلی گئی۔ لکھا تھا: سگریٹ نوشی، سنور کے گوشت، پتنگ بازی اور فوٹو گرافی کی سخت ممانعت ہے۔ قرآن کے بوسیدہ صفحات کی ری سائیکلنگ بھی ممنوع تھی، جس کی بنا پر کانغڈ کے لفافوں پر پابندی لگا دی گئی کیونکہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ قرآنی صفحات کو اس ٹیکنالوجی کے ذریعے لفافوں میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔

”تو پھر میں اپنا چھوٹا نکون کیمرا کیوں لے جا رہی ہوں؟ مگر یہ تو بہت چھوٹا ہے، شاید کسی کو اعتراض نہ ہو۔“ میں نے خود کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

میں نے انٹرنیٹ پر اپنی تحقیق جاری رکھی، اور وہاں انٹرنیٹ بھی ممنوع اشیاء میں شامل تھی۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ بعض قوانین کا صرف مردوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ کچھ قواعد ڈاڑھی سے متعلق بھی تھے۔ فیشتی ڈاڑھی اور کلین شیو بالکل ناقابل برداشت تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ ڈاڑھی اتنی لمبی ہونی چاہیے کہ ٹھوڑی پر بندھنی رکھی جائے تو ڈاڑھی کے بال اس کے برابر ہوں۔ جن لوگوں کی ڈاڑھی اس سے کم ہو انہیں اتنے عرصے کے لئے جیل میں رہنا پڑتا تھا کہ بال بڑھ کر مقررہ حد تک پہنچ جائیں۔ مردوں کو سر ہمیشہ ڈھانپنا پڑتا تھا۔ سر پر ہنہ بچوں کو سکول میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔

عورتوں سے متعلق قوانین ان سے دس گنا زیادہ تھے انہیں گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی، ان کے لئے ایک محدود دائرہ تھا، یعنی وہ علاج وغیرہ کر سکتی تھیں یا زمانہ جیل میں نگرانی کے امور سنبھال سکتی تھیں۔ گھر سے باہر نکلنے کے لئے برقع اوڑھنا ضروری تھا۔ اور وہ کسی رشتہ دار مرد کو ساتھ لیے بغیر کہیں آجا نہیں سکتی تھیں۔ مرد کانداروں سے سودا خریدنے کی بھی ممانعت تھی۔ ان کے لئے تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ تاہم بعض دلیر عورتوں نے خفیہ سکول قائم کر رہے تھے۔ جن میں صرف لڑکیاں پڑھتی تھیں۔

ان کے لئے کچھ اور مضحکہ خیز قوانین بھی تھے مثلاً یہ کہ ان کے نچنے ڈھانچے ہوئے ہونے چاہئیں۔ انہیں مرد اکڑوں سے علاج کروانے کی بھی ممانعت تھی۔ ان کے لئے زیب و زینت کی اشیاء (کاسمیٹکس) کا استعمال ممنوع تھا۔ انہیں قہقہہ لگانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ان کے لئے حکم تھا کہ باتیں کریں تو آہستہ کریں تاکہ غیر مرد سننے نہ پائے اونچی ایزی والے سینڈل پہننے اور بجنے والی پازیب باندھنے کی بھی ممانعت تھی۔ واحد معقول ممانعت جو میں نے دیکھی سفید جرابوں کی تھی، لیکن یہ مرد اور عورت دونوں کے لئے ممنوع ہونی چاہیے تھی۔

تاہم سفید جرابوں کی ممانعت کے لئے جو وجہ معلوم ہوئی وہ بھی بے حد مضحکہ خیز تھی۔ سفید جرابوں کو جنسی کشش کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ طالبان نے سفیدی کو اس لئے مقدس سمجھا کہ ان کا پرچم سفید تھا۔

ان قوانین پر سوچ بچار کے بعد مجھے بارڈر پر بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ میں غالباً دس منٹ کے اندر ان میں سے بیشتر کی خلاف ورزی کر ڈالتی۔ سارا مغرب ان کی حکومت کو جاہرانہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ ان سے متعلق اسے جتنی روایتیں پہنچی تھیں ان میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر تھیں، ایک بات عورت کی مظلومی کی داستانیں اور دوسری بات نسلی اقلیتوں پر جبر و ستم کی کہانیاں تھیں۔

teenage witch کے ذیلی ٹائٹلز دیکھے تو میرا ذہن فوراً ڈیزی کی طرف منتقل ہو گیا، یہ اس کا پسندیدہ پروگرام ہے لیکن امریکی ایکٹروں سے متعلق اردو بولنے والوں کی آواز میں تبصرے سنے تو یہ بے حد مضحکہ خیز بات لگتی۔

میں نے چند منٹوں کے بعد دوبارہ ”زیپر“ (ریموٹ کنٹرول) دبایا تو میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہ عربی ”کون بے گالکھ پتی“ میں کرسٹینا کا سعودی ورثہ اور روایتی سیاہ لباس میں ملبوس عورت کی اداکاری تھی جس کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں کتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دی گئی تھی تاہم اس کی کارگردگی بہت اچھی تھی۔

میں نے آفس میں کال کی، پتہ چلا کہ نیوز ایڈیٹر جم بیکنگ ایڈیٹر ایلکس ہینسٹر سے کوئی بات چیت کر رہا ہے، میرے ایک ساتھی رپورٹر کیتھ پیری نے بتایا کہ ان کا موضوع گفتگو ”میرے سفر افغانستان کے حوالے سے میری انٹورنس“ ہے۔ کیتھ پیری، میرے ”نیوز آف دی ورلڈ“ میں ملازمت کے زمانے کا میرا رفیق کار تھا۔ یہ اس انڈسٹری کے مختصر ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس منصوبے پر میں ایڈیٹر اور جم، دونوں سے پہلے ہی بات کر چکی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا تھا کہ آئندہ مجھ سے رابطے کا واحد طریقہ ”ٹیکسٹ میسج“ ہوگا۔

انٹورنس کی بات پر میں گھبرا گئی، چنانچہ میں نے اپنے فون کا سوئچ آف کر دیا۔ کہہیں ہینسٹر کوئی اڑچن ڈال دے اور کہہ دے کہ مجھے انٹورنس کا تحفظ حاصل نہیں اور میں نہیں جاسکتی۔ میں ذہنی طور پر بالکل تیار کھڑی تھی، میں نے خود سے کہا: ”اب مجھے کوئی طاقت پیچھے نہیں بنا سکتی۔“

میں نے ٹیلی فون کا سوئچ پھر لگا دیا اور اپنی بھانجیوں و کٹوریہ اور ہولی کو پیغام دیا کہ میں نے ان کی ”ننا“ کو کال کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ مصروف تھی، اب میں اس سے کل بات کروں گی۔ میں لوگوں کو گمراہ کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں اپنی ماں کے سامنے جھوٹی بھی نہیں پڑنا چاہتی مگر اس کی معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی حس بہت تیز ہے، وہ میرے لہجے سے ہی سمجھ جائے گی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ مجھے مجھ سے بھی بہتر جانتی ہے، اسی سے مجھے خوف تھا۔

پاشا تقریباً آٹھ بجے شام ہوٹل پہنچا اور ہم دارالحکومت کے مضافات میں ایک مکان میں پہنچے جہاں میرا تعارف ایک ہنس مکھ عورت، اس کے دو بیٹوں اور بہت سے دیگر رشتہ داروں سے کرایا گیا، وہ اچھی طرح انگریزی نہیں بول سکتے تھے، میں نے ان کا حوصلہ بندھاتے ہوئے کہا کہ تمہاری انگلش میری اردو سے بہتر ہے۔

پاشا نے کہا کہ مجھے اب پاکستان کا روایتی لباس پہن لینا چاہیے کیونکہ ہم فوراً قبائلی علاقے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ قبل اس کے یہاں کے لوگ ایک مغربی عورت کو اپنے علاقے میں عجیب نظروں سے دیکھنا شروع کریں اور کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ چنانچہ اس کی بیوی نے مجھے میرا اصل روپ چھپانے کے لئے پہلا روایتی لباس دیدیا۔ میں ایک کمرے میں گئی اور ہلکے نارنجی رنگ کی شلوار اور سبزی مائل نیلی میٹھس پہنی اور ہلکے سبز رنگ کی شال اوڑھ لی، جس نے میرے سر کے بیشتر حصے کو ڈھانپ دیا۔ میں نے اپنے بالوں کو رنگنے کے علاوہ انہیں پیچھے لے جا کر گوندھ لیا تھا اور اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو سانولے کرنے کے لئے رنگ لگا دیا تھا۔

پاشا کی بیوی نے پیار سے مجھے گلے لگا لیا اور پاشا نے کہا ”میڈم میری بیوی کو تمہاری بہت فکر ہے، وہ اور دیگر افراد خاندان تمہاری خیریت کے لئے دعائیں کر رہے ہیں۔“ میں سب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے پیچھے مڑی اور ہم اس کی کار میں جا بیٹھے۔

میں اپنے گائیڈ مسکین سے ملی اور بہ عجلت اس کی کار میں سوار ہو گئی جسے وہی چلا رہا تھا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس کی ڈرائیونگ بڑی خوفناک تھی میں ڈر کر سہم گئی اور سوچنے لگی کہ افغانستان میں داخل ہونا تو ایک طرف رہا، پتہ نہیں میں اس گاڑی میں سے زندہ باہر نکل سکوں گی یا نہیں؟

میں روڈ سے پشاور جاتے ہوئے پولیس نے ہمیں کئی جگہ روکا اور نیم دلا نہ انداز میں کار کی تلاشی لی، میرے بہروپ نے انہیں مطمئن کر دیا مگر انہیں دراصل کسی اور چیز کی ضرورت تھی۔ انہیں روپوں کی ضرورت تھی۔ پولیس کی ظاہری تنخواہ بہت کم ہے، اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنے طور پر غیر سرکاری ”روڈ ٹول“ وصول کرتے رہتے ہیں۔

مسکین نے ایک پولیس مین کو کچھ روپے دیئے لیکن اس نے مسکین سے جھگڑا شروع کر دیا کہ بہت کم ہیں، سخت الفاظ کا تبادلہ ہوا مسکین نے غصے سے جھپٹا مارا اور روپے واپس لے کر کارتیزی سے دوڑا دی اور بھاگ نکلا، سب لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ پاشا نے کہا، پولیس والے بہت لالچی ہو گئے ہیں۔ یہ شخص حرص کی وجہ سے پہلی رقم سے بھی محروم ہو گیا ہے۔

پھر میں اور ویب سائٹ میں گئی تاکہ یہ دیکھوں کہ طالبان کیسے وجود میں آئے؟ ایک تحقیقی دستاویز کے مطابق جسے بیشتر مصنفین نے قبول کیا ہے، انہیں 1993ء میں ہی ایک منفرد گروپ تسلیم کر لیا گیا تھا، اگرچہ وہ اگلے سال تک نمایاں طور پر سامنے نہیں آئے تھے۔ انہیں ایک مذہبی سکالر مولانا محمد عمر اخوند نے منظم کیا تھا جس کی عمر اس وقت 43 سال تھی۔ اس نے قندھار کے ایک گاؤں میں دینی علوم کے چالیس پچاس طلباء کو اکٹھا کر کے انہیں اپنے مشن سے آگاہ کیا اور سب کو گرویدہ بنالیا۔ ”ایشیا ویک“ کی رپورٹ کے مطابق یہ طلباء پاکستان کے پشتون بیلٹ کے مذہبی مدرسوں اور ریفریوجی کیمپوں سے تعلق رکھتے تھے جو صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان سے آئے تھے۔ ان کے پاپیوں میں زیادہ تر دزانی قبیلے کے پشتون تھے۔

ایشیا ویک کا کہنا ہے کہ مولانا عمر اور اس کے ساتھیوں کو سب سے زیادہ غصہ مجاہدین کے ان گروپوں پر تھا جو باری باری اقتدار میں آ رہے تھے اور ان میں ساری برائیاں سرایت کر گئی تھیں۔ پھر انہوں نے آپس میں علاقے بانٹ لئے ان میں زبردست کشمکش شروع ہو گئی نتیجتاً ملک میں لاقانونیت پھیل گئی۔ شاہراہوں پر لوٹ مار ہو رہی تھی۔ ڈکیتیاں اور زنا بالجبر واقعات روزمرہ کا معمول بن گئے۔ جولائی 1994ء میں قندھار کے ایک ملٹری کمانڈر نے تین عورتوں کی جبری عصمت دری کی اور بعد ازاں انہیں کوئی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور ہونے کے بعد ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

مولانا عمر اور طالبان فوراً حرکت میں آ گئے۔ اس ملٹری کمانڈر کو پھانسی پر لٹکا دیا، اس کے آدمیوں نے مولانا عمر کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے سفید پرچم تلے لڑنے کا اعلان کر دیا۔ اس فوری انصاف نے لوگوں کے دل چیت لئے۔ طالبان کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔

ان واقعات سے انداز ہوا کہ طالبان نے بہترین ارادوں سے اپنے کام کا آغاز کیا، تاہم بعد میں وہ کسی وجہ سے اپنے راستے سے ہٹ گئے۔ میرا کسی ”طالب“ سے ملنے یا اس سے ”چینگ“ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرا ہدف عام افغان تھے، میں ان کے عام آدمیوں کے جذبات و احساسات سے باخبر ہونا چاہتی تھی۔ مجھے امید تھی کہ مجھ پر کوئی شبہ نہیں کیا جائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میرا کھوج لگا لیا گیا تو میری زندگی شدید خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔

مجھے برے انجام سے دوچار ہونے میں اگر کوئی شبہ تھا تو اسے مولانا عمر کے اس شام کے ان احکامات سے تقویت مل گئی جن میں کہا گیا تھا کہ جو افغان، غیر ملکیتوں کو کوئی اطلاعات فراہم کرے گا، اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ اس سے مجھے یہ تاثر ملا کہ وہ روزانہ نئے نئے قوانین کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی، اس لئے میں سیدھی ہوٹل کے نیچے بونے کے لئے چلی گئی جو بہت مزیدار تھا۔ میں نے اس رات واقعی سنور کی طرح ٹھونس کر کھایا، دوبارہ کھانے پر بلکہ بولا تھا، کیونکہ پتہ نہیں کہ اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔ میں نے یہ بات ریسٹورنٹ مینیجر سے مذاق کرتے ہوئے کہی جس نے مجھے ایک بار پھر کھانے کی دعوت دی تھی۔ میں نے اتنا کھایا، اتنا کھایا کہ میرے لئے ہلنا مشکل ہو گیا۔ اس دوران اقوام متحدہ کا ایک پاکستانی نژاد ڈاکٹر میرے پاس آ گیا۔ جس سے میں اس ہفتے کے شروع میں ملی تھی۔ وہ بڑی دلکش شخصیت کا مالک تھا، اس نے بتایا کہ اسے کابل سے نکال دیا گیا ہے اور اسے اقوام متحدہ کے دفاتر، ہسپتال اور پیچھے رہ گئے طبی آلات کے بارے میں بہت تشویش ہے اور اسے سب سے زیادہ فکرواں کے لوگوں کے بارے میں ہے۔

میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا اس پر اس نے بڑے وثوق سے کہا کہ میں برقعے میں رہی تو ضرور محفوظ رہوں گی۔ میں نے اسے اپنے بالوں کے رنگے ہونے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ اسی لئے میں نے ڈنر کے دوران سرخ فیئر بیس بال ٹوپی پہن رکھی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اتوار کو دوپہر کا کھانا کھانے اور گاڑی پر مضافاتی علاقے کی سیر کا پروگرام بنایا تاکہ میں پاکستان کی جی بھر کر سیر کر سکوں اور اسے اپنے ایڈونچر کی کہانیاں سنا کر خوش کر سکوں اور شدت سے اتوار کا انتظار کرنے لگی۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر میں نے تھوڑی دیر سی این این دیکھنے کے بعد سوچا آف کر دیا کیونکہ اس مصنوعی جنگ کے مناظر دیکھ دیکھ کر میں اکتا چکی تھی۔ کئی ماہرین نے آئندہ ہونے والی جنگ سے متعلق پیشین گوئیاں کی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ ایک ناقابل پیش کوئی بزنس ہوتا ہے، تاہم ایک چیز جس کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے، یہ ہے اس جنگ میں انسانی جانوں کا بہت بڑے پیمانے پر ضیاع ہوگا لیکن مغرب کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ امدادی ایجنسیوں کی جانب سے ظاہر کردہ خدشات کو کوڑا کرکٹ سمجھ کر تالین کے نیچے چھپا رہا تھا۔

میں نے ٹیلی ویژن کے دوسرے چینل جلدی جلدی بدلنا شروع کر دیئے لیکن میں ضرور کہوں گی کہ اگر آپ اردو، ہندی یا عربی نہیں جانتے تو اسلام آباد میں ٹیلی ویژن بڑی منحوس چیز لگتی ہے۔ جونہی میں نے ”Sabrina, the

میں نے سگریٹ کے گہرے کش لگانے شروع کر دیئے۔ سگریٹ طالبان کے احکامات کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ اس لئے میں زیادہ سے زیادہ پی لینا چاہتی تھی۔ میں نے سگریٹوں کے لئے یشماک ”پردے“ کی نقاب کے بٹن کھول دیئے تھے۔

تمباکو نوشی، میری چند ایک خوشیوں میں سے ایک ہے اور پاکستان میں قیام کی خوشیوں میں سے ایک خوشی یہ ہے کہ یہاں ایک گھڑ سوار کی طرح جی بھر کر سگریٹ پئے جاسکتے ہیں۔ یہاں کرپک کوکین، پینا، لندن میں ”ننٹس اینڈ ہیجز“ پینے کی بہ نسبت آسان تر ہے۔ میں ایک نان سموکنگ آفس میں کام کرتی ہوں لیکن میں سگریٹ نوشی کے لئے باہر جانے والے ساتھیوں کے ہمراہ جانے سے صاف صاف انکار کر دیتی ہوں۔ اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھی سگریٹ پیتی رہتی ہوں۔ باہر سردی میں ٹھہرتے ہوئے کیوں پیوں اور گڑ رتے ہوئے موٹر سواروں کے طنز یہ فقرے کیوں سنوں۔ بیشتر کالی ٹیکسیوں میں ”نوسموکنگ“ کے سائن لگے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا غیر قانونی نہیں ہے پھر بھی سفر کرنے والا (والی) خود کو اخلاقی طور پر مجبور پاتا (پاتی) ہے کہ وہ سگریٹ نہ سلگائے اور جب میں لڈگیٹ ہاؤس سے نکل کر سٹیٹمنٹ روڈ کی وائن بار میں پہنچتی ہوں تو ہانپ رہی ہوتی ہوں۔

یہ ایک بات ہے کہ میرے والدین سگریٹ نوشی سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ڈیڈی کے سامنے پہلی بار ایک سگریٹ سلگایا تھا، میرا خیال تھا کہ اس کا فیوز ابھی دھماکے سے اڑ جائے گا۔ یہ ہمارے ایک خاندانی تقریب تھی اور میری آنجمنی چچی فلورنس جو خود بھی بہت شوق سے سگریٹ نوشی کرتی تھی، وہ بھی موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ سگریٹ سلگانے کے لئے بہت مناسب موقع ہے، میں نے چند کش لگائے مگر جونہی والد کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ زور سے دھاڑا۔ ”بجھاؤ سگریٹ، بد تمیز لڑکی۔“ میں نے آنٹی کو اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے اپنی سگریٹ فوراً مسل کر بھادی، والد کے بھائی، انکل نام نے پیچھے مڑ کر اپنی حواس باختہ بیوی کو دیکھا، پھر مجھ پر نظر ڈالی تو بے ساختہ ہنسنے لگا۔ جب دوسروں نے دیکھا کہ والد تو صرف مجھے ڈانٹ پلا رہا تھا، اس پر وہ سب انکل کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ پھر اسے بھی مسکراتا پڑا۔ اس سے ناگواری کے بادل چھٹ گئے اور میں بدستور پیتی رہی۔

مال مغربی سرحد کی طرف سفر کے دوران، ہماری ملاقات دو دوسرے افراد سے ہو گئی، وہ بھی بظاہر بارڈر کی طرف ہی جا رہے تھے۔ میں نے پاشا سے کہا کہ میں کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتی اور اس نے مجھے مطمئن رہنے کی تلقین کرنے کے بعد ایک انگلش سپیکنگ شخص ”جان“ سے متعارف کرایا۔ لیکن میں نے کہا کہ کسی کا نام پوچھنا نہیں چاہتی، اس بات کو ہم ضرورت محسوس ہونے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

آدھی رات گزر چکی تھی کہ ہم ایک گاؤں میں پہنچے، ہم نے گاڑی عقبی راستے پر ڈال دی۔ ایک خوفناک مہتاب بھونک رہا تھا۔ پاکستان میں گتے بہت کمزور، غصیلے اور بد مزاج دکھائی دیتے ہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس کے بھونکنے سے میں ڈر گئی تھی۔ ایک دروازے پر دستک دی گئی، پھر کئی بار کی دستک اور انتظار کے بعد اندر روشنی جلانے کا احساس ہوا بالآخر ایک عورت نے دروازہ کھولا جس کی عمر 60/70 سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔

وہ ہمیں خاموشی اور احترام کے ساتھ اندر لے گئی۔ اس نے مجھے بوسہ دیا اور گلے لگایا۔ وہ بے حد انکساری سے پیش آرہی تھی۔ اگرچہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے جذبات ہم تک اور ہمارے اس تک، بخوبی پہنچ رہے ہیں۔

مرد باہر کھلے آسمان تلے چارپائیوں پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور چاند آب و تاب سے چمک رہا تھا، سب لوگ تمباکو نوشی کے ساتھ ساتھ چائے کی بھی چسکیاں لے رہے تھے، میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی ان کے پاس جا بیٹھوں لیکن مجھے ایک بڑے بیڈروم میں پہنچا دیا گیا جہاں کم از کم آٹھ دوسری عورتیں اور متعدد بچے گہری نیند سو رہے تھے۔

کبھی نہ نکالنا۔“

اسی اثنا میں مرد لوٹ آئے، ہم دوبارہ چل پڑے۔ میں نے اپنے دانت پیستے ہوئے پاشا سے کہا۔ ”ہمارے ہمراہی کہاں کے عجوبے ہیں، ہمیں انہیں ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت آ پڑی تھی، کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ ”ہم معاملات کو سادہ رکھیں گے؟“ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا ”میڈم پریشان نہ ہوئے، اب آپ شادی میں شرکت کے لئے افغانستان جانے والے ایک خاندان کا حصہ ہیں، یہ بے حد محفوظ طریقہ ہے۔“

گنجل اس کے کہ میں کچھ کہتی، گاڑی ٹھہر گئی اور کسی وجہ سے ہم نے ڈرائیوروں کو تبدیل کر دیا اور ہم اس جگہ سے بھی گزر گئے جہاں میں نے خیبر رائفلز کے تقریباً نصف درجن سپاہیوں کے فوٹو اتارے تھے، اور دس منٹوں سے بھی کم وقت میں ہم طورخم بارڈر پر تھے۔

ہم کار میں سے اترے، میں نے اپنا برقع اٹھا کر اسے راہیوں کی عبا کی شکل دیتے ہوئے پاشا سے کہا۔ ”مجھے تو یہ پسند نہیں، ہم نے جو پلان بنایا تھا وہ یہ نہیں تھا.....“ لیکن اس نے مجھے فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا اور تنگی سے کہا ”منہ بند کرو، چہرے کو ڈھانپ لو..... وہ دیکھو..... ایک طالب سیدھا ادھر آ رہا ہے۔“

میں خوف سے جم کر رہ گئی اور وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا تھا۔ پھر میری ہمراہی عورت نے اپنا ایک بچہ مجھے پکڑ لیا اور پُر شفقت انداز میں مجھے بارڈر کی طرف لے کر چلنے لگی۔ میں خوف سے مفلوج ہو رہی تھی اور دو مردوں ایک عورت اور بچوں کے ہمراہ ڈگمگاتی ہوئی طالبان چیک پوسٹ کی جانب جا رہی تھی کہ ایک شخص نے پشتو میں شور مچاتے ہوئے مجھے کچھ کہا۔

میں نے سوچا کہ میں ابھی افغانستان میں داخل بھی نہیں ہوئی کہ انہوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا ہے، میں آرام سے پیچھے مڑی۔ یہ ایک میڈیکل چیک پوائنٹ تھا جہاں پر بچوں کو ملک میں داخل ہونے سے پہلے اقوام متحدہ کی بھیجی ہوئی ویکسین دی جا رہی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ چیچک یا کسی اور امراض کے انسداد کے سلسلے میں تھی۔

مقام شکر تھا کہ عورت اپنے بچے سمیت آگے بڑھ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہوئی۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کچھ کہا، میں نے بہم انداز میں سر ہلا دیا اور اس نے ویکسین کے چند قطرے میرے ساتھ والے بچے کے منہ میں ڈال دیئے۔ پھر ہم مردوں کی طرف واپس آگئے اور بارڈر عبور کرنے لگے۔ میں نے پہلا ٹیسٹ بخوبی پاس کر لیا لیکن دل میں ڈر پھر بھی موجود تھا۔

اب ہماری ستوری تبدیل ہونے لگی۔ مسکین میرے ہمراہ نہیں تھا۔ میں اب بھی کوئی بھری تھی اور میرا نام شیم رکھا گیا تھا۔ لیکن اس وقت میں شادی کی تقریب میں جا رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا، کہ میں کیسے مستحکم خیز حالات میں سے گزر رہی ہوں، مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میں کسی اور طریقے سے یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی کیونکہ طالبان کے سپاہی جو نیم خود کار اسلحہ اور کلاشنکوفوں سے مسلح ہیں، قانون کی خلاف ورزی پر مجھے کم از کم کوڑے ضرور لگاتے یا پتھر نہیں اور کیا کر ڈالتے؟

چنانچہ آج میں یعنی ”یو آنے رڈ“ دو ملکوں کے درمیان ایک غیر مرئی لائن کو عبور کر رہی تھی، دل خوف سے لرزاں تھا اور بدن کے اندر ٹنوں کے حساب سے ”ایڈرینالین“ (ایک مادہ جو خون میں ہیجان پیدا کرتا ہے) پمپ کر رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ شور مچانا شروع کر دوں اور بھاگتی ہوئی واپس پاشا کے پاس جا پہنچوں لیکن میں ایک افغان عورت کے بھیس میں تھی اور خاموشی کی دنیا میں پھنسی ہوئی تھی، جہاں میرا منہ کھولنا مجھے موت کے منہ میں پہنچا سکتا تھا۔

یہ ایریا پھلوں کے بیٹھا رستوں اور کودام نما دکانوں سے انا ہوا تھا جن میں موٹر آئل اور سیکنڈ ہینڈ کاروں کے فالتوں پر زے فروخت ہو رہے تھے۔ پبلی اور سفید ٹیکسیوں کی ایک لمبی قطار تھی جو نئے مسافروں کا انتظار کر رہی تھیں۔ پھٹے ہوئے کپڑوں والے درجنوں لڑکے ادھر ادھر پھر رہے تھے جو بوٹ پالش کرتے اور کاروں کو چمکاتے ہیں تاکہ اپنے پیٹ کی بھوک دور کر سکیں۔

چند مہاجرین بھی تھے جو اپنا سامان اٹھائے افغانستان سے باہر جا رہے تھے مگر جانے والوں کی بہ نسبت آنے والے کہیں زیادہ تعداد میں تھے، زیادہ تر صحتمند نوجوان تھے جو ایک مقصد لے کر طورخم آ رہے تھے تاکہ طالبان کے دوش بدوش لڑیں۔ ان میں یورپی مسلمان رضا کار بھی تھے اور میں انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی، کہ یہ طالبان کی طرف سے جہاد میں شمولیت کی دعوت کے جواب میں اتنا طویل سفر کر کے آئے ہیں۔

میں اپنے دو گانیز کے پیچھے پیچھے ایک تابع فرمان عورت کی طرح چل رہی تھی لیکن ہر قدم کی وجہ سے چلنے میں دشواری پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی جالی میری نظر سے ٹکراتی اور سامنے کی چیزوں کو ٹھیک سے نہیں دیکھنے دیتی تھی۔ دل میں دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں گر پڑی یا ہر قدم سے میل نہ کھاتی ہوئی کوئی حرکت کر بیٹھی تو پکڑ لی جاؤں گی۔

چھوٹی لڑکی نے میرا ہاتھ دبایا تو میں ایک بار پھر بچوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے اس عورت کا خیال رکھنے اور

چھت کا پنکھا، فرالے بھر رہا تھا جس سے گرمی اور گھٹن میں کچھ کمی واقع ہو رہی تھی۔ اس منظر سے مجھے وائلڈ لائف کے بارے میں اپنے ایک پسندیدہ فلم یا آئی جو دریائی بلے کے پیار بھرے خاندان کی زندگی پر تھی۔ وہ ہر کام مل چل کر کرتے ہیں جو بہترین ٹیم ورک کا مظاہرہ ہوتا ہے اور پھر جب دن ختم ہوتا ہے تو سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر سو جاتے ہیں۔

مجھے ایک چارپائی دیدی گئی جس پر بڑا سخت قسم کا تکیہ رکھا ہوا تھا، اس طرح میں اپنی متبادل فیملی کے ہاں چند گھنٹوں کے لئے نیند کے آغوش میں چلی گئی۔ جب میں اٹھی تو چند لمحوں کے لئے مجھے اپنے ہوش و حواس اکٹھے ہوئے محسوس ہوئے، پھر معلوم آیا کہ میں کہاں ہوں، میں وہ سرحدی علاقے میں کسی گھرانے میں تھی۔ اپنے ارد گرد دیکھا سب میٹھی نیند سو رہے تھے۔ مجھے دوبارہ دریائی بلے کا خاندان یاد آیا۔ ڈیزی بھی اسی طرح پرسکون سو رہی ہوگی اور کتنی پیاری لگ رہی ہوگی۔ وہ چھوٹی موٹی سی ہے، ہم جہاں کہیں بھی ٹھہریں، خواہ کتنے ہی بیڈز اور بیڈرومز ہوں وہ ہمیشہ رینگتی ہوئی میرے ساتھ آسوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وینس میں جب ہماری پہلی رات آئی تو وہ پھلانگ کر میرے بیڈ پر آ گئی۔ میں نے کہا ”تو کب تک ممی کے بیڈ میں گھستی رہے گی؟“ وہ جھپٹتی ہوئی بولی ”غالبا“ جب تک میں تیس سال کی نہیں ہو جاتی۔“

میں نے آنکھیں گھماتے ہوئے اسے بوسہ دے کر سینے کے ساتھ چمٹا لیا تھا۔

جمعرات 27 / ستمبر کو صبح کے تقریباً پانچ بجے ہم اس عظیم پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ جسے کوہ ہندوکش کہا جاتا ہے، بارڈر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسکین نے مجھے بذریعہ پاشا بتایا کہ اس روڈ پر ڈاکو گروہ درگروہ پھرتے ہیں، صبح پھوٹنے سے پہلے اس پر سفر کرنا محفوظ نہیں ہوتا ہے۔

ہم پاکستان ہی کی حدود کے اندر تقریباً آخر میں ایک ڈیرے (فارم ہاؤس) میں پہنچ گئے۔ ایک عورت نے جس کی عمر 40 / 45 سال تھی، دروازہ کھول کر ایک وسیع صحن میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ جس پر اوپر فارم ہاؤس سے نظر پڑتی تھی۔ مرد لوگ کہیں چلے گئے اور اس عورت نے مجھے ایک چھوٹے سے بیڈ روم میں پہنچا دیا جس کے فرش پر پتھر لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے یہاں سو جانے کی ہدایت کی اور چلی گئی۔

میں لیٹی اور فوراً سو گئی، مگر اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی کیونکہ مجھے اپنی انگلیوں میں چاقو چھوئے جانے کا احساس ہوا، یہ ایک چوڑے کی کارستانی تھی جو صحن میں گھومتا ہوا اندر چلا آیا اور میری انگلیوں پر جو نیچیں مارنے لگا تھا۔ پتہ نہیں اس نے میری انگلیوں کو لہذا لہذا لے سمجھا تھا یا مجھے جگا کر کچھ غذا مانگ رہا تھا۔

عورت دوبارہ اندر آئی اور اس نے مسکراتے ہوئے، صوفے پر پڑے ہوئے روایتی افغان ڈریس اور نیلے ریشمی برقعے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے لباس تبدیل کر لیا اور مجھے مردوں کے رویے میں فوراً واقع ہونے والی تبدیلی پر حیرت ہوئی، حتیٰ کہ پاشا میں بھی تبدیلی سی آ گئی۔ جیسے کہ میں اب ان کے لئے قابل توجہ ہی نہیں رہی۔ کوپا کہ میں چند لمحوں کے اندر ایک اہم منصوبے کی انچارج مغربی عورت نہیں بلکہ ایک عام سی پٹھانی بن گئی ہوں اور اپنی حیثیت کھو بیٹھی ہوں۔ میں نے پاشا سے کہا کہ آؤ بیٹھ کر منصوبے پر ایک بار پھر غور کریں کیونکہ ہمارے ساتھ چند دوسرے افراد بھی سفر کر رہے ہیں۔ لیکن اس نے مجھے صرف اتنا کہا ”چلو“ گاڑی میں بیٹھو۔

ہم درہ خیبر میں سے گزرنے والی سڑک پر ہو گئے۔ میں ایک بار پھر ان انتباہی نشانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جاری تھی کہ ”غیر ملکیتوں کو اس نشان سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں۔“ پچھلی بار یہاں سے گزرتے ہوئے میرے پاس پولیٹیکل ایجنٹ کا اجازت نامہ تھا، اس بار نہیں تھا۔ بلکہ میرے پاس اپنا پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔

اس دفعہ ہمارے پاس دو کاریں تھیں اور ہم ایک عورت اس کے دو بچوں اور اس کے شوہر کو ساتھ بٹھانے کے لئے رُکے تھے، ان میں سے کوئی بھی انگریزی نہیں بول سکتا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، میں تو ان کے لئے پہلے ہی غیر اہم اور ناقابل دید ہو چکی تھی۔ آگے چل کر کاریں رُکیں اور مرد ایک لب سڑک کینے میں جا داخل ہوئے اور مجھے، اس عورت اور دو بچوں کو پچھلی نشست میں بیٹھے رہنے دیا۔

کھڑکیاں بند تھیں، مجھے برقعے کی گئی جالی میں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ برقع اب پریشگر کی طرح محسوس ہونے لگا تھا، سر بھاری لگتا تھا اور اس میں سے نکلتا ہوا پسینہ میری پشت کی طرف سرک رہا تھا۔

اگر میں انگلینڈ میں ایک ٹٹا ہوتی تو کوئی نہ کوئی ”ادارہ انسداد بے رحمی حیوانات کو فون کر دیتا یا کھڑکی پر اینٹ دے مارتا۔ میں زیر لب خود کو مطمئن کر رہی تھی اور جو بھی بے ادبی کے کلمات ذہن میں آرہے تھے ادا کر رہی تھی۔ مرد لوگ ہمیں آدھے گھٹنے کے لئے اس لعین کار میں جٹے بھننے کے لئے چھوڑ گئے تھے اور میں لفظوں کے ذریعے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ مرا جی چاہتا تھا کہ چھلانگ لگا کر باہر کود پڑوں اور مردوں سے جا کر پوچھوں کہ یہ کیا ہے ہو دگی ہو رہی ہے، مگر ایسا کرتی تو میرا سارا پردہ فاش ہو جاتا، پھر مجھے طالبان کا وہ آتش بار حکم یاد آیا ”اوچی آواز

اس کے دو بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ خواہش۔ مگر اب بہت کچھ داؤ پر لگ چکا تھا۔ میں غصے سے کھول رہی تھی کہ میں اس پر کیوں راضی ہو گئی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں نے مسکین کے سامنے ہتھیار کیوں ڈالے۔ وہ بہت جوش و خروش سے اپنی اس تدبیر کی وکالت کر رہا تھا اور اس کے نتیجے میں سب سے زیادہ بوجھ مجھے ہی اٹھانا پڑ رہا تھا۔

اسی نے میرا نانا مہجوز کیا اور ہم نے ایک جوڑے کے طور پر افغانستان میں داخل ہونے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ ہم اس کی گیارہ سالہ لڑکی کو بھی ساتھ لے لیں، لیکن اس میں نے اس کو مسترد کر دیا، میں اس کی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب میں دو بچوں اور ان کی ماں کے ساتھ تھی۔

جلال آباد کے اندر روانگی

گائیڈوں نے کوئی سودا بازی کی اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر جلال آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس روڈ کی اس سے بہتر تعریف کیا ہو سکتی ہے کہ اس میں جا بجا گڑھے تھے اور یہاں پڑی ہوئی روڑی کو کبھی تا رکول نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہم عقبی نشست پر بیٹھی مسلسل ہچکولے کھا رہی تھیں۔ میرا سر کھڑکی میں لگے ہینڈل سے بری طرح ٹکرا رہا تھا، اور اس میں درد شروع ہو گیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے گہری سانس کھینچی اور کار روک لی۔ اس نے سر نکال کر پچھلے پہلے کو دیکھا اور شور مچا دیا۔ وہ نیچے اترتا ہوا تھا، دونوں مرد بھی نیچے کود گئے۔ پچھلے نارووں میں سے ایک پنچر ہو چکا تھا اور وہ اس کی مرمت وغیرہ میں جُت گئے، تقریباً دس منٹ کے بعد ہم پھر روڈ پر تھے۔ میں ان کی مستعدی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی کہ انہوں نے کتنی جلدی پیہ پیہ تبدیل کر دیا تھا۔ ذرا آگے چلے تو اچانک دھم کی آواز آئی اور کار گھومتی ہوئی کچے راستے پر آ گئی جس پر پنچر اور روڑے پڑے ہوئے تھے، اب ایک اور پنچر ہو چکا تھا، واہری قسمت کہاں لا پھنسیا؟

وہ پھر پیہ پیہ بدل رہے تھے اور میں حیران ہو رہی تھی کہ ڈرائیور کتنے فالتو پہلے اٹھائے پھر رہا ہے؟ زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ دو پنچروں سے نمٹتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی پریشان نہیں ہوا۔ پھر بھی پانچ منٹوں کے اندر دو پنچر ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تقدیر قدم قدم پر میری راہ میں رکاوٹ ڈال کر مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔

بند و کش کے پہاڑی سلسلے کا پس منظر اچانک ہموار میدانوں میں تبدیل ہو گیا اور ہمارے سامنے وسیع کھیت پھیلے ہوئے تھے جن میں اناج اور کماؤ کی فصلیں کھڑی تھیں۔

یہاں سکڈ مزائل لانچروں کا نام و نشان تک نہ تھا جن کے بارے میں سنا تھا کہ ان کا رخ پاکستان کی طرف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہاں کسی فوجی سرگرمی کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ جو ملک عنقریب دنیا کی ایک زبردست جنگی مشین کے حملے کی زد میں آنے والا تھا، وہاں کسی قسم کی فوجی تیاریاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ البتہ میں نے بارڈر سے گزرنے کے فوراً بعد صرف ایک "MLRS" (ملٹی لانچ راکٹ سسٹم) دیکھا تھا، اور بس۔

اچانک ٹیکسی اچھلی، ڈمگانی اور گڑ گڑاہٹ کے ساتھ 50 کلومیٹر کی رفتار سے جلال آباد کی طرف دوڑنے لگی کچھ سکون ملا تو میرا سر جھولنے لگا، میں تھکاوٹ، نیشن اور داخلی بیجان پر تباہ پواتے پاتے نیند کی وادی میں گھوم رہی تھی کہ اچانک گاڑی رکنے کی وجہ سے میرا سر ہینڈ گرپ سے ٹکرا گیا، آنکھ کھلی تو خود کو جلال آباد کے مضافات میں پایا۔ اس دھچکے کی وجہ سے میری نظر گھومنے لگی، پھر معایا دیا کہ میں تو برقع پہنے ہوئے ہوں، مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔

نوے منٹ پہلے جب میں بارڈر عبور کر کے طالبان سپاہیوں کے پاس سے گزرنے لگی تھی تو میرا دل خوف سے بسیوں اچھل رہا تھا، اور اب جلال آباد پہنچی تو پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی، کیونکہ ہر دوسرا آدمی مجھے طالب دکھائی دے رہا تھا، اس لئے کہ ہر کوئی خطرناک ہتھیاروں سے مسلح تھا۔ جلال آباد میں دوڑ بھاگ لگی مچی ہوئی تھی، اس کے باوجود زندگی حیرت انگیز طور پر نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ ٹیکسی سے اتر کر میں اس عورت کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی مارکیٹ کے ایک کونے میں پہنچ گئی۔ وہ نہایت وقار و متانت سے پاؤں اٹھاتی اور خود کو ایڑیوں پر متوازن رکھتی تھی۔ مسکین جان نے میرے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا "بیٹھ جا"۔ (ایسا کرنا مغربی آداب کے بالکل منافی تھا) میں نے خود پر جبر کر کے حکم کی تعمیل کی مگر اپنی خاتون ساتھی کی طرح آہستگی سے نہ بیٹھ سکی بلکہ عقبی حصہ اس طرح گرایا جیسے آلوؤں کی بوری گرا دی جاتی ہے۔

مقام شکر ہے کہ ہماری اس مضحکہ خیز حرکت کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ میں نے خود سے مخاطب ہو کر کہا سب کی توجہ کا مرکز بننے سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟ مگر اس طرح مجھ میں پھر خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی جس سے میں یہ بھی اس اختیار کرنے کی وجہ سے محروم ہو گئی تھی۔

اب میں سب سے نچلی حیثیت سے مارکیٹ کے طور طریقوں سے آگاہی حاصل کر رہی تھی۔ اتار، موٹے موٹے سیبوں اور دیگر پکے ہوئے پھلوں کے سٹالوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، مجھے پھلوں سے کوئی رغبت نہیں جس کی وجہ سے میں ماں سے ہمیشہ جھڑکیاں سنتی رہتی تھی۔ لیکن یہاں تو تازہ اور خوشبودار پھل مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ میں وثوق سے کہتی ہوں کہ یہاں برطانیہ کی طرح کوئی ”جی ایم“ فوڈ نہیں ہوتا، یہاں کی ہر چیز قدرتی طریق کار کے مطابق اُگتی ہے، اور یہ بھی وثوق سے کہتی ہوں کہ ایسا فوڈ یہاں لایا جائے تو ملا عمر اسے ممنوع قرار دیدے گا اور اسے فروخت کرنے والے کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ میں زور سے ہنسنا چاہتی تھی مگر فوراً یاد آ گیا کہ میں کہاں ہوں یہاں تو خندہ زیر لب بھی وبال بن سکتا ہے۔

میری پنڈلیوں میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا، اور خود کو لڑکھڑاتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اپنی ساتھی خاتون کی طرف دیکھا، وہ پوری دلجمعی کے ساتھ بیٹھی تھی اس پر تنہا کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مجھے یاد آیا کہ مجھے ”پائیلیٹس“ کی کلاسوں میں داخلہ لے لینا چاہیے تھا۔ یہ ادارہ اس قسم کی مشقیں سکھاتا ہے جن سے جسم میں لچک بڑھتی ہے۔ میری دوست ڈانے روئے ڈیفرنز نے اس میں داخل لے رکھا ہے، وہ خطیر تنخواہ پر ملازم ہے اور لندن میں ازالہ عرفی کے مقدمات وکیل ہے، مشقوں میں غیر حاضری پر ”ٹریڈ“ کو خوشی خوشی جرمانہ ادا کر دیتی ہے۔ یہ ٹریڈ ایک مرد ہے اور ”مائیک دی ٹریڈ“ کے نام سے مشہور ہے۔

اس نے اب تک ان مشقوں سے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ جب اس پر اظہار خیال شروع کرتی ہے تو میں سن سن کر تھک جاتی ہوں۔ میں نے بھی چاق و چوبند رہنے کی مشقیں شروع کی تھیں، مگر میں ایک ہی قسم کی حرکت بار بار کرنے سے بہت بیزار ہوتی ہوں۔ ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ میری دوست ڈیفرنز جلال آباد کی مارکیٹ میں ہوتی تو سارا دن ایریوں کے بل بیٹھی رہ سکتی تھی۔ اتنے میں مجھے اپنے دونوں گائیڈ آتے ہوئے کھائی دینے، دل میں تشکر کے جذبات اُٹھ آتے۔ ان کے پاس کچھ پھل اور چاول تھے جو وہ خرید کر لائے تھے۔ پھر وہ میرے پاس سے سیدھے آگے نکل گئے، یعنی انہوں نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ مجھے صدمہ تو بہت پہنچا مگر میں اپنا خون جگر پی کر رہ گئی اور منہ بند رکھا۔ پھر میں ان کے پیچھے پیچھے گوشت کے سٹال کے سمت چل دی جہاں گوشت کم اور کھیاں زیادہ تھیں۔ گوشت کی ایک ران لکڑی کے فریم سے لٹک رہی تھی یہ غالباً بھیڑ کے بچے کی تھی۔ میں اپنے تپتے ہوئے برقعے میں سے کاؤنٹر پر رکھے ہوئی چیز کو اگر پہچان سکتی تھی تو وہ صرف قیمہ بنانے کے لائق تھی۔

میں نے ارد گرد دیکھا تو عورتوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی اور جو جرات کر کے باہر نکل آئی تھیں وہ سب برقع پوش تھیں۔ مردوں کیوں میں بے ہوئے تھے کچھ ایک کونے میں بیٹھے کافی یا سبز چائے کی چسکیاں لگا رہے تھے اور کچھ دوسرے کونے میں کوک پی رہے تھے۔ مردوں کی اکثریت نسوار کھا رہی تھی اور اسے زمین پر بار بار تھوک رہے تھے، اور ساتھ ہی حلق میں سے کچھ نفرت انگیز آواز نکال رہے تھے جسے کھنگرنا کہا جاتا ہے۔

میں سڑک کے کنارے ذرا اونچی سی جگہ پر بیٹھ کر اس اپنی مثال آپ قسم کی مارکیٹ کا بغور مشاہدہ کرتی رہی۔ تاہم میں اپنے آپ کو بالکل یکہ و تنہا پارہی تھی۔ گرمی سے دم گھٹا جا رہا تھا اور میں ہوا اندر کھینچنے کے لئے مسلسل منہ کھول رہی تھی جبکہ میرے گائیڈز مارکیٹ کا چکر لگا رہے تھے اور اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر چربی چبا رہے تھے اور سٹال والوں سے خرید و فروخت بھی کر رہے تھے۔

بالآخر وہ واپس آ گئے، اس وقت میں شدید غصے میں تھی اور میرا چہرہ ہمتار ہا تھا۔ لیکن برقعے کی وجہ سے انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نے واپسی کے لئے ایک اور تین پہیوں والی ٹیکسی لی جو رکشا والوں کے مخصوص ذوق کے مطابق کئی رنگوں سے سجائی گئی تھی۔ ہم کئی بازاروں میں گھومتے پھرتے رہے۔ بازاروں میں دوداؤں اور گاڑیوں کے سپئر پارٹس کی دکانوں کی بہتات تھی کپڑوں کی کوئی دکان دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی اور وہ یہ تھی کہ ملا عمر نے حکم جاری کیا تھا کہ عورتیں نئے کپڑوں کی خریداری نہ کریں کیونکہ قوم کو جہاد درپیش ہے۔ میری دوست ڈیفرنز جو نئے نئے کپڑوں کی شوقین (Clothesaholic) ہے، ایسے ملکوں میں کب جی سکتی ہے وہاں یہاں ہوتی تو شہروں کو چھوڑ کر کھیتوں اور پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلتی۔

بعد ازاں ہماری پارٹی دو ٹیکسیاں ایک پبلی اور ایک سفید، لے کر جلال آباد سے چارمیل، مشرق کی جانب نکل گئی۔ چلتے چلتے ڈرائیور نے کارعین راستے میں روک لی، ہم نکل کر باہر آ گئے۔ میں نے پوچھنا چاہا، کہ یہاں ہم کیوں

ر کے ہیں اور مقصد کیا ہے؟ مگر مجھے ”کوگی بہری ہونے“ کا کردار نبھانا تھا۔ میں چیخنا چاہتی تھی ”ارے کوئی تو بتاؤ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ مگر دونوں عورتیں میرے قریب سے گزر کر آگے جا رہی تھیں، میں انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔

مجھ پر عنقریب انکشاف ہونے والا تھا، ہم ”کاما“ نام کے ایک گاؤں کی طرف جا رہے تھے یہ ایک چھوٹی سی اور انتہائی غیر نمایاں جگہ تھی مگر آگے چل کر میری زندگی پر نہایت اہم اثرات مرتب کرنے والی تھی۔

اہم صوٹ

افغانستان میں کھیت سرسبز و شاداب تھے۔ غلے اور کما کی فصلیں لہلہا رہی تھیں، طورخم بارڈر کے قریب ہم نے جو فصلیں دیکھی تھیں، یہ ان کی نسبت زیادہ صحت مند تھیں۔ ہم ایک کھیت میں بنی ہوئی تنگ اور پریچ پگڈنڈی پر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے، جبکہ میں آخری سرے پر تھی۔ میرے لئے برقعے کی جالی میں سے سامنے یا ادھر ادھر دیکھنا ممکن نہیں تھا میں صرف اگلوں کی ایڑیوں کو دیکھتی ہوئی تنگ راہ پر چل رہی تھی۔ کسی اور جانب دیکھتی تو پاؤں اٹنا پڑ جاتا، اور ننھے میں موج آ جاتی تو میرا سارا کھیل بگڑ جاتا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا، کہ اسامہ بن لادن کے بیس (Base) کیمپوں میں سے کئی ایک اس خطے میں ہیں لیکن فی الحال میرا سارا دھیان ان میزے میزے راستوں پر تول تول کر پاؤں رکھنے کی طرف تھا، اس کے کیمپوں کے بارے میں کیسے سوچتی؟ میں زیادہ تاک جھانگ اس لئے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میں کہیں دیکھنے والوں کی نظر میں مشکوک نہ قرار پا جاؤں۔ یہ بات یقینی تھی کہ دنیا سب سے زیادہ مطلوب شخص یہاں سے چند میل دور موجود ہے، اگر وہ اس وقت چند فٹ ہی دور ہوتا، میں تب بھی اس کا نوٹس نہیں لے سکتی تھی۔

یہ سوچتے سوچتے ہم پیدل چلنے والوں کے لئے بنے ہوئے ایک تنگ پل کے قریب پہنچ گئے جو ندی کے اوپر کمان کی طرح معلق تھا۔ اسے پار کرتے ہی مٹی کی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی دیواروں والے گھر وندوں پر مشتمل ایک افغان بستی تھی جس کا نام ”کاما“ بتایا گیا۔

اتنے میں گاؤں کی گزرگاہ میں سے ایک عورت تقریباً دوڑتی ہوئی نکلی اور سب کو چومنے اور گلے لگا کر مانے لگی، اور مجھے بھی اسی گرمجوشی سے چوما اور مجھے اپنے ساتھ چمٹایا، میری سمجھ سے باہر ہے کہ اسے ہماری آمد کے وقت کا بالکل صحیح اندازہ کیسے ہوا؟ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نے مجھے کیا سمجھا لیکن وہ ایسے ملی جیسے اس کی کوئی گم شدہ رشتہ دار ہوں۔ ہمارے ساتھ والی دونوں ننھی لڑکیاں وسیع صحن میں کھڑے بچوں کے ہجوم میں جا شامل ہوئیں اور مل کر کھیلنے لگیں۔

صحن کی ایک دیوار کے ساتھ ملحق ایک چمپر بنا ہوا تھا جس کے نیچے کھانے پکانے کا سامان چولہے دیگے اور توتے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ دوسری جانب پانی کا ناکا تھا جس میں سے ہینڈل بلا کر پانی اوپر کھینچا جاتا تھا۔ اس کے پاس کچھ میزے میزے برتن گا گرین اور منکے پڑے تھے۔

میری ہمراہی عورت مجھے بازو سے کھینچتی ہوئی ایک بڑے کمرے میں لے گئی جس میں افغانوں کا روایتی تالین بچھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد بچھونوں اور تکیوں کی قطاریں لگیں تھیں۔ اس نے ایک طرف رکھے ہوئے خوبصورت گدے کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بے حد تنگی ماندہ تھی، میں نے برقع اٹھایا اور گدے پر بیٹھی تو اولگھ آ گئی۔ یہاں سونا مجھے خود بھی آداب مجلس کے خلاف محسوس ہو رہا تھا مگر گرمی میں طویل سفر کیا تھا اور دو دن آرام کی نیند نہیں سو سکی تھی۔ چنانچہ میں موقع ملتے ہی سونے لگی۔

گونگے بن کا راز فاش

باہر کافی شور و غل تھا، دوست اور رشتہ دار آ رہے تھے، سلام دعا اور خیر مقدمی الفاظ کا تبادلہ ہو رہا تھا، میں آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی کہ شور کے باوجود ابھی چند لمحوں میں نیند کی وادیوں میں کھو جاؤں گی۔ جب نیند غالب آ گئی تو بمشکل ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ایک نوجوان میرے پاس گھٹنوں جھکا ہوا، مجھے جگا رہا تھا۔ میں خوف سے ٹھنڈی پڑا گئی کیونکہ وہ مجھ سے انگلیں میں بات کر رہا تھا۔

میں نے جلدی سے برقع چہرے پر لیا اور اٹھ بیٹھی، ابھی تک میں خاموش ہی تھی۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا، ”خیر ہے، خیر ہے، میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، یہ مجھے مسکین جان نے بتایا ہے۔ میرے خیال میں تم نے یہاں تک پہنچ کر ایک باہمت عورت ہونے کا مظاہرہ کیا ہے برقع اتار دو، آؤ باتیں کرتے ہیں۔“

تاہم میں خاموش رہی اور سوچتی رہی کہ پتہ نہیں اسے مسکین جان نے اور کیا کیا بتایا ہے؟ پھر اتنے میں مسکین جان اندر آ گیا اور بولا ”میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ یہاں تمہارے بات چیت کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔“

مجھے اس پر شدید دھچکا لگا، میں ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی کہ میرے کوگی بہری ہونے کا پردہ تو چاک ہو چکا ہے، میں نے برقع ہٹایا، سر پر سے سکارف بھی کھینچ لی اور خشم آلود نگاہوں سے مسکین جان کو دیکھا۔

میں نے پوچھا کہ کیا میں آپ لوگوں کی ایک تصویر اتار سکتی ہوں۔ میں نے کیمرہ نکالا تو نوجوان سختی سے بولا "طالبان تصویریں بنانے کی اجازت نہیں دیتے" چنانچہ میں نے کیمرہ نیچے رکھ دیا اور پوچھا کہ طالبان اور کیا کیانا پسند کرتے ہیں؟ ایک نوجوان عورت جس کی عمر تقریباً 25 سال ہوئی، بولی کہ وہ ہماری تعلیم کے مخالف ہیں۔ اس کی کہی ہوئی باتوں کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے میرے گائیڈ کے بھتیجے نے کہا کہ "یہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی کہ طالبان نے عورتوں کی تعلیم فوراً ممنوع قرار دے دی۔"

ڈاکٹر بننے کی اس خواہشمند عورت کے چہرے مہرے پر مشکلات جھیلنے اور مشقت کی زندگی بسر کرنے کے اثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق افغانستان میں کینسریرویمین کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ گویا کہ وہ یہاں ہوتی ہی نہیں۔ وہ اس بات پر شکرگزار تھی کہ میں اس کی ذہانت کو تسلیم کرتی ہوں۔ مجھے اس کے اور اپنے جذبات کی ہم آہنگی کا واضح طور پر احساس ہو رہا تھا، باوجود اس امر کے کہ ہم دونوں مختلف دنیاؤں کی باسی تھیں اور ایک دوسری سے بالکل مختلف ثقافتوں اور پس منظر کی حامل تھیں، ہمارے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی جیسی تھیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ ایسی زندگی اگر مجھے بسر کرنا پڑتی تو میں کیسے گزارا کرتی۔ یہ گزارا تو نہیں، محض زندہ رہنے کی بات ہوتی۔ میں اس گاؤں، "کاما" کے لوگوں کے حالات سے بہت متاثر ہوئی، یہ بے چارے کتنے ہمدرد اور فراخ دل و ملنسار تھے۔ ان سے جو باتیں ہوئیں اور ان کے جو جذبات معلوم ہوئے ان سے پتہ چلا کہ وہ امریکا کی ممکنہ کروائی سے خوفزدہ نہیں ہیں، تاہم وہ پرامن نتائج کے لئے دعا کر رہے تھے اور اپنی آزادی کے تحفظ کی خاطر لڑائی کے لئے پھر بھی تیار تھے۔

مصری عورتوں کو افغان عورت کا طعنہ

برقع پوش افغان عورتیں اگرچہ مسکین اور اطاعت شعار دکھائی دیتی ہیں لیکن "کاما" کی عورتیں مضبوط، پُر جوش اور حوصلہ مند تھیں۔ ایک عورت نے جس کی بھوری آنکھیں حیرت انگیز حد تک بادامی اور رخساروں کی ہڈیاں بہت نمایاں تھیں، مجھ سے پوچھا کہ میرے کتنے بچے ہیں، میں نے کہا "ایک بچہ ہے" تو اس نے شرارت آمیز انداز میں اپنے خوبصورت ہاتھ کلوہوؤں پر رکھتے ہوئے میرا جواب دوہرایا "صرف ایک؟ پھر بولی۔ ہا!" تم انگریز اور امریکی عورتیں صرف ایک ایک اور دو بچے جتنی ہو، میں پندرہ بچوں کو جنم دے سکتی ہوں۔ جب تم اپنے سپاہی لڑکوں کو لڑائی میں بھیج کر ختم کر بیٹھو گی، ہمارے بچوں کی تعداد کتنی ہی بڑھ چکی ہو گی، ہمارے بچے بدوقیں پکڑے ہوتے ہیں، یہ زبردست لڑاکے ہوتے ہیں، اور لڑتے لڑتے مرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اگر مجھے لڑائی لڑنا پڑی تو میں خود بھی لڑوں گی اور وہ بھی، جو سامنے کھڑی ہے "اس نے اپنی انگلی سے سامنے کھڑی ایک بڑھیا کی طرف اشارہ کیا، جس کے منہ میں دانت نہیں تھے مگر اس کی مسکراہٹ دلیری سے عقلمندی کی غمازی کر رہی تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ یہ بڑھیا تقریباً سو سال کی ہے اور اس نے کئی جنگیں دیکھی ہیں۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کچھ کہا، جس پر سب ہنس پڑیں۔ میرے خیال میں اس نے یہی کہا ہوگا کہ وہ امریکی سپاہیوں کا مقابلہ کرے گی اور کوئی بھی افغانوں پر فتح نہیں پاسکتا۔ اس پر مجھے ایک مشہور کہاوت یاد آئی۔ "ایک افغانی کو ہر کوئی کرائے پر لے سکتا ہے مگر اس کا کامک نہیں بن سکتا۔"

اس دوران بھوری بادامی آنکھوں والی عورت مرکزی حیثیت اختیار کر چکی تھی، اس نے جونوان مترجم کی وساطت سے کہا "ہم نے نیویارک کے واقعات کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، اتنے بے گناہ لوگوں کو ہلاکت پر ہمیں بہت افسوس ہے، مجھے امید ہے کہ امریکا ہم پر بم چھینکنے سے پہلے دوبار سوچے گا، اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا، ہم اس نے ڈرنے والے نہیں ہیں۔"

مجھے یقین ہے کہ اس نے جو کچھ کہا، وہ ان سب کے جذبات کو صحیح ترجمانی تھی۔ اس کا خیال بھی صحیح تھا مگر امریکی اقدام کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کے پیمانے کا یہ لوگ صحیح تصور نہیں کر سکتے تھے جو بعد میں دنیا بھر کے ناظرین ٹیلی ویژن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ درست ہے کہ افغانستان کے لوگ ٹی وی پر یہ مناظر اس لئے نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ ان کے ہاں ٹیلی ویژن پر پابندی ہے، دنیا کے ان فراموش کردہ علاقوں میں خبریں یا تو زبانی کھیلتی ہیں یا ریڈیو سے نشر ہوتی ہیں۔

واقعی یہ لوگ ان بھیاںک مناظر کو نہیں دیکھ سکے، جنہیں دیکھ کر ہم زندگی بھر کے لئے جذباتی طور پر مجروح ہو چکے ہیں۔

زیادہ تر افغان اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ وہ اپنے سروں پر مکان کی صرف ایک چھت کا تصور کر سکتے ہیں، ان کے ملک میں زیادہ تر ایک منزلہ مکان ہوتے ہیں، اگر آپ انہیں کہیں کہ یہ اپنے مکان پر سو منزلوں کا تصور کریں تو

یہ ان کے تصور کے لئے ایک چیلنج بن جائے گا۔

بہت سے بالغ لوگ ایک ایک کر کے جا چکے تھے لیکن نوجوان مترجم مجھ سے باتیں کرتا رہا، اس نے نہایت مغموم لہجے میں اعتراف کیا ”میرے لئے اس ملک میں کچھ بھی نہیں، ہم لوگ بے حد غریب و نادار ہیں، میرے لئے اس غربت سے چھٹکارا پانا اور اپنی خواہشات کی تکمیل بے حد مشکل کام ہے، سب نوجوان احساس محرومی سے دوچار ہیں، ہم خواہشیں پالنے کے تحمل ہی نہیں ہو سکتے۔“

اس کے آخری جملے نے تو مجھے ڈس لیا۔ ہر کسی کی کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے اور اسے خواہش رکھنی بھی چاہیے، یہ بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ یہی تو بندے کو حرکت میں لاتی ہے۔ طالبان ان کے لئے آسانیاں کیوں نہیں پیدا ہونے دیتے، انہیں آسانی سے سانس لینے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ غالباً ان کی تحریک چند بہترین خواہشوں کا ہی ایک مظہر تھی، لیکن کسی وجہ سے یہ تحریک اپنا راستہ بھول گئی تھی۔

یہاں کی عورتوں کے خد و خال بے حد متاثر کن تھے، مجھے اچانک خیال آیا، جو اس لمحے تک کا خیال تھا، کہ افغان عورتیں یہ نہیں اصل میں کیسی لگتی ہوں گی، یعنی وہ برقعے کے نیچے کیسی پائی جاتی ہوں گی؟ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اتنی ہی پرکشش سمجھتی ہوں گی جتنی کہ میں انہیں اس وقت پرکشش و مسحور کن پارہی تھی۔ جب میں نے اپنا برقع اتارا تو مجھے اس پر اپنے بالوں کو لگاتے ہوئے رنگ کے سیاہ داغ لگے دکھائی دیئے۔ بہتر حالات میں یہ رنگ کافی پختہ ہو سکتا تھا، لیکن جلد دینے والی گرمی برقعے میں بندھے ہونے اور میرے پسینے نے میرے بالوں کا رنگ اڑا کر رکھ دیا تھا اور وہ سوکھے ڈٹھل (Straw) کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ تاہم شکر ہے کہ میرے سکارف نے زیادہ تر بال بچا لئے تھے۔

جس عورت نے اپنے آپ کو بچے جنمے کی انتھک اور ناقابل تسخیر مشین کے طور پر پیش کیا تھا، اس نے مجھے کھینچ کر کھڑی کر دیا اور باہر کھانا کھلانے کے لئے لے گئی۔ ان کی فخر اخذی اور فیاضی اگرچہ مسلمہ ہے لیکن ان کے پاس بے کچھ نہیں۔ اس وقت جو کچھ بھی ان کے پاس تھا وہ نہایت خوشدلی سے مجھے اس میں شریک کرنا چاہتی تھیں۔

مجھے چاول، شوربا اور گرم گرم روٹی کھائے کافی عرصہ ہو چکا تھا اور انہیں گرم گرم حالت میں کھانے کا بہت شوق تھا۔ سب عورتیں انگلیوں کے ماہر اند استعمال سے چاول کھا رہی تھیں، میں نے بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے یہ چیزیں کھائیں۔ میزبان نے مجھے ایک ابلا ہوا بھٹ پکڑا دیا۔ وہ اتنا گرم تھا کہ مجھ سے گر گیا میں نے بلکی سی چیخ ماری اس پر اس نے قہقہہ لگا دیا اور دوسروں کو متوجہ کر کے کہا مغرب کی عورتیں کتنی نازک ہوتی ہیں، مجھے ان کے احساسات کا ان کے اشاروں سے انداز ہوا۔

پھر اس نے بھٹ ایک پرانے کپڑے سے جھاڑ کر مجھے دوبارہ پکڑا دیا، مجھے معلوم تھا کہ اسے کھانے سے انکار آداب مہمانی کے منافی ہے، اس لئے میں نے ”بشق“ کھا لیا۔ کھانے کے بعد مجھے گنے کا ایک ٹکڑا دیا گیا، میں نے دوسروں کو اسے دانتوں سے چھیل چھیل کر کھاتے دیکھا تاہم یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ اس کا صرف رس چوستی تھیں اور خشک پھوگ زمین پر پھینک رہی تھیں جب کہ میں اسے ٹکٹے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ میں نے ان کی فیاضی شفقت سے بہت متاثر ہوئی۔

اچانک جان نے مجھے سڑک کی ایک جانب ہونے کی ہدایت کی اور پھر میرے کندھے کو تھپتھا کر دہی آواز میں کہا ”بیٹھ جاؤ“۔ میں نے یہ سمجھ کر اس کے حکم کی تعمیل کی کہ حرامزادہ اب بارڈر پر پہنچ کر اپنی دانش بگھارنے لگا ہے۔ میں تو برقع جلا دینے کی مہم شروع کرنے والی تھی جیسا کہ 1960 کے عشرے میں عورتوں نے اپنی اپنی انگلیا جلا دینے کی مہم شروع کر دی تھی۔

میں اپنی ساتھی عورت اور اس کی دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی۔ ہم نے بچوں کے بل خود کو متوازن کر کے اپنے نچلے حصے کو ایڑیوں پر ٹکایا ہوا تھا، یعنی چاروں دوشیزائیں ایک قطار میں بیٹھی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد دونوں گائیڈ واپس آئے ان کے چہروں پر سخت نمایاں تھی اور خاموش تھے۔ ہم کھڑی ہو گئیں، انہوں نے اس عورت سے کچھ کہا، ہماری پارٹی واپس مڑ کر ایک سیلون نامی بار کی طرف چل پڑی جس میں اب اکھل نہیں پلائی جاتی تھی۔

وہاں لوگ آ جا رہے تھے اور مشتعل نظر آ رہے تھے۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں اندھیرے میں، اپنے برقعے کی جالی میں سے اپنی نظر کانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم چھ افراد ایک تالین سے مزین کمرے میں داخل ہوئے، مگر اس میں کھڑکی تھی، نہ پنکھا اور نہ روشندان۔

میں نے اپنے برقعے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور میں نے جان سے کہا۔ ”دیکھو، تمہارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ میرا منصوبہ اور میرا اپنا کام ہے، میں تم دونوں کو ہدایت دے رہی ہوں۔ جب میں تمہیں کہوں کہ چھلانگ لگا دو، تو تمہیں لگا دینی چاہئے لیکن تم تو پیچھے مڑ کر مجھ سے پوچھتے ہو کہ کتنی اونچی لگاؤں۔ اگر تم نے مجھ سے روپے لینے ہیں تو تمہیں میرا کچھ احترام کرنا ہوگا۔ اب اسے یہ بات بتاؤ“ ساتھ ہی میں نے اس جوڑی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

جان نے میری گفتگو انہیں پہنچا دی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس نے بات ان کے بالکل ٹھیک گوش گزار کر دی۔ کیونکہ اس شخص کا چہرہ تنا ہوا تھا اور وہ مجھے بہت گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کوئی جواباً کچھ الفاظ کہے جس پر ان کے درمیان سخت تکرار شروع ہو گئی۔

جان نے واپس آ کر کہا ”اپنی آزاد جیسی رکھو، ورنہ لوگ تم پر شک کرنے لگیں گے۔ یہاں ایک مسئلہ کھڑا ہو چکا ہے، پاکستان نے سرحد بند کر دی ہے، اب کوئی پتہ نہیں کہ یہ دوبارہ چنانچہ ہمیں کوئی متبادل راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ کل ہم اس راستے سے چلیں گے جس پر سب گھر سفر کرتے ہیں اور سہ پہر تک پاکستان پہنچ جائیں گے۔ دریں اثناء ہم نے اس ہوٹل کا ایک کمرہ بک کر لیا ہے۔“

میں غم اور غصے سے ٹر رہی تھی، میں اپنی سلامتی کے لئے بھی مشکور تھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ میں خود کو تابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑاتی ”میں اب ایسا کیوں سن رہی ہوں؟ تم نے یہ الارم پہلے کیوں نہیں بجادیا تھا، مجھے یہ سب منظور نہیں، ہمیں یہاں سے الگ الگ راہ لے لینی چاہئے، یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر طالبان اس وقت ہمارے تعاقب میں نہیں تو صبح ہمیں آپکڑیں گے۔ گاؤں کے کسی آدمی نے ہماری مخبری کر دی ہوگی۔“

جان پریشان ہو گیا کیونکہ اسے دکھائی دے رہا تھا کہ میں برہم ہو چکی ہوں، وہ بولا ”پریشان نہ ہوئے۔ گاؤں کا کوئی آدمی ہم سے دنا بازی نہیں کرے گا۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیے، آپ رات کے ان لمحات میں اکیلی کہیں بھی نہیں جاسکتیں۔ اور نہ ہی دن کو کہیں جاسکتی ہیں۔“

میں فوراً جواب دیا ”یہ بڑا خوفناک دور ہے، گاؤں کا کوئی بھی شخص حکومت کی نظر میں جتنے کے لئے طالبان کو اطلاع دے سکتا ہے۔ اگر وہ ہمارے متلاشی ہوئے تو وہ دوسروں، دو عورتوں اور دو بچوں کو یکجا تلاش کر رہے ہوں گے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ ہمیں ضرور منتشر ہو جانا چاہیے اور اس فیملی کو چھوڑ دینا چاہیے اس طرح ہم محفوظ ہو جائیں گے۔“

وہ پھر گائیڈ کی طرف متوجہ ہوا، دوبارہ کچھ بات چیت کی اور اس میں پھر تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا، بعد میں دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ مجھے کسی کا یقین نہیں آ رہا تھا، وہ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر غائب رہے۔ انتظار کے سوا کیا کر سکتی تھی؟ میں نے انہیں بہت سی باتوں کے علاوہ اس ”آپریشن“ کی بھی اہمیت سے آگاہ کیا اور اس کی ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے مسائل بھی بتائے مگر انہوں نے ایک کان سے بات سنی، دوسرے کان سے اڑادی۔ بلکہ مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میں ایک کونے میں ناگ پر ناگ رکھ کر بیٹھ گئی اور برقعے کو عبا کے ٹوپ کی طرح سر پر لے لیا۔

میں نے ساتھی عورت اور اس کے دو بچوں پر نظر ڈالی اس کی عمر تیس سال کے بگ بھگ تھی۔ لیکن ایک افغان عورت کی پر مشقت زندگی نے چہرے کی جھریوں کی صورت میں اپنے اثرات مرتب کئے تھے۔ شکل و صورت اچھی حاصی تھی، مسکراہٹ بہت دلاویز اور دیکھنے کا کافی معاملہ فہم اور زیرک لگتی تھی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ اس بدھوشوہر کے

ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً بارہ سال تھی وسیع خشک صحن میں لگے ہوئے نلکے سے پانی نکال نکال کر جھوٹے برتن پلٹیں اور دیکھیں وغیرہ دھورہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ساتھ والے گھر سے ایک نوجوان دیوار پر سے اسے اشارے رہا ہے۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ شور کیوں مچا ہوا ہے، کیونکہ کھانا کھانے کے بعد سب عورتیں اور بچے اونچی اونچی آواز میں ٹھٹھاند اق کر رہے تھے۔ ایسی تانک جھانگ کو طالبان برداشت نہیں کرتے۔ میں اس لڑکی کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں اسے دیکھ رہی تھی تو وہ پریشان ہو گئی اور میں نے خوف کی لہر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سے سرایت کرتے ہوئے پایا۔

میں اسی وقت جان اپنے ہاتھ میں کیمرہ لئے صحن میں آ پہنچا اور تصویریں بنانا شروع کر دیں، پھر ”نہیں نہیں“ کا شور مچا، لیکن اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں رات کو یہاں قیام کروں گی، میں نے جواب دیا، نہیں، ہم واقعی جانا چاہتے ہیں۔

دلی طور پر تو میں ٹھہرنا چاہتی تھی کیونکہ وہاں جس دم میں مبتلا کرنے والے لباس سے آزادی ملی ہوئی تھی مگر میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ مجھے یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو، نکل جانا چاہیے۔ میں اب تک بھی اپنے گائیڈوں سے رڈ قدح نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی ان کے فیصلے کا انتظار کر سکتی تھی کہ وہ کب تک یہاں سے روانگی مناسب سمجھتے ہیں۔

تاہم خدا خدا کر کے روانگی کا وقت آ گیا، ہم چھ افراد ایک تین فٹ اونچے، ”راستے“ سے باہر نکل آئے، میرا خیال ہے کہ یہ کوئی ”چور راستہ“ (Escape route) تھا جو اس وقت استعمال کیا جاتا ہوگا جب ہمسایوں سے یا ناپسندیدہ ملاقاتیوں سے آنکھ بچا کر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ ہم پیچھے ہٹ کر ایک پگڈنڈی پر کھڑے ہو گئے اور ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے جو تقریباً چالیس منٹ کے بعد آ گئی۔ پتہ نہیں ڈرائیور کو کیسے اندازہ ہوا کہ ہم انتظار میں کھڑے ہیں، یا وہ اتفاقاً ادھر آ نکلا تھا۔ جان اور اس کا چچا روڈ کراس کر کے کسی واقف کار سے باتیں کرنے لگے لیکن اس سے پہلے اس نے میرا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ ”چلو بیٹھ جاؤ۔“

ٹیکسی میں بیٹھ کر کچھ سکون محسوس ہوا، میں جلد پاکستان پہنچ جانا چاہتی تھی گاؤں میں جو کچھ پیش آیا تھا، اس کی وجہ سے میرے اعصاب پر بہت بوجھ پڑا اس لئے میں نے افغانستان میں گھومنے پھرنے کا عرصہ کم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اگرچہ اب میرے پاس مواد میرے توقع سے کہیں زیادہ جمع ہو چکا تھا۔ میرے اس منصوبے کے مطابق جلال آباد میں مسکین ہی کو میری آنکھوں اور کانوں کا کام دینا تھا اور دونوں کے بعد جب ہم پاکستان جاتے تو وہ ہر سنی اور ہر دیکھی ہوئی بات پاشا کوسنا تا اور پاشا مجھے بتاتا، پھر ان خاکوں میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں رنگ بھرتی، اس طرح ایک جامع فچر تیار ہو جاتا۔

یہ لگتا تو نہیں کہ تاریں اخبار کو اندازہ ہو جائے کہ ان کے ناشتے کی میز پر پڑے ہوئے اخبار میں چھپی ہوئی تازہ ترین خبریں تلاش کے لئے پس پردہ (Behind the scene) کس طرح کام کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ہر سنوری کے پیچھے ایک سنوری ہوتی ہے جو اخبار میں چھپے ہوئے الفاظ کی یہ نسبت زیادہ سامان تفریح فراہم کرتی ہے۔

اس سڑک پر سر بڑا جو کھوں کا کام تھا، ہم مسلسل دھکے کھا رہے تھے کوئی ہچکولا ہمیں ایک طرف دھکیل دیتا اور کوئی دوسری طرف لڑھکا دیتا، ان دو میں سے چھوٹی لڑکی نے رونا شروع کر دیا اور دوسری بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ اسے کیسے سونا نصیب ہوا اس کا مجھے کوئی پتہ نہیں۔

میں نالٹ جانا چاہتی تھی، کاش مجھے یہ ضرورت گاؤں میں ہی پڑ جاتی اور اس سے فارغ ہو کر گھر سے روانہ ہوتی۔ طورخم کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے دیکھے تمام نقوش کو ذہن میں محفوظ کر رہی تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں اس ملک میں کبھی دوبارہ نہیں آ سکوں گی۔ ہاں یہ بالکل درست ہے کہ یہ بہت اچھے لوگ ہیں اور حد درجہ بھلے انسان ہیں، لیکن خود اس ملک نے میرے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔

جب بالآخر ہم طورخم پہنچ گئے تو سورج غروب ہو چکا تھا، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ کتنے بجے کا وقت ہے، کیونکہ میں اپنی گھڑی ہوٹل کے سیف میں چھوڑ گئی تھی، میں کوئی بھی قیمتی چیز ساتھ نہیں لے گئی تھی، نہ رقم نہ بندے، نہ جیولری اور نہ پاسپورٹ۔ آخری چیز جو میں چاہ سکتی تھی وہ یہ ہو سکتی تھی، میں کسی لڑاکا قبائلی گروہ کے ہاتھوں اغوا ہو جاتی اور وہ میرے پاسپورٹ چوری کر کے مجھے کوئی شرط منوانے کے لئے بطور مہرہ استعمال کرتا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہا، اگر مجھے طالبان پکڑ لیں تو زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ مجھے پانسی دیدیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے اس کا روانی سے پہلے میری سنوری سن لی تو میں کہوں گی کہ میرا پاسپورٹ اسلام آباد ایم بیسی میں ویزا کے لئے دی گئی درخواست کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ ایک غیر متعلقہ دلیل ہوتی کیونکہ ہم طورخم میں تھے، جو بارڈر سے تھوڑا سا ہی دور ہے۔

ساتھ کیا کر رہی تھی، شاید اس وجہ سے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے، یہ بھی آپس میں بندھ گئے ہوں گے۔ میں بھی تو زندگی میں محبت کے کئی کھیل، کھیل چکی ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ”ہیرو“ کچھ پینے کی چیزیں لئے واپس آ گئے۔ میں نے کھانے سے انکار کر دیا، مجھے نالٹ جانے کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی، دن بھر نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے جان سے پوچھا کہ مجھے اس کے لئے کہاں جانا ہوگا۔ اس نے مجھے باہر لے جا کر سڑک کے پار اندھیری سی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے تو وہاں کچھ نظر نہ آیا، پھر خیال آیا کہ اس کا مطلب نیچے کھائی میں اتر کر اندھیرے میں پیشاب کرنے سے ہوگا۔

پتہ نہیں اس وقت میرے اندر یہ طاقت کہاں سے آگئی کہ میں نے اپنے مٹانے کو مکمل کنٹرول میں رکھتے ہوئے، وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ افغانستان میں سانپوں پھوؤں اور دیگر زہریلے کیڑوں کی بہتات ہے، میں ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

میں تیزی سے واپس جا رہی تھی اور جان نے سرکوشی کے سے انداز میں مجھے آہستہ چلنے اور اس کے پیچھے پیچھے آنے کے لئے کہا، میں اکثر بھول جاتی تھی کہ مجھے ایک ”افغان“ عورت کی چال و حال اختیار کرنی چاہیے۔ واپس آ کر میں ایک کونے میں ڈھیر ہو گئی۔ مجھے میرے ہاتھوں پر مسلسل کاٹتے رہے، کیونکہ وہ ڈھکے ہوئے نہیں تھے۔ رات بہت آہستہ گزر رہی تھی، میں سونے کی کوشش کرتی رہی مگر ماحول کی کراہٹ اور خوف نے مجھے جگائے رکھا۔ میں سوچتی رہی میرے دفتر کا ہر فرد کام پر مڑے سے آتا ہوگا اور پھر ڈیوٹی پوری کر کے گھر چلا جانا ہوگا پتہ نہیں کسی کو میرے اس مختصر سفر افغانستان سے کوئی دلچسپی ہوگی یا نہیں؟ میرا آخری ٹیکسٹ میسج کیتھ پیری کی طرف سے تھا جس کے الفاظ یہ تھے: ”جم کہتا ہے کہ تمہیں محتاط رہنا چاہئے، ہم تم سے محروم نہیں ہونا چاہتے..... کیتھ“

میرا فون پاشا کے پاس رہا تھا، میں نے اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ میری ماں نے کوئی کال کی تھی۔ کیا اسے یہ احساس ہو چکا ہے کہ وہاں کے معاملات بگڑ بھی سکتے ہیں۔ مجھے جاس (ماں) کو یقیناً بتانا پڑے گا کہ میں کہاں تھی اور وہاں کیا کرنا چاہتی تھی، کیونکہ وہ ہر اتوار کو اخبار پڑھتی ہے، اس سے اسے جلدی پتہ چل جائے گا، غالباً وہ آسمان کی طرف آنکھیں گھماتے ہوئے شکریہ ادا کرے گی کہ اچھا ہوا کہ اسے میرے باہر آ جانے کے بعد پتہ چلا ہے کہ میں کہاں گئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے کہے گی۔ ”اچھا ہوا کہ تم نے سوچنے والے دماغ کی مالک ہونے کا ثبوت دے دیا ہے، اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو تمہارا باپ اور میں اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ ڈیزیز کی نگہداشت اور پرورش ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔“

اس مسئلے پر سال کے شروع میں، میں واقعی سوچ بچار کر چکی تھی اور ڈیزیز کی ایک خصوصی انشورنس کرا دی تھی کہ اس کی پرائیوٹ تعلیم اس کی عمر 18 سال ہونے تک جاری رہے گی۔ میں وقت گزرنے کے بعد کف افسوس ماننے والے لوگوں میں سے نہیں، میں عمل یقین رکھنے والوں میں سے ہوں۔

پھر میں اگلے ہفتے کے پروگرام کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے قندھار جانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں نے اس ٹرپ کے لئے جن دو گائیڈز کی خدمات حاصل کی ہیں، انہیں آئندہ اپنے رہبر نہیں بناؤں گی، ان کا کوئی ضابطہ کار نہیں ہے بلکہ یہ گستاخ بھی ہیں۔ غالباً انہیں کسی نے بھی نہیں بتایا کہ ”جو ہاتھ تمہیں دودھ پلائے اس میں دانت مت گاڑو۔“ ممکن ہے کہ مسکین اس بار جانے راضی ہو جائے، یا پاشا مجھے کوئی اور شخص ڈھونڈ دے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں اصل پلان پر عمل شروع کر دوں اور کشمیر کے کسی تربیتی کیمپ میں داخل ہو جاؤں۔

اس وقت جنگ کا آغاز ہو چکا ہوگا اور مجھے بے شمار کام لکھنی ہو کر سکیں گی۔ میرے ذہن میں کئی خیالات کلبلا رہے تھے اور میں گرمی اور پسینے میں ڈوبی خودکلامی کر رہی تھی۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے اس جگہ کو ہوٹل کا نام کیوں دے رکھا تھا، جس میں نہ روم سروس تھی، نہ باتھ روم تھا اور نہ نالٹ بنانے کا تکلف کیا گیا تھا۔

صبح تقریباً پانچ بجے کا وقت تھا، ہماری پارٹی حرکت میں آگئی اور ہم اور باہر نکل کر ایک اور ٹیکسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹیکسی کوہندو کش ریجن میں دوڑ رہی تھی۔ یہاں سڑکیں نہیں بلکہ پرانے لگے ہوئے روٹ تھے، ڈرائیور اس وقت تک چاٹا رہا جب تک اس کی سیلون کار چلتی رہی، پھر ہم اتر کر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ایک پتھر یا پہاڑی درہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں گائیڈ نماز پڑھنے چلے گئے۔ میں نے ہماری عورت کو اشارہ کر کے سمجھایا کہ مجھے ٹائٹ جانے کی ضرورت ہے۔ چوبیس گھنٹے میں نے خود پر کافی جبر کیا تھا، اب مجھے اپنا پیٹ پھٹتا محسوس ہو رہا تھا، اس نے چٹانوں کی طرف اشارہ کیا اور میں وہاں جا کر اپنے کپڑے شلوار اور نیکروغیرہ اتارنے لگی جب کہ میں اب تک برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ بہر حال قضائے حاجت کے لئے بیٹھی تو کافی سکون آنے لگا۔ آسمان کی طرف دیکھا تو ایک شوٹ کرنا ہوا ستارہ نظر آیا تو اس کے حوالے سے میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ خواہش بہت آسان سی تھی ”مجھے یہاں سے نکالا جائے۔“ یہ کہہ کر میں نے دوبارہ ستارے کو دیکھا اور اس کے بخارات میں تبدیل ہونے کا انتظار کرنے لگی، لیکن یہ غائب نہ ہوا۔ میں نے برقعے کا سامنے والا حصہ اٹھا کر ماتھے پہ رکھا اور ستارے کو پھر غور سے دیکھنے لگی۔

حساسی مسائل

”اُف میرے خدا! یہ تو بد بخت سیٹلائٹ (مصنوعی سیارہ) ہے جو کمرے کی آنکھ طرح نیچے حیات دنیا کی تصویریں سمیٹ رہا ہے، اس نے میرے اس وقت کی ”مصروفیت“ کی تصویر بھی بنالی ہوگی۔ ان میں سے بعض سیٹلائٹ ایک ایک گز کی جسامت والی چیزوں کی شبیہ کو بھی اپنے اندر محفوظ کر لیتے ہیں، آپ کو تو پتہ ہے کہ میں اس وقت برقعے میں تھی خیر، میں کوئی بھی فرد ہو سکتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی پتہ نہیں یہ فوجی سیٹلائٹ ہے یا کمرشل؟ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ یقیناً کسی قسم کا سیٹلائٹ تھا، نہ کہ ستارہ۔

میں نے اپنا چہرہ پھر برقعے سے ڈھانپا، کھڑی ہو کر پیچھے مڑی اور منہ کے رخ سیدھی اس عورت کی طرف چل پڑی، میں سیٹلائٹ کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ میں آزار بند باندھنا ہی بھول گئی اور شلوار ٹخنوں پر جاگری۔ اسے اٹھایا اور آزار بند کو اچھی طرح باندھ لیا۔ جب میں سڑک کر اس کے اس عورت کے قریب پہنچی تو اس نے چہرے پر سے برقع ہٹا رکھا تھا اور بس رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر خاموش قہقہے لگاتی رہی ہوگی۔ مجھ سے اگرچہ مضحکہ خیز حرکت سرزد ہوئی تھی مگر میں اس بات پر خوش تھی کہ چلو میں اس سے قہقہہ لگوانے میں تو کامیاب ہو گئی ہوں۔

چند منٹ بعد میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، ہم تنگ درے کی چڑھائی چڑھ رہے تھے، میں نے جو پلاسٹک کے شوز پہنے ہوئے تھے انہوں نے میرے پاؤں کی جلد کو اپنے نوکدار دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا تھا، میری دائیں ایڑی پر پڑا ہوا آبلہ پھٹنے کی وجہ سے درد شدہ ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ اس چڑھائی کی تکلیفوں سے میں اکیلی ہی دو چار نہیں ہوئی اس روٹ کو اختیار کرنے والا ہر فرد کسی شکوہ شکایت کے بغیر، خاموشی سے صعوبتیں جھیل رہا ہے۔ پاکستان کی یہ ”سورخ دار“ سرحد چودہ سو میل لمبی ہے، اس میں تقریباً 400 غیر قانونی روٹ ہیں۔

جب سورج کی کرنیں پھوٹیں تو میں نے دیکھا کہ ہندو کش کے سلسلہ کوہ کے شاندار ڈھلوانوں پر پھر تیلے قبائلیوں کی کئی ٹولیاں نمودار ہو رہی ہیں جو بڑی آسانی سے بارڈر پر ادھر سے ادھر آ جا رہی ہیں۔ لوگ کھڑی چٹانوں پر بھی ہر نوں کی سی پھرتی سے چڑھ رہے ہیں، انہیں اوپر سے ہم جیسے لوگ پست ہمت اور بزدل لگ رہے ہوں گے۔

جب ہم ”دور بابا“ پہنچے تو بہت سے لوگوں کو گھومتے پھرتے پایا۔ مرد زیادہ تھے اور عورتیں بہت کم تھیں، اونٹ گاڑیاں اور گدھا گاڑیاں، سمگل شدہ مال و اسباب اور انسانوں کو بارڈر پہنچانے کے لئے قطاروں میں کھڑی تھیں۔ میں نے مہاجرین کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن صرف چند ایک ہی دکھائی دے سکے۔ میں سوچ رہی تھی کہ چند روز پہلے طورخم پر جولا کھوں مہاجرین جمع تھے، ان کا کیا بنا؟ شاید ان میں سے چند ایک جنوب میں کوئٹہ کی طرف چلے گئے ہوں؟

میں نے ایک بار پھر جان کے کندھے کو تھپتھپایا اور اسے ساتھ لے کر بیٹھ گئی اس کے چہرے پر ایک دلاویز مسکراہٹ ابھری، میں اسے ایک روز پہلے کے کھر درے رویے پر تقریباً معاف کر چکی تھی۔ اس نے سرکشی کرتے ہوئے کہا ”یو آنے، تم اب محفوظ ہو گئی ہو، چاہو تو برقع اٹھا سکتی ہو، تاہم چہرے کو چھپائے رکھنا۔ اگر کوئی تصویریں بنانا چاہو تو وہ بھی بنا سکتی ہو، کل رات کی پریشانیوں پر مجھے افسوس ہے، تمہیں گرمی نے بہت ستایا تھا، اور گرمی تو ہر کہیں ہے، پاکستانی بارڈر تک بیس منٹ سے بھی کم وقت میں پہنچ جائیں گے۔ تمہیں اب سواری کے لئے گدھا ملے گا۔“

اس پر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، کیونکہ ان جوتوں میں تو میرے لئے ایک اور قدم اٹھانا بھی ناممکن ہو گیا

تھا، یہ جوتے مجھے ایک دن پہلے دیئے گئے تھے۔ میں آلتی پالتی مار بیٹھی رہی اور برقع اٹھایا تو میرے چہرے کو ٹھنڈی ہوا نصیب ہو گئی۔

میری ہمراہی عورت، ذرا فاصلے پر اپنی چھوٹی بیٹی کو ساتھ لئے بیٹھی تھی، میں نے اس کی تصویر لینے کے لئے اشارہ کیا تو وہ راضی ہو گئی، اس ماں بیٹی کا بڑا خوبصورت پورٹریٹ بنا۔ پھر مڑ کر میں نے لینڈ سکیپ کے متعدد دٹائٹس لے لئے اور ان کے ذریعے میں نے ”دور بابا“ کی پہاڑیوں میں پھیلی ہوئی تاجروں، سمگلروں، مہاجرین اور قبائلیوں کی بد نظمی کے مناظر محفوظ کر لئے۔

گدھے کی کارستانی

جان مجھے گدھے کی طرف لے گیا، میں ایک پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ ایک پانچہ اٹھنے کی وجہ سے میرا تھنہ ”ننگا“ ہو گیا شکر ہے کہ میرے باپ کی دی ہوئی جرابوں کی وجہ سے ڈھکا رہ گیا۔ میں نے اپنے کپڑے اور برقع درست کیا، کمبخت گدھے نے اچانک آگے جست لگا دی جیسے وہ بجلی کا کوندا ہو۔ میرے منہ سے بے ساختہ ناردرن انگلش کی گالی ”Flaming Nora“ نکل گئی۔

گدھے پر بکڑ وادیا

دو دن میں پہلی بار ایک بازاری لفظ میری زبان پر آیا تھا، چونکہ یہ پشتو کا لفظ نہیں تھا، اس لئے بہت سے لوگوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا، اگرچہ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ میں نے یہ کیا کہا ہے۔ وہ اصل میں جس چیز سے چونکے تھے وہ برقع پوش عورت کا ”شور“ تھا۔ افغان عورتیں اونچی آواز میں بولنے کی جسارت نہیں کر سکتیں۔ ان سے ہمیشہ خاموشی اور مسکینی کی توقع کی جاتی ہے۔

بیشتر لوگ، میرے منہ سے شور نکلنے سے پہلے ہی میری طرف متوجہ تھے جب میرا حوصلہ کچھ بڑھا تو میں گدھے کی لگام پکڑنے کے لئے آگے کوچکی تو میرا کیمرہ پوری طرح دکھائی دے گیا۔ افغان سپاہی نے فوراً شور مچایا اور مجھے گدھے سے اترنے کا حکم دے دیا۔

میں اس سپاہی کی شخصی وجاہت کو کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھے گرفتار کرنے والا تھا یا غالباً ہلاک کرنے جا رہا تھا، بلکہ اس لئے کہ زمرہ کی طرح کی سبزاں انھیں میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ میری یہ بات خواہ کتنی ہی عجیب و غریب لگے، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ، میں اس کے پر جلال خدو خال سے لمحہ بھر کے لئے مسحور ہو کر رہ گئی اس نے مجھ سے گدھا چھین لیا اور مجھے کیمرہ ہٹانے کا حکم دیا۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اس نے جھپٹا مار کر وہ مجھ سے لے لیا۔ اس نے گدھے کے مالک سے بھی سختی سے کچھ پوچھا جس نے جواباً جان کے چچا کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، اس کے پاس گیا، چند سوال پوچھے اور اپنے اُلے ہاتھ سے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی، جس سے اس کی ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔

جان اپنے چچا کے دفاع کے لئے آگے بڑھا اور اس کی صفائی میں کچھ کہا، مگر سپاہی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کو مارنے اور ڈانٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ صورت حال دیکھ بہت سے لوگ، جن کی تعداد دوسو سے کچھ زیادہ ہو گئی، اکٹھے ہو گئے اور ماجرا پوچھنے لگے۔ میں پیچھے ہٹتے ہٹتے کافی دور چلی گئی۔ میں چند منٹوں کے لئے حالات پر غور کرتی رہی، پھر سوچا کہ میں تیزی سے بارڈر کی طرف چلی جاؤں کیونکہ طالبان کو زیادہ غرض گائیڈز سے ہے۔ میں دوسروں کے پیچھے لگ کر نکل جاؤں گی کیونکہ میں نے برقع اوڑھا ہوا تھا اور اب تک نظروں سے اوجھل رہی تھی۔

مگر ایسا کرنا، ممکن نہیں تھا، میں اپنے دو گائیڈز کو یوں پیچھے چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی۔ میری ہمراہی عورت اپنی لڑکی سمیت خاموشی سے غائب ہو چکی تھی اور میں ہجوم میں سے راہ بناتی ہوئی، سپاہی کے پاس گئی اور اپنا کیمرہ واپس مانگا۔

سبز آنکھوں والا سپاہی شش و پنج میں پڑ گیا، وہ دراصل مجھے بھول چکا تھا اور میں اپنے مطالبے کے لئے جو زبان بول رہی تھی وہ اس کے لئے عجیب و غریب تھی، اس دوران مزید طالبان بھی آچکے تھے، سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ انگریز عورت کہاں سے آئی ہے۔ لوگوں نے مجھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایک سرخ بالوں والے طالب سپاہی نے مجھے کیمرے سمیت پکڑ کر کار میں جا بٹھایا۔

اگر ”پولیانہ“ یہاں ہوتی تو وہ ان نازک حالات میں میرے اس مثبت طرز عمل کی داد دینے بغیر نہ رہ سکتی۔

میں نے نارنجی زرد رنگ کی شلوار اور میچنگ نارنجی پھولدار میض پہن رکھی تھی، جس کے سامنے والے حصے پر تین بڑے بڑے پھول نائکے ہوئے تھے۔ کمر پتلی تھی اور سکرٹ لمب شید کی طرح اٹھی ہوئی تھی، یہ عجیب ہولناک اور مضحکہ خیز لباس تھا خیر جو بھی تھا برقع کے نیچے ہی تھا۔ میں فلم ”Whatever happened to baby jane“ میں ”بینی ڈیوس“ کا کردار دکھائی دے رہی تھی۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا گہرے سرخ بالوں والا شخص مجھے مسلسل تکتا رہا، اس نے اوپر نیچے اور غرضیکہ ہر پہلو سے میرا جائزہ لیا، میں نے سوچا خدا یا یہ لوگ کہیں مجھے اجتماعی زیادتی کا نشانہ تو نہیں بنانے والے؟

چانک ڈرائیور کوڑکنے کا حکم دیدیا گیا۔ طالب نے مجھے کار سے باہر نکالا اور ایک اونچی جگہ پر مجھے کھڑی کر کے غائب ہو گیا۔ چند منٹوں کے بعد میں ایک اور ہجوم کے زرخے میں تھی۔ سب کے سب شدید غصے کے عالم میں تھے، مجھے ان کے چہروں سے خوف آنے لگا۔ وہ چیخ چارہے تھے اور کوئی ایسے نعرے لگا رہے تھے جو میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ میں اس منظر کو اب یاد کرتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے لئے ایک ہلکی پھلکی تفریح بن گئی تھی جو ان لوگوں کی بے کیف زندگی میں آمو جو دہوئی تھی۔ تاہم اس وقت میں خوف سے کانپنے لگی، میرا منہ ایسے خشک ہو گیا جیسے چٹائی ہوتی ہے۔

میں نے نیچے دیکھا تو خون کی طرح سرخ نیل پالش میری طرف ٹانگی باندھے دیکھ رہی تھی، میرے شوز اور جرابیں غائب ہو چکی تھیں مجھے یاد نہیں کہ ایسا کب اور کیوں ہوا؟ اُمید تھی کہ میری کافرانہ رنگ کی انگلیوں کا کوئی بھی ٹوٹس نہیں لیا گا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وارنش طالبان حکومت کی ممنوعہ فہرست میں شامل ہے۔

سنگسار ہو جانے کا خوف

میں نے جُمعے پر نگاہ ڈالی تو خود سے کہا۔ ”تو میرا آخری وقت آپہنچا ہے، اب مجھے پتھر مار مار کر موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔“ میں نے دعا کی اے خدا، میں پہلے پتھر ہی سے بے ہوش ہو جاؤں اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ان سے رحم کی بھیک نہ مانگوں۔

میں سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں میں کتنا درد برداشت کر سکوں گی، میں نے دعا کی کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میرے موت جلد واقع ہو۔ پھر اس پر بھی غور کیا کہ میرے جسم کا کیا بنے گا۔ کیا اسے میرے گھر پہنچا دیا جائے گا، کیا میرے والدین کو اسے شناخت کرنے کے لئے کہا جائے گا؟ کیا ڈبیری کو بتایا جائے گا کہ میں کیسے مری؟ کیا سب کو میری موت کے بارے میں مطلع کر دیا جائے گا؟ ایسے کئی سوالات ابھر رہے تھے۔

مجمع میرے مزید قریب آ گیا۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی لیکن فوراً خیال آیا کہ اگر آنکھیں کھلی رہیں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ان کے اندر جھانک کر مجھ پر ترس کھالے اور پتھر مارنے والوں کو روکنے کی کوشش کرے۔ میں نے زمین پر دیکھا تو وہاں اتنا کولہ بارود پڑا تھا کہ ”انقراض“ (جو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے) کے لئے دس سال تک کی ضروریات کے لئے کافی تھی۔

اسی لمحے مجھے کوشنہ چشم سے دکھائی دیا کہ وہی طالبان سپاہی ایک گز رتی ہوئی کار کو جھنڈی دیکھا کر روک رہا ہے۔ اس میں سوار برقع پوش عورت کو باہر نکلنے کے لئے کہنے کے بعد اس نے میری طرف سخت اشارہ کیا، اور دونوں میری جانب بڑھنے لگے۔ اس دوران ہجوم غنائی انداز میں کچھ الاپتا رہا، جبکہ میں نے سنا تھا کہ اس ملک میں الاپ وغیرہ کی سخت ممانعت ہے۔

بھونڈے انداز میں تلاشی

وہ عورت اچانک میری طرف مڑی اور اس نے نہایت بھونڈے انداز میں میری تلاشی لینا شروع کر دی۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر اتنا سکون ملا کہ زندگی بھر ایسا سکون نہیں ملا تھا۔ سکون اس لئے ملا کہ انہوں نے مجھ پر جوشبہ کیا تھا، اس کا انہیں کوئی ثبوت نہیں سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میری پاس کوئی ہتھیار ہیں یا کوئی خفیہ معلومات ہیں۔ چند لمحے کے بعد میرا یہ سکون غصے میں تبدیل ہو گیا۔

میں ایک دم ہجوم کی طرف مڑی اور سرکشی کے انداز میں اپنے کپڑے اوپر اٹھا دیئے، یہ ہیں ڈائنامیٹ، یہ ہیں جو میں نے چھپائے ہوئے ہیں، میری یہ حرکت اتنی اشتعال انگیز تھی کہ وہ میرے منہ پر طمانچہ جڑ دیتے تو بجا تھا۔ لوگوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، کچھ ایک طرف مڑ کر کھڑے ہو گئے اور کچھ دوسری سمتوں میں دوڑنے لگے۔ یہ ایک حیا سوز نظارہ تھا جس نے مجھے ایک فلم ”Carry on up the khyber“ کی یاد دلادی۔ اس فلم کا ایک منظر یہ تھا کہ سکا چانی سپاہیوں نے مقامی لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اپنے روایتی لباس کا نچلا حصہ اتار دیا تھا۔ میں نے اسی حرکت کا ارتکاب کیا تھا، نتیجتاً برقعہ پوش عورت نے اپنے بازو اٹھائے اور مجھے دوہڑ مارنا شروع کر دیئے۔ معلوم نہیں اسے زیادہ غصہ آیا تھا یا میں زیادہ غصے میں تھی یا وہ سرخ بالوں والا سپاہی زیادہ غصے میں تھا؟

اصل آزمائش

جیسے ہی کار مجھے پاکستانی سرحد کے قریب سے لے کر روانہ ہوئی تو میں ٹھہر کر رہ گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں مفلوج ہو چکی ہوں اور میرے پورے جسم کا ”سوچ آف“ ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دفاعی نظام کا کوئی طریق کار ہو اور ایڈرینالین (adrenalin) خون کی گردش میں شامل ہو کر ہيجان پیدا کر رہی ہو، میں آئندہ کے لئے کوئی کارگر لائحہ عمل سوچ رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

اتنے میں نیم خود کار گن کی فائرنگ ہوئی اور فضا میں اچانک ارتعاش پیدا ہو گیا، اس کے ساتھ میرے خیال کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا۔ ہماری کار ایک کانوائے کا حصہ بن گئی جس کی قیادت ایک لاری میں بھرے ہوئے نوجوان فوجی کر رہے تھے اور وہ فاتحانہ انداز میں چیخ رہے تھے۔۔۔۔۔ ”امریکی جاسوس، امریکی جاسوس“ واہ، کیا کہنے! یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی ”بلڈی امریکن“ ہوں، یہ سن کر میں اپنے سر میں سوراخ کر دیئے جانے کی ضرورت محسوس کرنے لگی۔

اسی لمحے مجھے اپنے بازو میں زور کی چٹکی محسوس ہوئی، یہ افغان گائیڈ نے کاٹی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کوٹنی میں بلا بلا کر اپنے منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں اس کا پیغام فوراً سمجھ گئی۔ اگر اس نے شروع ہی سے میرے پلان کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ گرفتار ہو جانے کی صورت میں ”ہمیں آپس میں ضرورت پڑنے کی حد تک“ (Need to know basis) واقفیت رکھنی چاہیے، اور ایک دوسرے کے نام جاننے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہئے۔ میں نے انہیں پاشا کی وساطت سے بتایا تھا کہ ”میں تمہارے بارے میں جتنی کم جانتی ہوں گی گرفتاری کی صورت میں اتنا ہی بہتر ہوگا۔“

اسی دوران ایک اور گن فائر ہوا، مشتعل ہجوم نے نوجوانوں میں مقبول ترین نعرہ جو ہم نے پشاور کے مظاہروں کے دوران سنا تھا، الاپنا شروع کر دیا ”اسامہ زندہ باد، اسامہ زندہ باد“ اس کے معنی ہیں مسٹر بن لادن کی عمر دراز ہو۔ ”یو آنے رڈ لے“ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کوئی بلڈی چانس نہیں ہے۔

کارٹر کی اور جان کو اتار لیا گیا، میں نے سوچا اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔ ایک اور آدمی کار میں، میرے ساتھ آ بیٹھا۔ میرے خیال میں وہ طالبان سپاہی نہیں تھا، کیونکہ اس نے بھاری پگڑی نہیں پہن رکھی تھی ویسے برسمیل تذکرہ میرا خیال تھا کہ اس پگڑی کو یورپ میں 2002ء کی فیشن کیٹ واک میں شامل کر لیا جانا چاہیے۔

چلو فیشن ٹپ کو اگ چھوڑتے ہیں، میری ایک طرف افغان گائیڈ تھا اور دوسری طرف پہ تل سے لتھڑا ہوا آ بیٹھا تھا۔ گائیڈ میری مسلسل چٹکیاں لے رہا تھا اور میری جلد مروڑ مروڑ کی اپنی بات ”ذبن نشین“ کر رہا تھا جبکہ میں پیغام پہلے ہی پا چکی تھی۔ اگر یہ اس حرکت سے باز نہ آیا تو میں اس کی حلق پر ایک گھونسہ مار کر اس کی سانس ہی روک دوں گی، یہ میری طرف سے آخری ضرب ہوگی۔

کار ایک بار پھر رُک کر اور جان ہماری گاڑی میں واپس آ گیا۔ بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ مجھے اسے اپنی معیت میں واپس پا کر خوشی ہوئی۔ لیکن افسوس کہ اس کی واپسی کا مطلب یہ تھا کہ میں دوسرے آدمی کے ساتھ زیادہ کھینچ کر بیٹھوں جس نے مجھے چھوٹا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو میں نے اسے محض اتفاق سمجھا تھا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ وہ مجھے جنسی لذت کے لئے ٹوٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے مجھے اُمید تھی کہ شاید وہ اس سے باز آ جائے پھر میں نے سوچا، چلو میرا کیا بگڑتا ہے۔

ندیدے کہیں کر!

وہ میری خاموشی پر مزید شیر ہو گیا اور اس نے اور بھی دباؤ ڈالنا اور مجھے نچوڑنا شروع کر دیا، اور سمجھا کہ شاید میں یہی چاہتی ہوں اور زبان بند ہی رکھوں گی۔ آخر میں کڑک کر بولی، ”کیا اس کار میں کوئی انگلش سمجھتا ہے؟“ جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی پتہ نہیں کہ یہاں کیا ہونے جا رہا ہے، میرے پاس بیٹھے ہوئے یہ دو آدمی کون ہیں لیکن میں برطانوی رعایا ہوں، اگر مجھے اپنا کیمرہ واپس نہ ملا تو مصیبت کھڑی کر دوں گی۔“

اور تو کوئی نہیں بولا البتہ جان نے اس افغان سے کہا کہ وہ اس حرکت سے باز آ جائے لیکن میرے دائیں طرف کے ذلیل شخص پر کوئی اثر نہ ہوا، اس نے میرا موقع کھینچ لیا جو اتر کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس سے میرے سیاہ بھورے، کھر درے اور انا جوں کے ڈٹھل جیسے بال ننگے ہو گئے۔ میرا میک اپ تو بالکل ہی نہیں تھا۔ میرا رنگ روپ عموماً دودھیا سفید ہے جس پر بھورے داغ دھبے ہیں اور آنکھیں گہری نیلی ہیں۔

اس ”رذیل“ نے (اس کا نام نہ جاننے اور اس کی کمینہ حرکات کے حوالے سے میں اسے یہی نام دے رہی ہوں) مجھے ایک کنگھی پکڑوا دی، میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بال سنوارنے کے لئے استعمال کیا کیونکہ دو دن مسلسل برقعے کے نیچے رہنے کی وجہ سے یہ برباد ہو گئے تھے۔ اب مجھے اس سے گویا ”نجات“ مل گئی تھی۔

ہمارا جلال آباد واپسی کا اذیت ناک سفر جاری رہا اور اس رذیل شخص نے مجھے نٹوں لے کر کام پھر سے شروع کر دیا، بالآخر میرا پیمانہ صبر چھلک پڑا میں نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”او کمینے تم باز آؤ گے یا نہیں“ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی پسلیوں پر ایسا زوردار مکہ رسید کیا کہ وہ کتے کی طرح ”چوؤں“ کر کے رہ گیا۔ فرنٹ سیٹ کے مسافر نے گھبرا کر پیچھے مڑا مگر وہ بمشکل اس کا نصف حصہ دیکھ سکا تھا، اس نے ڈرائیور سے کار فوراً رکوا دی۔ اس کے اور رذیل شخص کے درمیان سخت تلخ کلامی ہوئی، اور میں سیکنڈ کے اندر اسے کار سے اتار دیا گیا، اور ایک گن فائر کے ساتھ نعرے لاپتے ہوئے ہمارا آگے کا سفر جاری رہا۔ فی الواقعہ یہ بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک سفر تھا۔

جب ہم جلال آباد پہنچے تو مجھے چیک پوائنٹ کی تمام گلیوں میں پھرایا گیا اور ایسی پریڈ کرانی گئی جیسے میں کسی قسم کی ٹرائی ہوں۔ میں نے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی ایک انگش بول سکتا ہے، ان کا جواب نفی میں تھا۔ ایک چھوٹا سا لڑکا جو میری ڈیزی کی عمر کا تھا، وہ کھڑکی میں سے میری طرف دیکھتے دیکھتے اپنا منہ بگاڑنے لگا۔

اس کے سر پہ گھونٹھریا لے بالوں کا گچھا سا بنا ہوا تھا۔ آنکھیں بھوری اور جلد سبزی مائل تھی۔ دیکھنے میں واقعی خوبصورت تھا۔ میں اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے اپنا سر ایک طرف کو کر کے، اپنی غلیظ انگلی اپنی گردن پر پھیری اور مجھے ذبح کئے جانے کا تاثر دیا۔ کیا خوب! میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو تو ویسے ہی پسند نہیں کرتی اور یہ تو بالکل ہی متعفن چیز تھا۔

جب ہم اگلے چیک پوائنٹ کے لئے روانہ ہوئے تو ڈرائیور زور سے کھانسا اور منہ میں پڑی ہوئی نسوار اور بلفم کو اس طرح تھوکا کہ وہ میری کھڑکی میں سے آکر پیچھے میرے چہرے پر آگیا۔ میں نے جلدی جلدی یہ گند برقعے سے پونچھا، اس سے میری طبیعت بے حد مگدہ رہوئی۔

اگلے چیک پوائنٹ پر رُکے تو ایک شخص نے مجھے کچھ کاغذات اور پین پیش کیا، میں نے اس پر جلدی جلدی ”جم مرے“ کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر لکھا اور اس شخص سے درخواست کی کہ وہ اس نمبر پر فون کر دے۔ یہ شخص انگش کا ایک لفظ تک نہیں بول سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے دستخط حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ غالباً آخری بار تھی کہ میں نے کاغذ پر کچھ لکھا تھا۔

صدے کا اثر تو کم ہونا شروع ہو چکا تھا مگر جو خوفناک واقعات آئندہ پیش آنے والے تھے ان کا تصور کر کے پریشان ہونے لگی تھی۔ میری آنکھوں میں اکثر آنسو تیرتے رہتے تھے۔ میں یہ کیا! یہ آدمی جس نے دستخط کرائے تھے، وہیں کھڑا تھا اور اس نے کاری کی کھڑکی میں سے بازو گزار کر میری کلائی پکڑ لی اور اسے سہلانا شروع کر دیا اور کہا ”ٹھیک ہے فون کر دوں گا“ میرا خیال ہے کہ وہ میری ڈھارس بندھانے کی کوشش کر رہا تھا، اس پر میں مسکرائی اور وہ بھی جواباً مسکرا دیا۔

آنکھ بھاڑ بھاڑ کر دیکھنے کا سبب

پچھلے واقعات کو یاد کر کے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جلال آباد میں میری آمد یہاں کے مردوں کے لئے ایک کافی حد تک یادگار لمحہ تھا۔ ان لوگوں کے لئے اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے ماؤں، بیویوں یا بہنوں کے صرف چہرے دیکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کار کی عقبی نشست پر ایک سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی مغربی کوری بیٹھی تھی جو ہر فتنے کے بغیر تھی، اسے دیکھ دیکھ کر وہ بے تاب ہو رہے تھے۔ اگر میں اب بھی ہر فتنے میں ہوتی تو مجھے کوئی بھی پریشان نہ کرتا۔

کارر کی اور ہم بالآخر طالبان انتہیلی جنس ہیڈ کوارٹرز کے صدر دروازے سے گزر کر اندر جا رہے تھے، ہم تینوں اور اس چھوٹی لڑکی کو ایک سادہ مگر صاف ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچا دیا گیا جس میں ہاتھ روم کی سہولت موجود تھی اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ میں نے جان کو اشارے سے بتایا کہ اگر کمرے میں خفیہ آلات لگے ہوئے ہوں تو وہ بالکل نہ بولے۔ یہ افغان بھی آخر کار میرے اس پیغام کو سمجھ گیا۔ میں کوئی ایسی بات یا حرکت کرنے والی نہیں تھی جس سے انہیں نقصان پہنچتا ہو۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں اس کمرے سے نکال کر ایک اور سنگل کمرے میں پہنچا دیا گیا جس میں ہاسپٹل سٹائل بیڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے جیلر کو اشاروں کے ذریعے بتایا کہ مجھے کسی کمرے میں ایسے دو مردوں کی معیت میں بند نہیں کیا جاسکتا جنہیں میں پہلے سے نہ جانتی ہوں۔ ایسی صورت حال کی طالبان حکومت میں ویسے بھی اجازت نہیں ہے، اور میں ان کے اس ضابطے سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ میری استدعا منظور کر لی گئی، جس پر مجھے دوبارہ پہلے والے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

میرا ذاتی جیلر انگریزی کا ایک لفظ تک ادا نہیں کر سکتا تھا، اس نے مجھے اشاروں سے بتایا کہ وہ دروازے کو باہر سے مقفل کرے گا اور اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے دستک دینا ہوگی۔ بہت سے طالبان سپاہیوں کی طرح وہ بھی بہت واجبہ شخص تھا، اس کے گھنے گھونگھریا لے سیاہ بال، قبائلی طرز کی ٹوپی اور کانسی رنگ کی بھاری پکڑی سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ ٹوپی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شمالی مشرقی خطے کندوز سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ٹوپی کئی رنگوں کی ہوتی ہے۔ میں ایک سرخ چٹائی پر بیٹھ کر ساری صورت حال اور اپنے بچ جانے کے امکانات پر غور کرنے لگی۔ میں اس نتیجے پر جلد پہنچ گئی کہ حالات کچھ اچھے نہیں ہوں گے۔ اب یہ بھی سوچنے لگی تھی کہ اب لندن میں کیا وقت ہوگا، میرے دفتر میں کام زور و شور سے ہو رہا ہوگا اور نیوز ڈیسک پر ”جم“ میری کال کا انتظار کر رہا ہوگا۔

مجھے کچھ بخار محسوس ہونے لگا اور دل میں خوف پیدا ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا دنیا کو کبھی پتہ چل سکے گا کہ مجھے طالبان نے قید کر لیا ہے، میرے کیمرے کا کیا بنا ہوگا؟ اس میں ”گاما“ نامی گاؤں میں کھینچی ہوئی جو فلمیں تھیں، کیا ان کی مدد سے گاؤں کی شناخت ہو چکی ہوگی اور پہچان لیے جانے والے افراد کا کیا حشر ہوگا، یہ سارے الٹ پلٹ خیالات میرے لئے باعث تشویش تھے۔ مجھے احساس بھی ہوا کہ میرے ہاتھ اب تک ہر فتنے میں لپٹے ہوئے ہیں۔

عین اسی لمحے مجھے ایک آواز سنائی دی اور میں ایسی آوازوں سے مانوس ہونے ہی والی تھی، یہ تالا کھڑکنے اور اس میں چابی پھرنے کی آواز تھی۔ ڈائریکٹر انتہیلی جنس اندر آ گیا یہ ایک متین و برباد اور نفیس طبع شخص تھا۔ اس کا چہرہ اس کے دل میں کسی قسم کے ہجانات کے راز انشا نہیں کر رہا تھا اور آنکھوں سے بے اعتنائی اور بے رغبتی منعکس ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے خیالات کی دنیا درہم برہم ہو گئی۔ میں سوچنے لگی کہ کیا یہ اپنی اذیتوں کا کوئی بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے یا یہ ان لوگوں میں سے کوئی ایک ہے جو مجھے ”پہلا پتھر“ مارنے کے مستحق بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پہلا پتھر جارہے کا حقیق

(”پہلا پتھر“ ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک دفعہ کچھ لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس ایک گنہگار عورت کو کھینچتے ہوئے لائے کہ اسے سنگسار کیا جائے، آپ نے کہا! اچھا اسے میدان میں کھڑی کر دیتے ہیں مگر اسے ”پہلا پتھر“ وہ شخص مارے گا جس نے خود اس جرم کا ارتکاب کبھی نہ کیا ہو، چنانچہ سب بھاگ گئے.... مترجم)

وہ بے حد پراسرار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں اپنے کچھ ذاتی کوائف لکھوں۔ میں نے بتایا کہ ایک برطانوی صحافی ہوں۔ وہ میرے اس انکشاف سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہ کہتی کہ مجھے ملکہ برطانیہ نے پیغام رساں کے طور پر بھیجا ہے، اس کے چہرے کے تاثرات پھر بھی یہی رہتے۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے بے پناہ خوشی کا احساس ہوا، یہ خوشی اس بات کی تھی کہ میں لکھنے کے لئے اس کا ذاتی پین لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب مجھے صرف کاغذات یا کسی اور رائٹنگ میٹریل کی ضرورت تھی اور یہ تمنا تو لازمی طور پر تھی کہ میں بطور جرنلسٹ اپنا کام پھر سے شروع کر سکوں۔

جمعہ 28 / ستمبر کا دن اور اس کی سہ پہر کا وقت، میری زندگی کا ایک یادگار دن اور ناقابل فراموش لحظات تھے، میرا خیال ہے کہ میرا خاندان، میرے دوست اور میرے رفقاء کا بھی اسے نہیں بھلا سکیں گے۔ میں سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں جم ہمارے گھر میں خطرے کا الارم کب بجاتا ہے، وہ اگر میرے ماں اور باپ کو یہ ”نیمیکنگ نیوز“ سنا دے تو میں اس پر رشک نہیں کروں گی۔ میری ماں کی نظر میں وہ ایک ”لوک“ قسم کا مرد ہی تھا (ایسے مرد جو خواتین کو گرفتار بلا کرنے کو شیوہ مردانگی سمجھتے ہیں) جس نے اس کی نازوں پٹی بنی کو اسلام آباد بھیج دیا حالانکہ میرے لئے یہ کئی پہلوؤں سے ایک اچھی مہم تھی۔ کم از کم یہ تو تھا کہ میرے حسن مزاج پر مقرر رہی ہے۔

اس کمرے میں انٹرکنٹیشنل یونٹ لگا ہوا تھا اور میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جس پر اس افسر کے حکم کے مطابق اپنے ذاتی کوائف لکھتی، بہت سی چیزیں اوپر نیچے کیں، بالآخر مجھے ایک ”کافی ٹیبل بک“ مل گئی، جو کسی کو بطور الوداعی تحفہ دی گئی تھی، کیونکہ اس کے اندر کی جانب پیشاب بھی خواہوں کے دستخط تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتاب کسی برطانوی یا امریکی کو دی گئی تھی جو اپنے ملک سے باہر، افغانستان میں نئی زندگی شروع کرنے والا تھا۔ کتاب کا نام ”Caruans to Tatory“ تھا۔ یہ ایک فرانسیسی جوڑے رولینڈ اور سبریا کی مشترکہ کاوش تھی۔ یہ کتاب پہلی بار 1978ء میں چھپی تھی۔ یہ دراصل خود اس ”مشاذ“ خاندان کی سرگزشت تھی۔ جس نے افغانستان کا سفر کیا تھا۔ اس میں افغانوں کی زندگی کے بارے میں حیرت انگیز تصویریں اور دقتی کیمرے سے بلا اہتمام کھینچی ہوئی فوٹوز تھیں۔ میں حیران تھی کہ کتاب کا مالک کون ہے اور یہ یہاں کیوں چھوڑ دی گئی ہے۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، میں خوش اس بات پر تھی کہ اس نے مجھے کچھ دیر کے لئے مصروف رکھا ہے۔

اگر میں اپنے آپ کو مصروف نہ رکھتی تو میرا ذہن طالبان کی سڑاؤں بشمول سنگسار کرنے سے قلم کر دینے کے بارے میں سوچتا رہتا، جن لوگوں نے نیلی ویٹن پر سائر شاہ کی خوفناک دستاویزی فلم ”Beneath the veil“ دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ حکومت ظلم کی کن انتہاؤں تک پہنچ جاتی ہے۔

میرے خیال میں سائر شاہ کیمرہ اپنے ہر قلعے کے نیچے چھپا کر ملک کے اندر داخل ہوئی تھی اور یہاں عورتوں کے ساتھ طالبان کے وحشیانہ مظالم کی تصویریں بناتی رہی تھی۔ اس نے فٹ بال کے گراؤنڈز میں سرعام پھانسیوں کے مناظر کی بھی تصویر کشی کی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کیا وہ میری فلم بھی بنائے گی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ مجھے کچھ بسا دستی محسوس ہوئی، میں حیران تھی کہ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے، بعد میں احساس ہوا کہ یہ بدبو تو خود میرے جسم سے آرہی ہے۔ دو دن سے میں نہانی نہیں، میرا ڈریس اور شلوار وغیرہ ٹائیلون، کریمیلیں اور پولی ایسٹر کی بنی ہوئی ہیں، پسینہ آتا رہا ہے اور اس کے ساتھ بدبو بڑھتی رہی ہے۔ اور میرے بال بھی کھوپڑی کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔

بحوالہ ہر تال

جیلر جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا، عبداللہ منیر تھا، وہ کچھ کھانے کی چیزیں لے کر آیا، مگر میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے تقریباً دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن میرے ذہن میں غصے، اشتعال اور ڈر خوف کے بعد آخری چیز جو ہو سکتی تھی وہ کھانا تھا۔ عبداللہ انگریزی بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اسے واضح طور پر بتا دیا کہ میں جب تک فون پر اپنی ماں سے بات نہیں کروں گی کھانا نہیں کھاؤں گی۔

ڈائیکٹر انیلی جنس کچھ کچھ انگریزی جانتا تھا اس کو پتہ چلا تو اس نے اندر آ کر پوچھا کہ میں کیوں نہیں کھا رہی؟ اتنے میں تین اور طالبان مع ایک نوجوان ترجمان، حامد بھی آ پہنچے۔ میں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک مجھے میری امی سے بات نہیں کرنے دی جائے گی میں کیسے کھا سکتی ہوں، اور دوسری بات یہ کہ میں بطور قیدی آپ کا کھانا نہیں کھا سکتی، صرف بطور مہمان کھاؤں گی۔“

وہ میرا بیان سن کر شش و پنج میں پڑ گئے اور میں نے دل میں سوچا اری رڈ لے تمہارے اندر یہ طنطنہ کہاں سے آ گیا ہے؟ وہ بھی یہی سوچتے ہوں گے۔ پھر وہ سوچتے سوچتے باہر نکل گئے۔ نہ کھانا چھوڑ کر گئے اور نہ فون کرانے کا وعدہ کیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا جو چمچہر دانی کی سی جالی سے ڈھکی ہوئی تھی اور مستقبل کے بارے میں فکر مند ہو گئی۔

میں نے حامد کے ذریعے انہیں اپنے کام کی نوعیت سمجھانے کی کوشش کی، اور انہیں بتایا کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے اخبارات، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے تقریباً تین ہزار صحافی پاکستان میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس بار ڈر پر کیا ہو رہا ہے۔ صحافی اور میڈیا مین کے الفاظ جو میں بار بار کہہ رہی تھی میرا خیال ہے وہ واضح طور پر انہیں نہیں سمجھ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر ان سے ٹیلی فون کے استعمال کی اجازت مانگی، انہوں نے انکار میں سر ہلادیا۔ اس پر میں پھٹ پڑی۔

میں نے کہا ”اگر آپ نے مجھے میری ماں کو ٹیلی فون نہ کرنے دیا تو وہ بہت پریشان ہوگی۔ میں یہاں ایک خوبصورت ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں نہایت نفیس لوگوں کے پاس بیٹھی ہوں، اس میں فلش سسٹم اور شاہ کی سہولتیں ہیں اور میں اسے یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ آپ میری اچھی طرح دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ وہ بے چاری جانتی تک نہیں کہ میں یہاں ہوں۔ میں اسے صرف یہ بتاؤں گی کہ میرا ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے جسے میں اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، اور وہ میری توجہ کو یقیناً قبول کر لے گی۔ ورنہ..... میرا اخبار آپ کے بارے میں بڑی بڑی سرخیوں سے خبریں چھاپے گا۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ مغرب کے لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں؟

انہوں نے میری بات نہایت سنجیدگی سے سنی، حامد میرے الفاظ کا ترجمہ کر رہی رہا تھا کہ میں نے اس میں اس جملے کا اضافہ کر دیا۔ ”میری ماں سمجھے گی کہ مجھے ٹخنوں سے باندھ کر چھت کے ساتھ برہنہ کر کے لٹکایا ہوا ہوگا اور مجھے کوڑے مارے جا رہے ہوں گے۔“ حامد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اس جملے کا اتنی تیزی سے ترجمہ کیا جیسے اس نے یہ تھوک مارا ہو یعنی ”Split out“ کر دیا ہو۔ سننے والوں کے اہوتن گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور فوراً چل دیئے۔ ”اچھا“ یہ کہہ کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ میں انہیں کتنا غلط سمجھتی تھی۔

نفسیاتی حربے

میں اپنی بھوک ہڑتال پر اگر چہ سختی سے قائم تھی۔ پھر بھی میرے پاس کھانا آ گیا۔ اس رات حامد اور عبداللہ میرے کھانے سمیت آئے تھے اور میرے عین سامنے کھانا شروع کر دیا۔ یہ ترغیب دینے کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ میں نے ان کے لائے ہوئے سگریٹ پھونکنا شروع کر دیئے اور ساتھ ساتھ سبز چائے بھی پی رہی تھی جو بہت فرحت بخش تھی۔

اچانک ایک خوفناک دھماکہ ہوا جس سے درہ دیوار لرز گئے۔ میں اگرچہ الٹی پالٹی مارے بیٹھی تھی، میرا خیال ہے کہ پھر بھی میں تقریباً تین فٹ اچھلی ہوئی۔ حامد زیر لب مسکرایا اور عبداللہ بمشکل اپنا تہقہ روک سکا۔ یہ تقریباً پانچ بجے کا وقت تھا۔ حامد نے اپنی گن اٹھائی ”امریکا۔ امریکا۔“ کا نعرہ لگانے کے بعد ہوائی فائر کیا اور فوراً نکل گیا۔ میں نے بھی خود کو تیار کر لیا، کہ شاید یہ امریکا کی ضوابی کاروائیوں کا حرف آغاز ہو۔

پندرہ بیس منٹ بعد عبداللہ واپس آ گیا اور کچھ انسردہ دکھائی دے رہا تھا، اس نے حامد کو بتایا کہ کسی شخص کا پاؤں بارودی سرنگ پر آ جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے پوچھا تو پھر اس بد قسمت شخص کا کیا ہوا، اس پر عبداللہ نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا اور کندھے اچکا دیئے۔

دو گھنٹے بعد مجھے ریپڈ مشین گن فائرنگ کی آواز آئی لیکن محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ ایک سمت میں ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ کسی تربیتی کیمپ کے قریب ہونے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہو۔

میں نے اس رات کچھ آرام کرنے کی کوشش کی اور کسی مرد ”ملاقاتی“ کی آمد متوقع نہیں تھی، میں نے عبداللہ کی نصیحت پلے باندھ لی تھی اور دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا تھا۔ میں اب بھی سمجھ نہیں پاتی تھی کہ جہاں مجھے ٹھہرایا گیا ہے یہ جگہ کیسی ہے۔ کبھی تو یہ دکھائی دیتا تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کا ہسپتال واقع ہے، کیونکہ میں نے چند زخمیوں کو ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس خیال میں ایک الجھن پیدا ہو رہی تھی کہ یہاں فوجیوں کی آمد و رفت بھی تھی اور انہیں جنس کے عمل کے لوگ بھی موجود رہتے تھے۔

اتوار 30 / ستمبر کی صبح کو 9:30 پر دو افغان میرے کمرے میں لائے گئے اور مجھے بتایا گیا کہ یہ کابل سے آنے والے دو صحافی ہیں۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ سارے مغربی میڈیا کو باہر دھکیل دیا گیا ہے۔ تاہم میں نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں بے حد اشتیاق سے اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی۔

یہ میرے لئے ایک ولولہ انگیز بات تھی کیونکہ میرا خیال ہے کہ صحافی خواہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کام کر رہے ہوں ان کے مابین ایک خصوصی تعلق ہوتا ہے۔ مجھے امید لگی کہ شاید یہ میرے لئے کوئی پیغامات چھپا کر لانے پر رضامند ہو گئے ہوں اور اب انہیں مجھ تک پہنچانے کے لئے انہوں نے یہ ترکیب نکالی ہو۔ حامد نے مجھے کہا کہ میں اپنی سنووری سناؤں اور وہ اس کا ترجمہ کرنا چاہائے گا۔

میرے کہانی شروع کرنے کے تین یا چار منٹ ہوئے ہوں گے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس کے نقاط نہیں لکھ رہے

بد نیتی میں بھی شرافت

اس کے بعد کوئی ملاقاتی نہیں آیا، میں نے سوچتے سوچتے سونے کی کوشش کی اور بالآخر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح کے اولین اوقات میں دروازہ کھانے کی آواز سنائی دی۔ پھر گردن کے پچھلے حصے کے بالوں میں کچھ چھن محسوس ہوئی مگر میں نہ ہلی۔ میں گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے (Foetal) پوزیشن میں تھی۔ ادھ کھلی آنکھ سے دیکھا تو کسی آدمی کا خاکہ نظر آیا۔

پھر دروازہ بند ہوا تو گھپ اندھیرا ہو گیا۔ میں اطمینان کا سانس لینے ہی والی تھی کہ وہ چلا گیا ہے، دیکھا تو وہ میرے کمرے کے اندر ہی ہے۔ میں نے سوچا کہ چیخ مار دوں۔ اگر مارتی تو شاید آواز ہی نہ نکلتی کیونکہ مرا منہ ریگ مار کی طرح خشک ہو چکا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھکا، مجھے غور سے دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ میں سو رہی ہوں میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اس کی موجودگی کو دیر تک محسوس کرتی رہی۔ پھر وہ میرے ساتھ چٹائی پر لیٹ گیا اور مجھے آہستگی سے بلایا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی، میری آنکھوں سے خاموش آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔

میری آنکھیں اگرچہ اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں، میں ایک طالب کا صرف سیاہ خاکہ دیکھ سکتی تھی مگر وہ باہر سے آنے والی چاند کی روشنی میں، جو میرے چہرے پر پڑ رہی تھی رخساروں پر بہتے آنسو دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا بازو اوپر کواٹھایا اور میں خوف سے سہم گئی۔ میں نے اسے کہا، خدا کے لئے اس سے باز رہو۔ اس پر وہ رک گیا پھر ہاتھ کی پشت سے میرے آنسو خشک کئے اور اٹھ گیا۔ اس نے آہستگی سے پشتوں میں مجھ سے معافی مانگی اور چلا گیا۔

اگلی صبح سویلین ترجمان حامد ناشتے سے پہلے مجھ ملنے آیا اور کہا۔ ”میرے پاس ایک آدمی آیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ اسے اس بات پر بہت تشویش ہے کہ آپ کورات ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔“ میں نے حامد سے کہا کہ میں تو خوب اچھی طرح سوئی رہی ہوں، مجھے پتہ نہیں وہ کیا بات کر رہا ہے۔ اس نے پھر کہنے کی کوشش کی ”اس آدمی کو اس بات کی پریشانی ہے کہ آپ کو ٹھیک نیند نہیں آتی اور یہ کہ شاید آپ بہت پریشان ہیں۔“

اس کی باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ رات کو میرے کمرے میں آنے والا خواہ کوئی بھی تھا، ”سخت تکلیف“ میں تھا اور یہ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا میں کوئی شکایت کرنے والی ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ ”نہیں مجھے رات کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے میں نے کوئی برا خواب دیکھا ہو، اگر تھا تو وہ گزر گیا ہے اور میں نے بھلا دیا ہے۔“

اس نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا اور یہ خوشخبری لے کر ”اس آدمی“ کو پہنچانے چلا گیا جو رات کو میرے پاس آیا تھا، خواہ وہ جو کوئی بھی تھا۔ میں یقیناً اس کی شکایت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ طالبان کی مخصوص دنیا میں اس شکایت کا فیصلہ یوں ہی ہونا تھا کہ ابتدائی تصور تو میرا ہی تھا۔

ٹانیا، آنے والے نے جب دیکھا کہ میں نے اس کے یوں اندر چلے آنے پر اذیت محسوس کی ہے تو اس کے اندر اتنی شائستگی تھی کہ وہ معافی مانگتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں مغرب میں ایسے مردوں کا بمشکل تصور کر سکتی ہوں۔ عورت کو ایسے مواقع پر قطعی ”نہ“ کرنے سے پہلے بہت چیخنا چلانا پڑتا ہے اور وہ پھر بھی نہیں ملتے۔

جیلر عبداللہ بعد میں اندر آیا اور اس نے دروازے کے اندر کی جانب لگے ہوئے تالے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ میں رات کو یہ تالہ لگا لیا کروں تاکہ کوئی اندر نہ آ سکے۔

حامد نے جس نے انگریزی بولنا پاکستان میں سیکھا تھا، ایک بار پھر مجھے بتایا کہ میرے کھانا نہ کھانے سے یہاں شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ اتنے میں ڈائریکٹر آ پہنچا، اس کے آنے پر اگرچہ میں نے واضح طور پر یہ تاثر لیا کہ اسے حامد کی خدمات ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود اس نے اسی کے ذریعے مجھے بتایا کہ وہ ٹیلی فون کی سہولت دینے سے معذور ہے کیونکہ مواصلاتی نظام میں شدید خرابیاں ہیں اور کالیں سیٹلائٹ ٹیلی فون کے بغیر نہیں ملانی جا سکتیں۔

اگر انہوں نے مجھے ٹیلی فون تک رسائی کرا دی ہوتی تو میں نے اپنے اخبار کو ان خوبصورت لوگوں کے بارے میں، جنہوں نے میرا اپنے گاؤں ”کاما“ میں پر جوش خیر مقدم کیا ایک اچھا منچر مہیا کر دیتی اور جلال آباد مارکیٹ کے گرد و پیش کی زندگی کی تفصیلات بھی بتا دیتی۔ یہ ہفتے کا روز جو وہاں میرے لئے مصروف ترین دن ہوتا مجھے لگتا تو نہیں تھا کہ ان تک یہ اطلاع کسی نہ کسی طریقے سے پہنچ گئی ہو کہ میں طالبان کے ہاتھ لگ گئی ہوں۔

طالبان انٹیلی جنس کے دو افراد میرے انٹرویو کے لئے آئے، میں نے ایک بار پھر ان سے معذرت کی کہ میری گرفتاری کی وجہ سے آپ کے لئے کئی مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے میرے اس احساس کی قدر کی ہے۔ انہیں جو بات سمجھ نہیں آرہی تھی، یہ تھی کہ کسی کو خواہ وہ صحافی ہی سہی ان کے ملک میں آنے کی کیا ضرورت آپڑی ہے جبکہ بہت سے لوگ یہاں سے باہر جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اور نہ ہی ان کا کوئی ٹیپ ریکارڈ چل رہا ہے۔ تو مجھے فوراً شبہ پڑ گیا، مجھے وہ ”چوہے“ (منجر) لگے جو مجھ پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ میں نے الزام لگایا آپ کوئی جعل ساز ہیں یا اس سے بھی بدتر ایسے صحافی ہیں کہ انہیں صرف وہی کچھ لکھنے کے لئے ”بھرتی“ کیا گیا ہے جو اجرت و بندہ ان سے لکھوانا چاہتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت مجھے کتنا غصہ آیا تھا اور مجھ میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی کہ میں نے ان سے کہہ دیا کہ تم نے میرے میزبانی کا ناچائز فائدہ اٹھایا ہے۔ پھر میں نے انہیں کمرے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ حامد نے کہا کہ یہ لوگ بہت اہم ہیں۔ مجھے ان سے احترام کا سلوک کرنا چاہیے۔ لیکن میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اپنے بازو باندھ لیے اور کھڑکی میں سے باہر خوبصورت باغیچے کو دیکھنے لگی۔ حامد ان سے اس دوران کیا کہتا رہا، کیا میری کہی ہوئی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا یا معذرت کرتا رہا۔ میں نہ سمجھ سکی البتہ میں نے یہ محسوس کر لیا کہ اگر میری ترجمانی کرتا رہا ہے تب بھی بڑی تکلیف وہ حالت میں تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

”مجھے ایک ریڈیو دے دیا گیا ہے تاکہ میں ”بی بی سی ورلڈ سروس“ سن سکوں اور مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ کیا مجھے مزید کسی چیز کی ضرورت ہے۔“

اس روز سے متعلق اندراج میں مزید یہ الفاظ تھے:

”حامد کہتا ہے کہ یہاں ہر کوئی اس بات پر پریشان ہے کہ میں کھانا نہیں کھاتی، وہ پوچھتا ہے کہ کیا کھانے میں کوئی خرابی ہے؟ کیا میں کوئی خاص غذا کھاتی ہوں یا میں ہونٹل سے لایا ہوا کھانا پسند کروں گی۔ وہ اکثر میرا بطور مہمان ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر میں ٹمکین ہوں تو وہ بھی ٹمکین ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں مان سکتی۔ طالبان مجھ پر مہربانیاں نبھا کر کے مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

یہ لوگ کئی پہلوؤں سے کورکھوں کی طرح ہیں۔ یہ بے حد نرم، انتہائی شریف اور دوسروں کا احساس رکھنے والے ہیں۔ لیکن جب لڑائی کی نوبت آجائے یہ دنیا کے خوفناک ترین جنگجوؤں میں سے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر کوئی یہ جان لے کہ مجھ سے کیا اچھا سلوک ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ بتا دینے سے شاید مجھے سکون آجائے گا۔ میں شرط یہ کہتی ہوں کہ باہر کے لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے اذیتیں دی جا رہی ہیں، زدوکوب کیا جا رہا ہے اور جنسی بدسلوکی کا نشانہ بنائی جا رہی ہوں۔ یہ قطعاً غلط ہے اس کے برعکس مجھ سے شفقت اور احترام کا سلوک ہو رہا ہے۔ یہ کتنی ناقابل یقین اور حیرت انگیز بات ہے۔

خدا کی مار، میں کسی طرح ریڈیو توڑ بیٹھی۔ مجھے اب تک معلوم نہیں کہ دنیا کو میرے حال کے بارے میں کچھ معلوم ہے یا نہیں۔ البتہ میں نے آٹھ عیسائی عورتوں کے بارے میں ایک بلیٹین سنا ہے کہ انہیں کابل میں حوالات میں بند کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجھ سے کچھ اور سوالات بھی ہوئے تھے، میں چاہتی ہوں کہ میری ڈائری ان کا حال بھی سنا دے:

روز سہ، ۱۰ تاریخ یکم اکتوبر

تفتیشی انسروں کی پوچھ گچھ گھنٹوں جاری رہتی ہے۔ سوالات بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ فضا میں جس ہوتا ہے، میں بہت گھبراہٹ محسوس کرتی ہوں۔ اس دفعہ میرا انٹرویو ایک دبلے قتلے، سخت گیر اور عالمانہ شان رکھنے والے شخص اور ایک سرخ داڑھی والے بھاری بھر کم شخص نے لیا، مجھے دونوں سے خوف آتا ہے کیونکہ ان کے چہروں پر کڑی سختی نمایاں ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کر رہی تھی کہ میں نے بارڈر کیوں عبور کیا، وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہو پا رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے موقف کی وضاحت کی، حامد میرے جوابات ان تک پہنچا رہا ہے۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ وہ میرے موقف کو سمجھ چکے ہیں۔

مجھے ابھی ابھی احساس ہوا ہے کہ تفتیش میں کچھ پیش رفت ہو رہی ہے، کیونکہ حامد نے مجھ سے پھر پوچھا ہے کہ میں ”صحیح صحیح“ اس بات کی وضاحت کروں کہ میں چوری چھپے افغانستان میں کیوں گھسی ہوں۔ میں نے برہم ہو کر اپنے بازو فضا میں لہراتے ہوئے یہ آواز بلند کہا ”کیونکہ میں طالبان میں شامل ہونا چاہتی تھی۔“ یہ بہت احمقانہ بات تھی جو میرے منہ سے جھنجھلاہٹ کی وجہ سے نکل گئی تھی۔ یہ اس قسم کا تبصرہ تھا جو میرے ہونٹوں سے نکلے ہی مجھے گولی مار دیئے جانے کی مستحق بنا سکتا تھا۔

میرے تفتیش کاروں نے اس لمحے تک اپنی نظریں، میرے پیچھے کی دیوار پر گاڑ رکھی تھیں۔ حامد اس جیلے کا پشتو میں ترجمہ کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا، اور وہ دو حضرات اپنی جگہ سے کچھ ہلے اور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ اس سے ان کے اندر جس مزاح کی موجودگی کا انکشاف ہوا جو عام حالات میں ان خوفناک طالبان سے کبھی منسوب ہی نہیں کی جاسکتی۔

تفتیش کاروں کے اندر لطیف جذبات کی موجودگی کا پتہ چلنے سے مجھے کچھ سکون ملا۔ تاہم پانچ منٹ کے بعد ہنسنے کی باری میری تھی۔ جب انہوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں امریکا کی خفیہ ایجنٹ ہوں۔ میں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ”اور میں امریکا کا خفیہ ہتھیار ہوں تو امریکا پر خدا ہی رحم کرے۔“ پھر میں نے کہا کہ میں خفیہ ایجنٹ ہوتی تو یقینی طور پر میرے پاس جیمز بانڈ جیسے آلات ہوتے جبکہ میں صرف ایک نکلون کیمرے کے ساتھ داخل ہوئی ہوں۔

انہوں نے پوچھا کہ میں نے کون کون سی تصویریں بنائی ہیں؟ میں نے بتایا کہ صرف چند ایک بنائی ہیں، انہیں ڈیویس کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے مجھ پر مشکف ہوا کہ کسی نے میرا کیمرہ کھول کر فلمیں تباہ کر دی ہیں یا ایسا ہوا ہے کہ چونکہ افغانستان میں فوٹو گرافی کی ممانعت ہے اس لئے ملک بھر میں اس کی پروسسنگ کا کوئی انتظام نہیں ان کی طرف سے اسی قسم کے اور بھی بہت سے سوال پوچھے گئے۔ اس دوران میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے جھلا کر کہا، میں مزید کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ میں آپ سے پوری طرح تعاون کرتی رہی ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے طالبان کے لئے بہت سی الجھنیں پیدا ہوئیں، جبکہ اس وقت

پُرکشش تفتیش کا

اس روز دوپہر کو پھر میرے لئے کھانا لایا گیا مگر میں نے نہیں کھایا۔ تین افراد میری تفتیش کرنے کے لئے آئے۔ ان میں سے ایک کا تعارف بطور ہیڈ آف انٹیلی جنس کرایا گیا۔ یہ بہت بارعب شخصیت کا مالک تھا، گھنی سیاہ داڑھی اور گلابی رخسار تھے۔

مجھے وہاں جتنی داڑھیاں نظر آئیں وہ زیادہ تر سوکھی سڑی، الجھی اور لا پرواہی سے رکھیں ہوئی تھیں مگر اس داڑھی میں ایک عجیب کشش تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کم و بیش کالی اور شارک مچھلی کی سی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ اس سے مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ بہت خطرناک دکھائی دیتا تھا اور واقفان بھی ایسا تھا۔

ان نو واردوں نے حامد سے پوچھا کہ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں اس ملک میں کیسے داخل ہوئی اور اس میں میری کس نے مدد کی، اور یہ سوال بھی تھا کہ میں اپنے ہمراہ گرفتار ہونے والے دوسرے دو افراد کو میں کیسے جانتی ہوں۔ پھر پچھلے روز ہونے والے واقعہ کے حوالے سے بھی سوالوں کا بھی جواب مانگا گیا۔

میں نے اپنے ہمراہ گرفتار ہونے والوں کے بارے میں کہا کہ ان آدمیوں کا مجھ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں، وہ کار خانہ زندگی میں پائے جانے والے محض پُٹو ہیں۔ اُنہا میں نے سوال داغ دیا کہ طالبان نے انہیں کیوں گرفتار کیا ہے؟ اس پر وہ بہت برہم ہوئے جیسا کہ میں نے ان کی انٹیلی جنس کی توہین کر دی ہو۔ ایک جو گھنی داڑھی والا تھا وہ اپنے غصے کو روک نہ سکا، لگتا تھا کہ وہ ابھی کوئی خطرناک ہتھیار نکال کر مجھے دے مارے گا۔

پھر میں نے کہا کہ اچھے صحافی اپنے ضابطہ اخلاق کی سختی سے پابندی کرتے ہیں، وہ اپنے رابطہ کاری ذرائع اطلاع کا کبھی نام نہیں بتاتے، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے یہ دلیل بھی دی کہ کوئی اور سمجھے یا نہ سمجھے، آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ اپنے مہمان کی حفاظت کرنا ایک اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے، اور یہ آپ کی روایت بھی ہے۔

میرے اس جملے سے اسامہ بن لادن کی طرف اشارہ نکلتا تھا، جس کے بارے میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس کی حیثیت ایک مہمان کی ہے اور مہمان کی حفاظت ان کی عزت و ابرو اور روایت کا مسئلہ ہے، مغرب نے ان کے موقف کو نظر انداز کر دیا تھا۔ دوران گفتگو وہ میرے چہرے کی طرف نہیں دیکھتے تھے، بلکہ ادھر ادھر خالی نظر میں ڈالتے رہتے یا چھت پر لگی کسی چیز کو دیکھتے رہتے تھے۔ مجھ پر بعد میں منکشف ہوا کہ افغان کلچر میں یہ چیز عزت کی علامت ہے۔ دوسری جانب حامد کئی دفعہ مجھے ڈانٹ کر کہہ چکا تھا کہ ”جب میں تم سے مخاطب ہوں تو میری طرف دیکھا کرو۔“ اس پر وہ ناراض ہونے کی کوشش کرتا اور جارج دکھائی دیتا مگر میں اس پر ہنس پڑتی کیونکہ میں محسوس کرتی تھی کہ وہ اپنی روایت کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اسی روز بعد میں ایک ڈاکٹر میرے چیک اپ کے لئے آیا۔ میرا تصور ان دنوں فی الواقعہ ”اورنامہ“ کام کرنا رہتا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ لوگ مجھے اذیت دینے سے پہلے مجھے صحت کا ”کیمین بل“ دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ چھوٹے سے قد اور سوکھے ہوئے چہرے والا شخص میرے کمرے میں آیا میرا بلڈ پریشر لیا اور اس عمل کو کوئی دفعہ دہرایا۔ اس پر میں نے کہا: ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں جانتی ہوں کہ مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے۔“

اس نے ایک بار پھر بلڈ پریشر چیک کیا اور مجھے دیکھایا، میں حیران ہو گئی ”اوہ خدایا، یہ تو واقعی نارمل ہے۔ طالبان کے ساتھ تین ہی دن گزارنے سے میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا ”واہ! مجھے بہت خوشی ہوئی۔“ پھر اس نے حامد کی طرف سے مداخلت ہونے پر اسے پشتو میں کچھ کہا، جس نے ترجمہ کر کے مجھے بتایا کہ ”ڈاکٹر کہتا ہے کہ کچھ کھالے ورنہ تو مر جائے گی۔“

کچھ دیر بعد عبد اللہ آیا اس کے ہاتھ میں ریڈیو تھا، حامد نے کہا کہ اگر میں بی بی سی لگاؤں تو اپنے بارے میں کچھ باتیں سن سکوں گی۔ ”آپ بڑی اونچی لیڈی ہیں، بہت مشہور ہیں، ہر کوئی آپ کی باتیں کر رہا ہے۔“ یہ دونوں بہت پر جوش دکھائی دے رہے تھے اور میں تیزی سے چینل تلاش کر رہی تھی۔ مجھے ایک ”سا کر رپورٹ“ سننے کو ملی یہ کھیلوں کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ میں انگش آوازن کر پھولی نہیں سمار رہی تھی۔ خوشی کی وجہ سے ریڈیو میرے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ سٹیشن ہی غائب ہو گیا۔ اتنے میں کچھ مزید کھانا میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا لیکن میں کھانے سے انکار کر دیا اور حامد سے کہا کہ جب تک ماں سے بات نہ کرائی گئی، میں دوبارہ نہیں کھاؤں گی۔ ریڈیو سے خبر نشر ہو جانے کے بعد ماں سے بات ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی قید کے دوران ایک ٹوتھ پیسٹ کارشن کے اندر کی جانب بڑے سلیقے سے تاریخوں کی ایک لسٹ بنائی اور چند مختصر نوٹ لکھے تھے۔ میں جب اپنی اس ”خفیہ ڈائری“ کو دوبارہ دیکھتی ہوں تو میرا ذہن مجھے پھر انہی تجربات میں سے گزرتا ہے۔ میں اپنے ساتھ ان کے سلوک پر حیران رہ جاتی ہوں۔ اس خاص اتوار کے بارے میں میرا اندراج یہ تھا:

ان کی توجہ منقسم ہوئے بغیر کسی اور چیز پر مرکوز رہنی چاہئے تھی۔

میں نے ان کے ملک میں بغیر پاسپورٹ اور ویزا داخل ہونے کا اعتراف کر لیا تھا اور اب اس میں کسی مزید اضافے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ بہت ناراض ہیں مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ یہ ملاقات اب خوشگوار جملوں پر ختم ہو جانی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ مجھے ایک یا دو دن میں گھر واپس جانے کی اجازت مل جانی چاہیے، اور میں اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ یہ جملہ سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے اگرچہ ”ایک یا دو دن“ میں رہائی کے وعدے پہلے بھی کئی بار ہو چکے ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ایک سرخ گدے پر جسے میں بطور بیڈ استعمال کیا کرتی تھی، لیٹی ہوئی تھی کہ مجھے باہر سے کوئی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ ایک نام نہاد صحافی ہاتھ میں کوئی ایسی چیز لئے کھڑا ہے جو سیٹلائٹ ٹیلی فون جیسی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ رات بھر کے لئے یہاں بطور مہمان ٹھہرا ہوا ہے اور میری کچھ مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے سے میری ماں کا ٹیلی فون نمبر پوچھا اور کہا کہ وہ اسے میرا پیغام پہنچا دے گا۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اگر اجنبی مرد کی زبان سے فون پر میری خیریت سنی تو وہ اور بھی زیادہ پریشان ہو جائے گی۔

میں نے اس سے ٹیلی فون استعمال کرنے کی اجازت مانگی اور لجاجت بھی کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ پھر میں نے پردہ کھینچ لیا کیونکہ عبداللہ کمرے میں یہ دیکھنے آ گیا تھا کہ کیا مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے اور اس نے مجھے یاد دلایا کہ مجھے دروازہ اندر سے مقفل کرنا ہے۔ اس سے پہلے وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ باہر سے نالہ نہیں لگایا کرے گا کیونکہ میں نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے رات کے دوران ہاتھ روم کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی ماں کے نام ایک رقعہ لکھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اسے یہ بتایا کہ ”ننا“ (میری آنجنمانی نانی) اوپر کے جہان سے میری نگرانی کر رہی ہے۔

میں نے سب کے نام پیار اور خیر سگالی کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ میرے باپ سے کہنا کہ میں ہمت سے ہر چیز کا سامنا کر رہی ہوں، اور یہ بھی کہا کہ اُمید ہے ڈیزی بورڈنگ سکول ہی میں رہے گی، وہاں اس کی زندگی اچھی گزرے گی یہ نوٹ بے ضرر سا تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ ان الفاظ سے اس پریشانیوں میں کمی واقع ہوگی۔ میں دوبارہ کھڑکی کے پاس گئی اور رقعہ مچھر دانی کے سوراخ میں سے باہر دھکیل دیا۔ سیٹلائٹ ٹیلی فون والے آدمی نے وہ بخوشی لے لیا اور میں نے اسے اشارتاً کہا کہ اگر یہ منزل پر پہنچ گیا تو میں اسے اصل سٹوری سے مطلع کر دوں گی۔ میں نے اپنے نوٹ میں لکھا:

”اُمید ہے کہ یہ آدمی ٹھیک ہوگا لیکن کیا پتہ اصل حقیقت کیا ہے۔ میری اشد خواہش تھی کہ کاش میں ماں سے بات کر سکتی اور ڈیزی کا حال پوچھ لیتی۔ بدھ کو اس کی سالگرہ ہے۔ وہ مجھ سے ایک کارڈ اور ایک تحفے کی توقع کر رہی ہو گی۔ میں چاہتی ہوں کہ باہر کے واقعات سے آگاہی پاسکوں اور جان سکوں کہ کیا بمباری شروع ہو چکی ہے۔ میں خود کو بالکل تنہا پارہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ کیا میری خاندان کے علاوہ بھی کسی کو میری صورت حال کی کچھ فکر ہے۔“

اودھ اور وہ ہے۔ اپنی تاریخ کی کتابوں میں دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنا بڑا جنگجو تھا۔“
میں نہایت بے شرمی کے ساتھ اس کا نام استعمال کر رہی تھی تاکہ اس سوراخ میں سے کسی طرح نکل جاؤں، مجھے یقین تھا کہ وہ میری رہائی میں مدد کرے گا لیکن جب میں نے ڈیوڈ کا نام لیا تو اسے حیرت تک نہیں ہوئی۔ کچھ سر گرمیاں جاری تھیں مگر مجھے ان کی نوعیت معلوم نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے دوبارہ ان دو آدمیوں کے بارے میں پوچھا اور اپنی بات دہرائی کہ انہیں بہت مارا بیٹھا جا رہا ہے۔

میں نے کہا: ”جو چاہو ان سے کرو، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر آپ لوگ بے گناہوں کو اذیت دے کر مزا لیتے ہیں تو لیتے رہے۔ مجھے لکھنے کو ایک اچھی سٹوری مل رہی ہے جو میں رہائی کے بعد لکھوں گی۔ اپنے طالبان دوستوں کو یہ بات ضرور بتا دینا۔“

سانپ اور سٹریٹس کا حمل

اس بات پر وہ ٹھٹکا اور فوراً باہر نکل گیا۔ باقی سارا دن میں نے اکیلے گزرا۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے یہ زیر تفتیش رہنے سے بھی بدتر تھا۔ مجھے یہ فکر لگ گئی کہ میں بہت دور جا نکلی ہوں۔ اب کسی اذیت سے دوچار کر دی جاؤں گی۔ میں تو سانپ اور سیڑھی والا کھیل کھیل رہی تھی۔ اگر ایک پوائنٹ جیتی تھی تو دوسرے پوائنٹ سے دھڑام نیچے جا پڑتی تھی۔

میں نے 2 / اکتوبر کو جوڈائری لکھی، اس کے آغاز ہی میں اپنی مایوسیوں کی گہرائی کا انکشاف کر دیا:
اب 7 بجے شام کا وقت ہے، مجھے دن بھر تنہائی کی اذیت برداشت کرنا پڑی ہے۔ نضا میں بے حد کشیدگی ہے، دہشت ناک مستقبل سے دوچار ہونے والی ہوں۔ کھانا لانے اور واپس لے جانے کے لئے آنے والوں میں سے کوئی بھی میرے چہرے کی طرف نہیں دیکھتا۔ بے حد الجھن ہے۔ شدید خوف محسوس ہو رہا ہے۔

بڑی گھمبیر نضا طاری ہے۔ واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ اب میں گھر واپس نہیں جا رہی۔ شاید یہ مجھے ہلاک کرنے والے ہیں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا کیونکہ اب مجھے کچھ شبہ ہو گیا ہے۔ ہاتھ روم میں ایک پرانا زنگ آلودہ ریزر بلیڈ پڑا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ میں اسے اپنے صابن میں چھپالوں۔ اگر میں موت کو گلے لگانا چاہوں تو اس کا طریقہ مجھے خود سوچنا ہے۔ اگر وہ مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں تو وہ اس کے لئے کونسا عمدہ طریقہ اختیار کریں گے؟ عبد اللہ اور حامد کہاں ہیں؟

میں نے ابھی ابھی اپنے کمرے سے نکل کر، سامنے ڈائریکٹر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے میں نے کسی چڑچڑے آدھی کونیند سے جگا دیا ہو، اس نے نہایت نفرت سے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے چلو ہٹو کہہ دیا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن مجھے اس سے بہت خوف محسوس ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ڈائریکٹر سے بات کرنی ہے۔

یہ عجیب رات تھی، جب میں ڈائریکٹر کے کمرے سے واپس آئی تو عبد اللہ اور حامد دوڑتے ہوئے میرے پاس پہنچے اور کہا ہمیں آواز آئی تھی کہ آپ ڈاکٹر کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ خیریت تو ہے ناں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا، میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن مجھے ڈائریکٹر سے بات کرنی ہے، ڈاکٹر سے نہیں۔ میں نے حامد سے کہا کہ صاف نظر آ گیا ہے کہ میں افغانستان سے نہیں نکل سکتی۔ اور یہ کہ مجھے ایک قانون دان کی ضرورت ہے تاکہ میں اپنی آخری وصیت لکھوا سکوں۔

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ڈائریکٹر مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ حامد بھی تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے ایک قانون دان کی خدمات کی ضرورت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک بنیادی انسانی حق ہے، اور مجھے اس سے کوئی محروم نہیں کر سکتا اور نہ انکار کر سکتا ہے۔

میں جب بھی اپنی ڈائری کے اس حصے پر پہنچتی ہوں، میرا دم گھٹنے لگتا ہے، یہ اس ریزر بلیڈ کی وجہ سے ہے جسے میں ہر روز ہاتھ کی ایک سائید پر پڑا پاتی تھی لیکن اس روز میں نے اسے اٹھا لیا۔ یہ پاکستان میں بنا ہوا بلیڈ تھا، اس کے ٹریڈ مارک کا نام ”وٹیج“ تھا، مجھے اسے اپنے پاس رکھ لینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ یہ مجھے خود پر قابو پانے میں کچھ مزید مدد دے گا۔ اور میں فیصلہ کر سکوں گی کہ کیا مجھے اپنی جان لینی ہے، اور لینی ہے تو کب؟

میں طبعاً مائل بہ خودکشی انسان نہیں ہوں لیکن میں چاہتی تھی کہ میری موت اگر واقع ہو تو خون زیادہ بہہ جانے سے ہو، نہ کہ پتھر لگ لگ کر مردوں، یا کسی ایسے طریقے سے اذیت دی جائے کہ وہ حد برداشت سے بڑھ جائے۔ یہ باتیں مجھے اب دن کی ٹھنڈی روشنی میں اپنے گھر میں محفوظ بیٹھے ہوئے بڑی مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ لیکن لمحہ بھر کے لئے پیچھے جا کر 11 ستمبر کے واقعہ کو سوچئے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرنا درست نہ لگتا ہو لیکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے بعض آفس روکرز نے اوپر سے چھلانگ لگا کر موت کی آغوش میں چلے جانے کو اس دوزخ میں

میں چاہتی ہوں کہ یہ مجھ میری جان چھوڑ دیں، میرے ٹخنوں، چہرے اور کلائیوں پر جگہ جگہ ان کے کانٹے کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔ اتنی جلن ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اپنی کھال کو چھیل ڈالوں۔ میں انہیں مارنے کو اوپر نیچے لپکتی ہوں مگر یہ مکروہ مخلوق بھاگ نکلتی ہے۔ آج بیزاری کا احساس بہت ہی زیادہ ہے۔ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ یہ کمرہ سات گز لمبا اور پانچ گز چوڑا ہے۔ مجھے کل جو پنکھا دیا گیا تھا وہ ایک منٹ میں سات بار چکر لگاتا ہے۔ گھنٹے میں 420 بار اور.....

یو آنے رڈ لے..... زندگی کا یہ مزہ بھی چکھ لیا ہے نا..... میں سوچتی ہوں کہ کیا میں ٹوٹ پھوٹ رہی ہوں۔ میں کسی حد تک اسے ایک معمول سمجھتی ہوں مگر یہ معمول کی صورت حال نہیں ہے۔ سوچتی ہوں کہ میرے دفتر کے حالات کیسے چل رہے ہوں گے، کیا میری جاب تا حال برقرار رہے۔ انہیں اب تک معلوم ہو چکا ہوگا کہ میری مہم بڑی طرح نا کام ہو چکی ہے۔ کاش انہیں پتہ لگ سکتا کہ میں رہائی کے کتنے قریب پہنچ گئی ہوں۔

میں گھنٹوں کھڑکی میں سے، اس جگہ کے ارد گرد کے خوبصورت باغوں کو دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ کوئی پولیس سٹیشن ہوگا۔ نہ ہی یہ کوئی فوجی مقام ہے۔ ایک چھوٹی سی ندی باغ کے گرد گھومتی ہوئی گزرتی ہے اور سورج کی روشنی اس سے خوب منعکس ہوتی ہے۔

کاش "SAS" والے مجھے چھڑوا لیں، میرا خیال ہے کہ وہ ملک میں ضرور موجود ہوں گے۔ پتہ نہیں انہیں میرے بارے میں کچھ بتایا جا چکا ہے یا نہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو چکا ہے تو وہ کوئی نہ کوئی تدبیر کر رہی رہے ہوں گے۔ یہ بھی سوچتی ہوں کہ کیا میں فرار ہو جاؤں۔ انہوں نے برقع تو ابھی تک میرے پاس ہی رہنے دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدھی رات کو نکل جاؤں۔ یہ خطرناک تو بہت ہوگا۔ اگر خطرہ یہاں اندر ہی بن گیا، تو پھر کیا کروں گی۔

خداوند ایہ کیا طوفان ہے!

نمازیں، افطار اور حیل

اگلے دن تفتیش نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا، کسی وجہ سے طالبان میرے خاندان کے مردارکان کے بارے میں متحس ہو گئے۔ انہوں نے دادا کا نام پوچھا، وہ تو مجھے یاد نہ تھا، نہ بتا سکی تو وہ ہکا بکا رہ گئے اور اسے میرے طرف سے بے ادبی کا اظہار سمجھا۔ "وہ تو میرے پیدائش سے پہلے بہت پہلے فوت ہو گیا تھا، مجھے تو کسی نے اس کا نام نہیں بتایا۔" میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اب سوال و جواب کی سمت بھی تبدیل ہو گئی اور وہ کسی فائل کو دیکھتے اور حوالہ جات کو چیک کرتے جا رہے تھے۔ میں سخت کشمکش میں پڑ گئی اور ڈر بھی رہی تھی کہ پتہ نہیں میرے بارے میں کیسی معلومات ان کے پاس پہنچ گئی ہیں۔ میں پچھلے ہفتے سے پہلے تو اس ملک میں کبھی آئی ہی نہیں، یہ کیا چیز ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

انہوں نے پوچھا کہ کیا میں کبھی ایران گئی تھی؟ میں نے نفی میں سر ہلایا اور سوچا کہ کیسا بے ہکا سوال ہے۔ میں ایران دیکھنا چاہتی تھی اور پچھلے سال ڈیزی کو ساتھ لے کر وہاں جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن مجھے بتایا گیا کہ وہ حکومت "سنگل مدرز" (ایسی بے شوہر عورتیں، جن کے ہمراہ بچہ ہو لیکن بچے کا والد کوئی ایسا شخص ہو جس کی وہ منکوحہ نہ ہو) کو برداشت نہیں کرتی۔ میرا وہاں جانا خطرناک تھا کیونکہ اسلامی فنڈ منگلت مجھے سنگسار کر ڈالتے۔

یہ منگل 2 / اکتوبر کا دن تھا۔ اس بارتین یا چارافرار سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ میں چکر اکر رہ گئی۔ ان کے جانے کے بعد حامد واپس آیا تو میں سوچنے لگی کہ کہیں یہ خود بھی انتہائی جنس انفر تو نہیں۔ اس کے سر پر پگڑی نہیں تھی، واڑھی کم مقدار مگر بکھری ہوئی تھی، مجھے بعض اوقات اس سے وحشت ہونے لگتی تھی۔

اس نے مجھے کہا کہ "آپ سخت مصیبت سے دوچار ہونے والی ہیں، آپ نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں سچ سچ نہیں بتایا۔ اپنی بیٹی کا ذکر ہی نہیں کیا جس کا نام ڈیزی ہے، اور بھی کئی باتیں ہیں جن سے آپ نے طالبان کو بے خبر رکھا ہے۔ یہ آپ کے لئے بہت بری خبر ہے۔"

"میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن اگر آپ سچ نہیں بتائیں گی میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ نے اپنے ہمراہ پکڑے گئے دو آدمیوں کے بارے میں بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے اور انہیں مارا پیٹا بھی جا رہا ہے۔"

مجھے محسوس ہونے لگا جیسے مجھے بخار ہو گیا ہو، اب میں حامد پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی اور نہ اسے اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ تاہم مجھے اس کو یہ بتانا یاد تھا۔ "تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا میری کوئی بیٹی ہے، میں نے کہا میں سنگل ہوں اور تم سیدھے دوسری بات کی طرف چلے گئے، میں ڈیزی کے باپ کے ساتھ اب نہیں رہتی۔ کیا آپ اس ملک کے لوگ علیحدگی کے تصور سے بالکل ناواقف ہیں۔"

میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا والد ایک فلسطینی ہے۔ سنی مسلمان ہے اور اس کا نام ابو حامد یاد

بل کر مرنے پر ترجیح دی تھی جس نے انہیں اچانک آلیا تھا۔ اس طرح مجھے بھی ایک انتخاب کرنا تھا، چنانچہ
 میں نے ”نویسج“ بلیڈ، ٹرکس سوپ کی ٹمکیہ کے اندر چھپا لیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ صابن قید کے پہلے ہی دن دیا تھا۔
 اگلے روز میرے لئے پھر ایک ہنگامہ خیز دن تھا، اس کا آغاز بہت اچھا ہوا تھا، مجھے نئے کپڑے دیئے گئے تھے۔ پہلے
 تو تقریباً سات دن رات نارنجی ڈیرس، سلوار میض میں رہی، جن میں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ گرمی اور پینے سے
 میں کتنی بدبودار ہو چکی تھی۔ عہد اللہ نے مجھے نئے کپڑے پیش کئے تو میں مذہبی اور ثقافتی اختلافات کو بالائے طاق
 رکھ کر اس کے ساتھ گرمجوشی سے لپٹ گئی اور وہ مسکرا دیا لیکن میری اس شوخی پر گھبرا گیا۔ ان کپڑوں میں سے ایک
 براؤن اور کریم کاشن ڈریس مع براؤن شلوار تھا اور دوسرا انتہائی سادہ جیل کا عمومی لباس تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ شادی
 کا ڈریس تھا۔ اس شے کی بعد میں توثیق ہونا تھی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

سے واپسی میں تاخیر ہو جائے گی۔ ادھر وہ جوتوں کی تلاشی میں مارا مارا پھر رہا تھا، واپس آ کر اس نے جلدی جلدی میرے پاؤں کا ناپ لیا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے کے لئے چلا گیا۔ یہ انتظار بہت کرہناک تھا اور میں گھبرانا شروع ہو گئی۔

انٹیلی جنس کے لوگوں نے میرے ساتھ چند نفسیاتی کھیل کھیلے تھے۔ وہ مجھے بار بار بتاتے رہے کہ بس اب تم جاری ہو، مگر یہ بتانا درست نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ”تم ایک جاسوس ہو۔“ جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ اس کا مطلب سزائے موت ہوتا ہے، اس سے کوئی سوالات نہیں پوچھے جاتے۔ ان کے پاس میرے متعلق ایک فائل تھی مگر وہ مجھے دکھانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

آخر میں، میں نے کہا صاف ظاہر ہے کہ ان کے پاس میرے خلاف کوئی واضح چیز نہیں اور یہ بھی کہ میں ایک صحافی ہوں۔ انہوں نے یہاں تک بھی کہا کہ ”ایکسپریس نیوز پیپر“ نے میری رہائی کی بات چیت کے لئے ایک ”اعلیٰ ڈائریکٹر“ بھیجا ہے۔ ان سب باتوں نے میرے ذہن میں ایک کھلبلی مچا رکھی تھی مگر میں نے انہیں جھٹک دیا کہ، جو ہوا سو ہوا، اب گھر تو جاری ہوں۔

حامد ”فلپ فلاپ“ قسم کے سکیئنڈل لے کر آ گیا، جن پر ”لندن“ کا ”لوگو“ لگا ہوا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ یہ تو بالکل فٹ آگئے ہیں، اس پر اس نے مجھے مبارکباد دی اور مجھے بیٹھ جانے اور انتظار کرنے کو کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ پھر کیا ہوا، جو کچھ ہوا اس سے میرا خون جم کر رہ گیا۔ اس کا ذکر میں نے اپنی ڈائری میں کیا، وہ یوں ہے:

اسلام کی دعوت

حامد نے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ مجھے کوئی ملنے آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کہا تھا کہ مولانا (ایسے آدمی کو مولانا کہا جاتا ہے جو فارسی یا عربی جانتا ہو) آیا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اتنے میں کمرے میں ایک لمبا پتلا شخص داخل ہوا، اس کی جلد صاف اور بے داغ اور چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھیں تھیں، ہاتھ میں تسبیح تھی جسے وہ آہستہ آہستہ رول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا، تمہارا مذہب کیا ہے اور اسلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ سن کر میرا منہ خشک ہو گیا، میں نے بتایا کہ میں ایک عیسائی ہوں مگر وہ جانتا چاہتا تھا کہ میں کس قسم کی عیسائی ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ میں پروٹسٹنٹ ہوں۔

وہ بدشگونی کے انداز میں مسکرایا، جس سے مجھے محسوس ہوا کہ مجھے پھنسایا جا رہا ہے۔ میں نے اپنی بات آگے جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اسلام ایک دلکش مذہب ہے۔ جس کے پیروکار بہت اچھے جذبات اور عقائد رکھتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں لندن واپس جا کر مذہب کا خصوصی مطالعہ کیا کروں گی۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا، ابھی اور اسی وقت مذہب تبدیل کرنا چاہتی ہو؟

میں خوفزدہ ہو گئی کہ اگر میں ”ہاں“ کہتی ہوں تو وہ سوچے گا کہ میں قلمون مزاج ہوں، وہ مجھے سنگسار کرادے گا، اگر ”نہ“ کہتی ہوں تب بھی موت کا خطرہ مول لیتی ہوں۔ میں نے اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اتنا برا فیصلہ، جس سے میری ساری زندگی ہی بدل جائے، اس حالت تشویش و اضطراب میں نہیں کر سکتی۔ اس پر وہ ایک بار پھر مسکرایا اور اٹھ کر چلا گیا۔

جب حامد واپس آیا تو میں لرز رہی تھی، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا سب ٹھیک جا رہا ہے۔ اس نے اچانک مجھے کہا کہ اب میں جاسکتی ہوں، اس نے حکم دیا کہ روائی سے پہلے برقع پہن لینا۔ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو آ گئے، میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔ اس نے انٹیلی جنس کے ایک افسر کی طرف رہنمائی کے لئے دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

میں حامد کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے میری طرف ایک چادر پھینکتے ہوئے کہا، ”تو پھر یہ لو اور خود کو ڈھانپ لو۔“ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ اتنی ترشی سے کیوں کام لے رہا ہے، لیکن میں نے پرواہ نہیں کی کیونکہ میں تو ویسے ہی گھر جا رہی تھی۔

پک اپ ٹرک پر سوار ہونے کے لئے گئی تو وہاں مختلف لباسوں میں ملبوس تقریباً چالیس طالبان، نے مجھے گارڈ آف آنر پیش کیا ان میں سے بیشتر مسکرائے اور جواباً میں بھی مسکراتے ہوئے ان کے پاس سے گزری۔ پھر مجھے دو آدمی نظر آئے جو میرے ہمراہ گرفتار کئے گئے تھے، میں نے انہیں نظر انداز کر دیا، مگر دل ان کے لئے پیچ رہا تھا۔ وہ زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے اور چھوٹی لڑکی بھی پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔

میں آگے کی جانب جا کر پک اپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی، دو مسلح طالبان گارڈ اور سکا لرد کھائی دیئے والا، انٹیلی جنس افسر بھی ساتھ بیٹھے تھے۔ میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی، تاہم میں نے آنسو ضبط کر لئے۔ عبد اللہ نے اس وقت پہلی بار اپنی انگریزی بولی، جب اس نے مجھے ”گڈ بائی“ کہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کیا یہ شروع سے انگریزی جانتا تھا مگر اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ ٹرک ہلا تو میں آنسوؤں کو اپنے رخساروں پر رواں ہونے سے نہ روک سکی۔ میں نے پچھلے

یہ دن میرے لئے باعث غم بھی تھا، کیونکہ یہ ڈیزی کی 9 ویں سالگرہ تھی۔ میں نے اس کے لئے گانا گایا، اپنی آنکھیں بند کیں۔ اپنے بازو اپنے گرد لپیٹے اور اس کی شبیہ کو اپنے ذہن میں مرکز کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ کیا میں اسے کبھی چھو سکوں گی۔ پھر یہ سوچا کہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد کیا وہ مجھے یاد کرے گی، اور کیا اسے ہماری آخری گفتگو یاد آیا کرے گی؟

میں نے اسے بتایا ہوا تھا کہ اسے جب کبھی بھی میری ضرورت ہو تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لے، میں ذہنی طور پر اس کے پاس آمو جو دہوا کروں گی۔ اس بات نے مجھے رلا دیا اور میں بہت افسردہ ہو گئی، کیونکہ میں نہ صرف بے بس تھی بلکہ غیروں کے بس میں تھی۔ میرے پاس دو نہایت ضرور رساں چیزیں تھیں مثلاً ریزر بلیڈ اور بھوک ہڑتال۔ اتنے میں ایک ”واردات“ ہو گئی جس کا بہترین اظہار، میری 3 اکتوبر کی ڈائری میں ہو سکا ہے، ملاحظہ کیجئے:

میں نے بے دھیانی (absent-mindedly) کی حالت میں طالبان کے دیئے ہوئے نئے کریم اور براؤن لباس پر جڑے ہوئے منکوں کی قطار پر انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں، اچانک ایک لڑی اور تین زیبائشی چھلے میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں نے نیچے دیکھا تو مجھے مقدس تثلیث کا خیال آ گیا۔ خدا بطور باپ، خدا بطور بیٹا اور روح القدس۔ پتہ نہیں کہ مجھے کون ترغیب دے رہا تھا کہ میں ان سے دنا کروں، چنانچہ میں نے مدد کی دنا کرنا شروع کر دی۔

اچانک مجھے اپنے جسم میں سے خوف رفتہ رفتہ خارج ہونا محسوس ہونے لگا، تھوڑی دیر بعد حیرت انگیز طور پر میرے اندر قوت کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ بڑی ہی گہرا روحانی لمحہ تھا، اگرچہ جو لوگ مجھے نہیں جانتے وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگیں گے۔

چنانچہ اسی لمحہ میں نے فیصلہ کر لیا میں اس دوزخ میں سے نکل کر قیدی بن جانے کو تیار ہوں، اور اب تفتیش کاروں کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی اور نہ کسی قسم کا تعاون کروں گی۔ شام کے سات بجے مجھے اطلاع دی گئی کہ کل میں گھر جا رہی ہوں اور میں عیسائیوں کے اس گروپ کے ہمراہ پرواز کروں گی جن پر الزام تھا کہ وہ مسلمانوں کا مذہب تبدیل کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے میری ہمت بندھ گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری دنا قبول فرمائی ہے۔

اگلے روز میں صبح 5.30 پر ہی جاگ گئی۔ وقت کا مجھے اس لئے پتہ چلا کہ حامد نے مجھے اپنی گھڑی مستعار دے رکھی تھی۔ میں بے حد جوش و خروش میں تھی، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خدا نے میری دنا کا اتنی جلدی کیوں جواب دیا۔ میرے دل میں تھوڑا سا احساس گناہ آمو جو دہوا کہ میں جلد بازی کی وجہ سے دنا مکمل نہیں کر سکی اور اس میں یہ فقرہ شامل نہیں تھا کہ ”ہمیں شیطان سے نجات دینا۔“ اگر یہ بھی کہہ دیتی تو اس کا میرے سنگین حالات پر خصوصی اثر پڑ سکتا تھا۔

حامد اور عبداللہ خوش خوش آئے ان کے ہاتھ میں ایک پشتو اخبار تھا جس کا نام ”طالبان بگل“ تھا۔ اس کے صفحہ اول پر میری دو تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ ایک صرف میرے ”سر“ کی تصویر تھی اور خبر میں کہا گیا کہ ”سنڈے ایکسپریس“ نے اسے افغانستان بھیجا ہے، دوسری تصویر میں مجھے درہ خیبر کے اوپر لکھے ہوئے اس نشان کے سامنے کھڑی دکھایا گیا۔

”NO FOREIGNERS BEYOND THIS POINT“۔ بظاہر طالبان کے احکامات میں سے ایک حکم یہ بھی تھا کہ عورت کی تصویر، نہ اخبار میں چھپ سکتی ہے اور نہ کتاب میں۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ مجھے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔

حامد نے کہا ”ہر کوئی جانتا ہے کہ آپ کون ہیں۔ آپ بہت مشہور ہیں۔ جلال آباد دکھا ہوا ہے؟ اس پر اس نے ہنستے ہوئے کہا ”یہ کہتی ہے یو آنے رڈ لے بہت خوش ہے۔“ مجھے یاد ہے کہ اس وقت مجھے بہت ہنسی آئی تھی۔ یہ بات مضحکہ خیز تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر ڈاکٹر نے میرے بلڈ پریشر کے حوالے سے ”لیک“ کر دی ہوگی یا کسی اور نے اخبار کو بتا دی ہوگی۔ شاید طالبان نے سوچا ہوگا کہ میرے خوش ہونے سے متعلق خبر شائع کرانے سے ان کی میزبانی کو شہرت ملے گی اور مقامی لوگوں پر اچھا تاثر قائم ہوگا۔ کیسے پتہ!

عبداللہ نے کہا کہ کابل ایئر پورٹ تک گاڑی وہ چائے گا۔ میں نے حامد سے پوچھا کہ کیا آپ بھی ہمارے ہمراہ ہوں گے، لیکن اس نے معذرت کر دی۔ میں روٹی کا ایک ٹکڑا کھانے پر رضامند ہو گئی جس سے میرے دو غیر متوقع دوست خوش ہو گئے۔ میں نے اپنا سارا سامان سمیٹ کر ایک پلاسٹک بیگ میں ڈال لیا۔ جب میں جانے کے لئے اٹھی تو حامد نے میرے پاؤں کی طرف دیکھا تو اسے پتہ چل گیا کہ میرے تو جوتے نہیں ہیں۔ تو وہ جوتوں کے لئے گیا، میں نے کہا ”نہیں نہیں، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، واپس آ جائیے۔ چھوڑ دیجئے۔“ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس

واقعات یاد کرنا شروع کئے تو آخری نظر بندی کے دن خاص طور پر نمایاں تھے، میں اس دفتر کو ”ہاؤس آف ٹرکس“ (Tricks) کہتی تھی۔ میں نے تصور میں اپنی والدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مام، میں گھر آرہی ہوں۔“ کابل تک کا سفر سخت تکلیف دہ تھا، جو چھ گھنٹوں سے کچھ زیادہ دیر میں طے ہوا۔ راستے میں خوبصورت میدان، دریا، چشمے، رنگا رنگ مناظر عظیم الشان پہاڑ اور سینکڑوں زمین دوز موریچے اور خاریں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ صدر بش نے ان سب کو ”دھواں بنا کر اڑا دیے“ کی جو دھمکی دی تھی، وہ انتہائی غیر حقیقت پسندانہ تھی۔

زمین کا جھوڑا

اب خوبصورت مناظر تبدیل ہو گئے اور ہم بخر میدانوں پتھریلی ڈھلوانوں اور چڑھائیوں میں سے گزرنے لگے، کہیں کہیں زمین اتنی سرخ تھی جیسے اس کو مسلسل جلایا جاتا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ خدائی زمین کا پچھوڑا ہے۔ ہم راستے میں مختلف جگہوں پر ٹھہرتے رہے جہاں مرد نمازیں پڑھتے اور اپنی ٹانگ کی ضرورتیں پوری کرتے رہے۔ کسی نے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کیا مجھے بھی کسی چیز کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ افغان عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اسی طرح نظر انداز کی جاتی ہیں، انہیں اپنی جوانی کی ضروریہ سے ”شام ہی کو فارغ“ ہونے کی عادی بنا دیا گیا ہے۔

مجھے سگریٹ پینے کی اجازت دے دی گئی تھی، وہ میرے لئے ”افغان سگریٹ“ لائے تھے، جو بہت ”سٹرائک“ تھے تاہم میں ان کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اتنا خیال تو رکھا۔ ٹکٹوں کے رسیاؤں مقولہ ہے، کہ ”طوفان آجائے تو جس بندرگاہ میں بھی پہنچ جاؤ، وہیں دیک جاؤ“ چنانچہ میرا گزرا بھی ہو گیا۔ دوران سفر ڈرائیور نے گئے اور انار خریدے اور ہمیں پیش کر دیئے۔

گئے چوسنے سے ہم بہت محظوظ ہوئے، وہ فرحت بخش تھے، اس لئے جلدی ختم ہو گئے۔ پھر ایک طالب نے انار کے دانے نکالنے شروع کئے، ان رس بھرے دانوں کو ایک بڑے کاغذی لفافے میں جمع کر کے ہمیں پیش کرتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں ایک بچہ ہوتی تھی، میری ماں مجھے آدھا نانا اور ایک پن دے دیا کرتی تھی تاکہ پن سے ایک ایک رس بھر ادا نہ چٹتی رہوں اور منہ میں ڈالتی رہوں اس طرح میں گھنٹوں مصروف رہتی تھی۔ لیکن انار کھانے کا یہ انداز زیادہ اطمینان بخش تھا۔ میں نے جب انہیں اس کا انگریزی میں نام ”پی گریٹ“ بتایا تو ہنسی کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ میرے خیال میں یہ نام اتنا مضحکہ خیز تو نہیں تھا مگر میں سوچتی رہ گئی کہ اس نام کا ماخذ کیا ہے۔ ڈرائیور نے مجھے چیونگ گم دیئے جو میں نے بخوشی قبول کر لئے۔

چنانچہ میں سگریٹ بیتی اور چیونگ گم چباتی رہی، میری امی دیکھتی تو چیخ اٹھتی۔ سفر کے عین درمیان میں ڈرائیور نے اپنا چیونگ گم ڈیشن بورڈ میں پھنسا دیا جو حرارت کی وجہ سے سخت گرم تھا اور اپنا منہ انار کے دانوں سے بھر لیا، تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اس نے چیونگ گم دوبارہ منہ میں ڈالا تو وہ اتنا لیسدا رہا کہ اس کا کچھ حصہ اس کے ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سٹیرنگ ویل کے گرد چپک چکا تھا اور اس کی دم اس کی داڑھی میں پھنس گئی۔ یہ دیکھ کر میں لوٹ پوٹ ہو گئی، میری ہنسی رکنے میں ہی نہیں آرہی تھی کیونکہ یہ مادہ پگھل کر ہر طرف پھیل چکا تھا، اسکے ہاتھ، سر اور داڑھی کے بال ہر چیز پر چسپاں ہو چکے تھے۔

اس نے ٹرک روک لیا اور کوسنے دینے لگا جب کہ باقی لوگ اس پر قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے سے پوچھنے کے لئے وہ چادر دے دی جو حامد نے مجھ پر پھینکی تھی کیونکہ میں اپنے گھر جا رہی تھی جہاں اس کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ کابل روڈ پر ہمارا سفر چیونگ گم کے واقعہ کے بعد بھی جاری رہا لیکن ٹرک پتھروں اور گہرے کھڈوں پر لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا، اس میں ڈرائیور کی جھنجھلاہٹ کا بھی دخل تھا۔ اس سڑک کو پچھلی بمباری نے ادھیر کر رکھ دیا تھا، سڑک کے کنارے پیٹھے ہوئے بچے اپنے ننگے ہاتھوں سے ان گرہوں میں سگریزے اور مٹی بھر رہے تھے تاکہ گاڑیوں والے ترس کھا کر انہیں چند افغانی نوٹ پکڑا دیں۔ یہ بچے کہاں سے آئے اور کہاں رہتے تھے اس کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔

ہم متعدد دیک منزلہ مکانوں والے دیہات کے قریب سے گزرے، یہ مکان یا تو مٹی کے ڈھیلوں سے بنائے گئے تھے یا ان کی دیواروں میں سیمنٹ کی بجائے گارا استعمال ہوا تھا اور لپائی کیچڑ سے ہوئی تھی۔ ان مناظر نے مجھے بچوں کے لئے لکھی گئی ایک کتاب میں چھپے ہوئے خاکے یاد دلائے اس کتاب کا نام ”چلڈ رن ہائیل“ تھا، مجھے یہ اس زمانے میں دی گئی تھی کہ میں تقریباً دس سال کی تھی۔ ان مکانات میں سے بعض کھنڈرات تھے، بعض بمباریوں سے تباہ ہوئے تھے اور بعض سابقہ زمانوں سے ترک شدہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ماضی میں سفر کر رہی ہوں۔ مجھے ایک دوست کی یاد آئی جس نے کہا تھا کہ طالبان کا مقصد اس زمانہ کا ملک تخلیق کرنا ہے جب اللہ زمین پر چلا کرتا تھا۔ ان کی ”کامل مسلم سٹیٹ“ کے قیام کی وحشیانہ مہم مجھ جیسے لوگوں کو محض ایک پاگل پن لگتی ہے کیونکہ ہم لوگ ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ٹھنڈا اور گرم پانی ساتھ ساتھ چلنے، میوزک ڈانس اور گانے بجانے کے زمانے کی پیداوار ہیں۔

میں خوف، غم اور غصے کی ملی جلی کیفیات میں تھی، ان کیفیتوں کا یکجا ہونا کسی کے لئے بھی خطرناک ہو سکتا تھا، میں نے بدستور چلا تے ہوئے کہا ”میں یہاں ہرگز نہیں ٹھہروں گی۔“

کیا تم سمجھ نہیں رہے ہو؟ میں مہذب ہوں، میں برٹش شہری ہوں، تم مجھ سے ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔“ اسی لمحے ایک اور کوٹھڑی کا دروازہ کھلا، اس میں سے چھ افغانی لباس والی عورتیں باہر جھانکنے لگیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، ان میں سے ایک سیاہ بالوں والی عورت نے، جس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا، پوچھا..... ”کیا تمہارا تعلق ریڈ کراس سے ہے؟“

میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور اسی برہمی کی حالت میں بولی۔ ”نہیں، میں وہ نہیں، لیکن میں بلڈی کراس ہوں اور تم..... کیا تم انگریزی بولتی ہو۔ میں درمیان میں رک گئی تھی اور حیران تھی کہ یہ کون ہیں؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، میں آسٹریلیا میں ہوں، یہ دو امریکن ہیں اور دیگر تین جرمن ہیں۔“ یہ ان طالبان اور غالباً میری بھی خوش قسمتی تھی کہ میری توجہ ذرا ہٹ گئی، میرے چہرے پر میری اپنی شناخت واپس آ گئی، میں چپک کر بولی۔ ”اوہ میرے خدا! تو آپ کرچین ہیں، لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ سب ہوٹل کے کمروں میں رہتی ہیں، آپ کے پاس ٹیلی ویژن، وڈیوز اور کمپیوٹرز وغیرہ ہیں۔“

میرے ریمارکس پر وہ کھلکھلا کر ہنسیں اور بتایا کہ وہ جرمنی میں قائم ایک فلاحی ادارے ”شیلٹرناؤ انٹرنیشنل“ (Shelter Now International) کی ورکرز ہیں، ان کے دو مرد ساتھیوں پر اس الزام کے تحت مقدمہ چل رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ پشتو جانتی ہیں؟ جواب ملا کہ ہم سب پشتو جانتی ہیں، یہ سن کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان طالبان سے کہیں کہ میں یہاں ہرگز نہیں ٹھہروں گی، انہیں میرے لئے ہوٹل میں بندوبست کرنا ہوگا، یہی ان کے لئے بہتر رہے گا، ورنہ اس کے نتائج انہیں بھگتنا ہوں گے۔

جرمن عورتوں میں سے ایک، جس کا نام ”کیتھی“ تھا، مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے کہ میں پاگل ہو چکی ہوں۔ پھر اس نے ان کے سامنے میرے فقرے ذرا نرم کر کے آہستگی سے دہرائے۔ دونوں مردان لڑکیوں سے کچھ گفتگو کرتے رہے۔ آسٹریلین لڑکی ”ڈیانہ“ نے کہا کہ دہرائے۔ دونوں مردان لڑکیوں سے کچھ گفتگو کرتے رہے۔ آسٹریلین لڑکی ”ڈیانہ“ نے کہا کہ ”تمہارے لئے بہتر یہی رہے گی کہ آج رات ہمارے پاس ہی ٹھہرو، صبح تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، پریشان نہ ہو۔“

میں بڑبڑاتی اور ان مردوں کو برا بھلا کہتی ہوئی کوٹھڑی کے اندر چلی گئی یہ اندر سے سات میٹر لمبی اور پانچ میٹر چوڑی (23 فٹ x 16 فٹ) تھی۔ میں نیچے بیٹھ گئی اور خوب روئی۔ پھر میں نے پوچھا کہ اگر میں سموکنگ کروں تو آپ میں سے کوئی برا تو نہیں منائے گی، جواب ملا، ہم سب برا منائیں گی۔ میں ڈر گئی لیکن میرے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی تاہم کرچین ہونے کے ناطے انہیں اس کا حق حاصل تھا۔ میں نے کہا، اچھا سگریٹ بعد میں سہی آؤ اب باتیں کریں۔

مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں تقریباً سات دنوں سے عورتوں کی ہمنشین (Company) سے محروم رہی اور کسی کی زبانی بھی روانی سے بولی جانے والی انگلش سننے کو ترس گئی تھی، اس لئے میں ان کے پاس بیٹھنے سے بے حد راحت محسوس کرنے لگی اور خوب جی بھر کر باتیں کیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے اندر ان محرومیوں کا غبار تھا، اس لئے میں ان ”دونگلے“ آدمیوں کے سامنے پھٹ پڑی اور جی ذرا ہلکا کر لیا ہے۔ پھر میں نے انہیں اپنی کہانی سنائی۔

وہ یہ سن کر خوفزدہ ہو گئیں کہ مجھے تقریباً ایک ہفتہ مردوں ہی کی معیت میں رکھا گیا، انہوں نے کہا کہ ان کا یہ اقدام طالبان کے حکمناموں کی واضح خلاف ورزی تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ہفتے کے بیشتر حصے میں بھوک ہڑتال پر رہی۔ اور ڈیانہ نے بتایا کہ ان میں سے بعض نے بیس دن روزے رکھے تھے۔

ان کے منہ سے ”روزے“ اور ”بیس دن“ کے الفاظ سن کر مجھے اپنے گھٹیا ہونے کا احساس ہوا چنانچہ میں نے اعلان کیا کہ میں ایک گندا احتجاج کروں گی اور جب تک رہائی نہ ملے گی نہ ہانا دھونا نہیں کروں گی۔ ”نہ نہ، ایسا نہیں ہوگا“ ڈیانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھو“ اس نے اپنی ایک امریکن ساتھی بیٹھ کر طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نے یہ طریقہ پہلے ہی اختیار کر رکھا ہے، اس چھوٹی سی جگہ پر ایک بدبودار فرد بھی کافی ہے۔“ اس نے یہ اشارہ واضح مگر خوشگوار انداز میں کیا، اس نے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ غالباً اس چھوٹے سے گروپ کی لیڈر ہے۔

وہ رات کو اپنے معمولات کے سلسلے میں ایک میننگ شروع کرنے والی تھیں، چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں سگریٹ نوشی کے لئے صحن کی طرف نکل جاؤں۔ باہر نکل کر میں نے آسمان کی طرف نظر ڈالی اور ستارے دیکھنے لگی اور کوشش کی کہ دیکھوں تو سہی کیا وہ سیلانیٹ مجھے دوبارہ دکھائی دے گا، لیکن نہ دیکھ سکی۔ میرے پاس تین سگریٹ

تفتیشی ہتھکنڈے

ہمارے سفر تقریباً ایک گھنٹے کا رہ گیا ہوگا کہ ہمارا ٹرک اچانک رُکا، ایک سپاہی نے اُتر کر جان کی جھکڑی کھول دی جو پیچھے جا کر سکا لرد کھائی دینے والے اٹیلی جنس انسٹرکشن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ”پریشان نہ ہونا مقدمہ انصاف سے چلے گا۔“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور تھوکتے ہوئے کہا ”معلوم نہیں تم کون ہو، مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“ چند لمحوں کے بعد کن انکھیوں سے دیکھا کہ وہ انسٹرکشن کو کہنی مار رہا ہے اس کے بعد جان نے پھر میرا کندھا تھپتھپایا اور پھر بولا ”آپ کی بیٹی کیسی ہے؟ کیا آپ کے پاس اس کی وہ نوٹو ہے جو آپ اپنے پاس رکھا کرتی ہیں؟“

میں نے جان کو ڈیزیزی کی تصویر دیکھائی تھی مگر وہ اس قیمتی سامان میں رہ گئی تھی جو میں پاشا کے پاس رکھ آئی تھی۔ میں نے اس کی چال کو سمجھتے ہوئے جواب دیا ”کیسی باتیں کر رہا ہے تو، اپنے کام سے کام رکھ“

ہم نے سفر خاموشی سے جاری رکھا، انسٹرکشن نے جان سے کچھ سرکوشیاں کرنے کے بعد ایک بار پھر اسے کہنی ماری تو اس نے مجھے کہا ”ڈریئے بالکل نہیں، ہم سب آپ کے دوست ہیں۔“ اب تو حد ہو چکی تھی، میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”روکو اس بد بخت ٹرک کو، میں پیدل چل کر بھی کا بل تک جاسکتی ہوں اگر جانا پڑ جائے تو۔“ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ٹرک روکا گیا اور جان کو پیچھے لے جا کر دوبارہ جھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ مجھے بہت برا لگا مگر ہم نے اپنی سٹوری پر قائم ہی رہنا تھا، تب ہی تو میں سٹوری کے باقی ماندہ حصے کو آگے بڑھا سکتی تھی۔ جتنا میں جانتی تھی وہ یہ تھا کہ ممکن ہے کہ یہ ساری باتوں کا اعتراف کر چکے ہوں، لیکن مجھے اس کا یقین تو نہیں آیا تھا۔

ٹرک نے پھر سفر شروع کیا تو مزید ڈرامائی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں سوچنے لگی افغانستان، اپنے باشندوں جیسا ہی ہے، یہ تضادات کا ملک ہے اور اس کے لوگ ایک لمحے میں انتہائی فیاض ہوتے ہیں اور اگلے لمحے کڑوے انتہائی درجے کے وحشی بن جاتے ہیں۔

کا بل پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی، کوئی چیز واضح طور پر شناخت نہیں ہو رہی تھی، یہ دارالحکومت کا سا شہر تو یقیناً نہیں لگ رہا تھا، میری نظریں ایئر پورٹ کو تلاش کر رہی تھیں اور ہم اچانک موڑ کاٹ کر ایک شاندار عمارت کے اندر پہنچ گئے جو سرکاری تعمیرات کی مانند لگ رہی تھی۔ اٹیلی جنس انسٹرکشن کے اندر چلا گیا، دس منٹ کے بعد واپس آ کر اس نے ڈرائیور سے کچھ کہا۔

ہم مزید پانچ منٹ تک چلتے رہے اور پھر ایک قلعہ نما عمارت میں داخل ہو گئے جس کے بارے میں انکشاف ہوا کہ یہ کا بل جیل کا شعبہ انسداد دہشت گردی ہے۔ طالبان کے ساتھ گزر رہے ہوئے میرے دنوں میں کئی مشکل مقامات آئے تھے اور یہ ان میں سے تلخ ترین مقام تھا۔ لیکن ”زہر خند“ (gallows humour) ہمیشہ موجود رہا ہے۔ مجھے ایک چہرہ اُتے ہوئے گیٹ میں سے گزرا کر اندر ایک صحن میں پہنچا دیا گیا، اندر اندھیرا تھا اور مجھے ایک میاں لے سے کوریڈور میں سے لے جا کر ایک بڑے لیکن سنسان کوریڈور میں پہنچا دیا گیا، میرے سامنے ڈیڑھ میٹر اونچا (تقریباً 5 فٹ 4 انچ) آہنی دروازہ تھا سیاہ پگڑی باندھے ایک شخص نے جو جیل کا کوریڈور تھا، اسے دھکیل کر کھول دیا۔

میں نے مجسٹریٹس نظروں سے اندر جھانکا تو وہاں دو افغان عورتیں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں، ان کے پاس چپختا ہوا ایک لاغر سا بچہ بھی تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر کوریڈور اور اٹیلی جنس کی طرف دیکھا، جنہوں نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں ہکا بکا رہ گئی، میں نے غصے میں آ کر ایسی زبان چلائی کہ اس سے پہلے کبھی یہاں تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ میں نے کہا ”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو! میں اندر نہیں جاؤں گی۔ میں تو بذریعہ ریڈ کریسنٹ طیارہ گھر جاؤں گی۔ میں اس کوٹھڑی میں قدم تک نہیں رکھوں گی۔ میں غلیظ کام نہیں کرتی، میں ایک برطانوی صحافی ہوں، تم مجھ سے ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔ میں جب گھر پہنچوں گی تو تمہارے پول کھول دوں گی۔۔۔۔ اور تمہارے (دونوں کی طرف باری باری انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) بارے میں بھی لکھوں گی۔ یہاں میرا تم سے مطالبہ ہے کہ مجھے ہوٹل میں ٹھہراؤ۔ اس کے اخراجات میرا اخبار دے گا، کیا تم مجھے کوئی سرپھری عورت سمجھتے ہو، جھوٹے فریبی مکار، تم نے تو مجھے گھر جانے کے لئے کہا تھا۔“

دونوں آدمی، جنہوں نے پہلے کہا تھا کہ وہ انگریزی نہیں بول سکتے، میرے جملے کو اچھی طرح سمجھ گئے، اٹیلی جنس انسٹرکشن، مجھے غصے میں دیکھ کر دل میں خوش ہو رہا تھا، جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انہوں نے مجھ سے گند اکیل کھیلنا تھا، اور اس پر میرا احتجاج بالکل بجا تھا، اس نے کہا ”یہ افغانستان ہے، تم نے ہمارا قانون توڑا ہے، تم اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئی ہو اور تمہیں یہیں ٹھہرنا ہوگا۔“

تھے، جنہیں یکے بعد دیگرے اڑا کر میں نے جلال آباد کے مردوں کو کوسا، ان سب نے مجھے الوداع کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے ان کے لئے ایک بہن کی طرح ہوں۔ لیکن انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں تو یہیں ختم ہو جاؤں گی۔

وہ سب مجھ سے جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہے۔ اور جب ان کی طرف سے رہا کر دیئے جانے کے وعدوں پر میرا حوصلہ بڑھ گیا تو ان دو ٹلوں نے مجھے پرھ پکڑ لیا۔ اتنے میں مجھے جیل کی کوٹھڑی سے نعماتی آواز سنائی دی۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں جو خوبصورت گیت گارہی تھیں۔ یہ کتنی پڑ اسرار آواز ہے! میں کابل جیل کے صحن میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ یہ ماورائے حقیقت (Surreal) صدا ہے۔

میں اپنی کوٹھڑی میں واپس آئی اور کافی دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی۔ میں نے ان عورتوں کو بتایا کہ میرا "گیم پلان" یہ تھا کہ میں خود کو دوزخ کی قیدی کے طور پر پیش کروں اور انہیں اتنا گالیاں دوں جتنا ممکن ہو سکے۔ اب چونکہ میں تمہاری رفاقت پسند کرنے لگی ہوں تو میں اصرار کروں گی کہ مجھے بھی یہیں ایک کوٹھڑی دے دی جائے، میں نہیں چاہتی کہ ان پر میرے برے رویے کا کوئی اثر پڑے۔

مجھے فوراً مل گیا۔

میں ٹھنڈے پانی کی بالٹی اٹھا کر ہانپتی ہوئی صحن کے آخری سرے پر لے گئی۔ پھر وہ مجھے ہمارے کٹھڑی کے دروازے کے پاس شیلٹوں کے پاس لے گئی اور ایک ”ہیڈنگ پلیٹ“ دیکھایا جو پاور پلائی کے پلگ میں لگا ہوا تھا۔ اس طرح اس نے مجھے پانی گرم کرنے کا سارا طریق کار سمجھا دیا۔ یہ طریق کار کسی بھی دوسرے ملک میں ہوتا تو اسے غیر محفوظ قرار دے دیا جاتا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں نے بالٹی کو اٹھایا اور کوریڈور میں سے گزر کر نائٹ ایریا میں لے گئی۔ واپس جا کر صابن اور ٹوتھ برش لائی۔ یہ ٹوتھ پیسٹ چینی ساخت کی تھی جو مجھے میری دوسری جگہ پر دی گئی تھی۔ میں نے خود کو دھونا شروع کر دیا، کہ اچانک مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑ گیا کیونکہ مجھے وہ ریزریا آ گیا جو میں نے اپنے صابن کے اندر گھسیڑ دیا تھا اور سوچا کہ چھپانے کی یہ کتنی احتمالہ جگہ تھی۔ پھر یہ خیال آنے پر میں خوفزدہ ہو گئی کہ اس سے مجھے کتنا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس سے طالبان کا زیادہ کچھ نہ بگڑتا۔ بہر حال میں نے صابن کھود کر اس میں سے بلیڈ نکال لیا۔ خود کو ایک چھوٹے دستی تولیے سے صاف کیا۔ یہ ان لڑکیوں نے مجھے دیا تھا۔

باقی ماندہ عورتیں، دو امریکن ہتھمر سر، ڈیانہ کری، تیز طرار آسٹریلیئن ڈیانہ، جس کے نام کا آخری جز دنامس ہے اور دو جرمن سلکے ڈرکوف اور مارگریٹ شینبرگ کسمسانا شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنا سامان نکالنا شروع کیا، تو ان میں سیک نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا، اری تجھے شادی کا ڈریس خریدنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ میں نے سفید شفون اور کولڈن ڈریس کی طرف دیکھا تو میری بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے انہیں ایک مٹکا کی کہانی سنائی جس نے مجھے مسلمان بنانے کی پیشکش کی تھی، میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اگر میں مان جاتی تو انہوں نے میرے لئے شوہر بھی تیار رکھا ہوگا۔ میں نے مزید کہا کہ میرے نہ ماننے کی وجہ سے اس بد قسمت ملک کا کوئی بے چارہ خاوند بال بال بچ اٹھا، ورنہ میرے ہاتھوں اس کی شامت آ جاتی۔

میں نے جب انہیں اپنی شادیوں کی خبر سنائی تو وہ دم بخود رہ گئیں اور کسی حد تک محفوظ بھی ہوئیں۔ میں نے کہا میں نے ایسا تین دفعہ کیا ہے، خدامد کرے خاوند نمبر 4 کی جو ایک خطرناک قسم کا معاملہ تھا جیسا کہ جلال آباد میں ہونے جا رہا تھا۔ یہ ہم سب کے لئے ایک ”تیر بہدف“ قسم کا علاج ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے انہیں اپنے گیم پلان کے بارے میں بتایا۔ میں نے کہا کہ میں نے ایک انتہائی مشکل اور ضدی قیدی ثابت ہونے کا منصوبہ بنا رکھا تھا، اس پر انہوں نے مجھے محتاط رہنے کو کہا، تاہم میرا ذہن اس شرارت کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

آسٹریلوی ڈیانہ ایک کوالیفائیڈ نرس تھی، میں نے اسے دورانِ نظر بندی اپنے جسم پر پڑنے والے داغ دھبے دکھائے، اس کا خیال تھا کہ یہ مجھروں اور کھٹملوں کے کانٹے یا کھجانے سے کھرند بن جانے کے نشانات ہیں۔ کیتھی کو پچھلی جیل سے جوؤں کا ”تحفہ“ ملا تھا، وہ اب تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں، وہاں چوبے اور بچھو بھی بہت تھے، مجھے تو بچھوؤں سے خاص طور پر وحشت ہوتی ہے۔ ان سے یہ سن کر مجھے سخت گھبراہٹ ہوئی کہ وہاں عورتوں کو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر بھی بجلی کے تاروں سے مارا جاتا تھا، مگر ان سے ایسا سلوک نہیں ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ اس جیل کا عملہ نسبتاً اچھے اور بے ضرر لوگوں پر مشتمل ہے۔

ڈیانہ نے میرے داغ دھبوں کی بغور انسپکشن کرنے کے بعد بتایا کہ یہ ”انگیا“ کے نشانات ہیں اور کچھ گرمی دانوں اور کچھ کھجانے کا نتیجہ ہیں۔ میں نے بتایا کہ جب سے افغانستان آئی ہوں مجھے کبھی کھل کر اجابت نہیں ہوئی کیا تمہارے پاس الماری میں پڑی ہوئی دواؤں میں قبض کی کوئی دوا موجود ہے۔ اس نے کہا ”اگر تم بھوک ہڑتال پر رہی ہو تو یہ اس کا نتیجہ ہے، تمہارے سسٹم کے اندر غالباً کوئی خرابی نہیں۔“

تاہم میں نے انہیں بتایا کہ اس منصوبے کے لئے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ہوٹل کے بوفے سے سوڑی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تھا، اور مجھے منیجر کو کہی ہوئی بات بھی یاد آئی: معلوم نہیں، میرا کھانا کہاں سے آئے گا، یہ میں نے صرف مذاق کے طور پر کہا تھا لیکن اب یہ ایک مختلف صدائے بازگشت آرہی ہے۔

ڈیانہ نے مجھے پیشکش کی کہ میں امریکی سفارت خانے کے انسٹرکٹڈ ہو اجلا ب آؤ شروب، جو گلاس میں ڈالتے ہی شوں شوں کرنے لگتا ہے، وہ پیوٹی گئی یا ”بتیاں“ (suppositories) پسند کرو گی؟ جیل کے اندر کچھ فیملے خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے منوخر الذکر طریقے کو ترجیح دی کیونکہ میں بیویوں کو کنٹرول کر سکتی تھی، جلا ب کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی، اگر مجھے ایک اور لمبی تفتیش کے لئے روک لیا گیا، اور اسی دوران میرے پیٹ میں ہلچل مچ گئی تو اس کا کیا بنے گا؟

مارگریٹ نے کہا کہ میں دلہن والا لباس پہن کر یہاں گھومتی اچھی نہیں لگتی چنانچہ اس نے مجھے نیوی بلیوٹز اور اور اس سے میچنگ ”ناپ“ دیدیا جو مجھے بہت اچھی طرح فٹ آیا، اس کے بعد میں نے باہر جا کر جستی بالٹی لی اور اپنی

انہوں نے میرا حوصلہ بندھاتے ہوئے کہا کہ صبر کرو، غصہ رفتہ رفتہ اتر جائے گا، میں نے کہا کہ میں خرابیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں حالات کے مطابق ڈھلنے والوں جیسی نہیں ہوں۔ اگر میں ڈھل جاؤں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ماحول کو قبول کر رہی ہوں جب کہ میں حالات سے ہم آہنگی نہ اختیار کرنے والوں میں سے ہوں۔ میں نے اس نقطے پر اتنا زور دیا لگتا تھا کہ میں بالکل پاگل ہو گئی ہوں۔

ڈیانا نے میری طرف دیکھا اور سر ہلایا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایسے داخلی تجربات سے دوچار ہو چکی ہے، یا اس نے ایسے خیالات کے بارے میں پہلے بھی سن رکھا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اصل میں کہاں سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں نے بتایا کہ نیوکیسل کے قریب رہتی ہوں، اس نے بتایا کہ اس کی ایک دوست ”ڈورین“ تھی جو کاؤنٹی ڈرہم میں مڈ ووائف تھی۔

میں نے کہا، فکر نہ کیجئے، میں جب واپس آ گئی تو اسے ڈھونڈ نکالوں گی اور اس سے تمہیں خط لکھوا دوں گی۔ پھر میں نے اپنی طرف سے ہی یہ اضافہ کر دیا کہ ”میں نے یہ بات اس مفروضے پر کی ہے کہ میں یہاں سے جا رہی ہوں، وعدے کا تعلق رہائی سے بعد کے حالات سے ہے۔ جب میں اپنی کوٹھڑی میں واپس آئی تو انہی کپڑوں میں لیٹ کر اوپر رضائی لے لی۔ وہاں سونے کے کپڑوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جو کپڑے دن کو پہنے ہوئے ہوتے ہیں لوگ انہی میں سو جاتے ہیں۔ مجھے وہاں تو ایہ بھی کبھی نظر نہیں آیا۔ جلال آباد میں، مجھے نہانے کے بعد خشک کرنے کے لئے چادر دے دی جاتی تھی۔

جب میں قضائے حاجت کے لئے جاتی یا نہاتی رہتی عبداللہ غسل خانے کے دروازے پر پہرہ دیتا رہتا تھا اور مرد صبر سے میری فراغت کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ شاہ اور نائلٹ، دونوں کی حالت خراب رہتی تھی۔ وہاں میں نے نہ کبھی ”پلچ“ پایا اور نہ کلڈنگ فلوئڈ کبھی دیکھا۔

ان کے بغیر صفائی کرنے کی مجھ ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں نے سوچا کہ ویسے بھی یہ لوگ عورتوں سے کام کرانے کے قائل نہیں ہیں، میں کیوں خواہ مخواہ ان کے لئے اپنے ہاتھ اور گھٹنے خراب کر کے اس جگہ کی رگڑ رگڑ کر صفائی کروں، میری بلا سے۔

س رات میں خاموشی سے روتے روتے سو گئی، جلال آباد کے عمل جیل کے جھوٹ فریب اور غلط وعدوں پر مجھے رہ کر غصہ آتا رہا۔ انہوں نے مجھ سے جو جھوٹ بولا تھا اٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں سے میرے خوشی خوشی باہر آنے پر وہ میری پس پشت ضرور ہنسنے ہوں گے۔ تو میں نے تہیہ کر لیا کہ اچھا انہوں نے مجھے بے قوف بنایا ہے تو میں بھی انہیں دوزخ میں بسیرا کرنے والی چٹیلوں کی سردار

”Queen Bitch“ بن کر دکھاؤں گی۔ طالب بہت دور نکل گئے ہیں، میں اب انہیں دیکھوں گی، مجھے اپنی یہ سوچ یاد ہے کہ میں ایسا کر سکتی تھی، غالباً ایسا کر ڈالتی تو یہ گیم خاصی خطرناک ہوتی اور میں آنے والے کئی برس دوزخ کے غلیظ ترین سوراخ میں پھنسی رہتی۔

کابل پر بمباری

کابل کی جیل میں میرے پہلے پورے دن کا آغاز بہت بری طرح ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو مدہم روشنی میں میری نظر شہتروں والی لکڑی کی چھت پر پڑی تو ایسے لگا کہ میں ”سکی لاج“ یا ”لاگ کیمن“ میں ہوں۔ میں بہت پریشان ہوئی اور سمجھا کہ مجھے لازماً کوئی ڈراؤنا خواب آیا ہوگا۔ دراصل میں خواب میں چھٹی کے روز ڈیزی کے ساتھ تھی۔

جب میں اٹھ کر بیٹھی تو میری کمر چہرہ اپنی گھوم کر دیکھا تو تین جرمن لڑکیاں فرشی چٹائیوں پر گہری نیند سو رہی تھیں۔ اور میرے پیچھے دیگر تین عورتیں اوپر تلے بنے ہوئے بیڈز پر سو رہی تھیں۔ یہ خواب نہیں تھا یہ جیتے جاگتے کا ڈراؤنا خواب تھا۔

اور میں کابل جیل میں تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے گرد و پیش کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آج جمعہ کا دن اور اکتوبر کی 5 تاریخ تھی یعنی گدھے پر سواری کرتے ہوئے پکڑے جانے کے بعد پورے سات دن ہو چکے تھے۔ سب سے پہلی جنبش جرمن عورت کیتھی (اس کے نام کا آخری جزو مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ”جیلی بک“ تھا) نے کی۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں غسل کرنا چاہتی ہوں، میں بہت خوش ہوئی، اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالی تو مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ہم اسے شاہور کہتے ہیں۔“ میرے پیچھے پیچھے آؤ، میں سب سمجھا دیتی ہوں۔

وہ مجھے صحن میں لے گئی جہاں اس نے نلکے میں سے پانی نکال کر بالٹی میں ڈالنا سیکھایا، میں نے اپنی سادگی میں پوچھا کہ کیا یہ گرم ہو کر آتا ہے؟ اس پر اس نے ہنسنا شروع کر دیا، مگر میرا مذاق نہیں اڑایا۔ بہر حال اس کا جواب

نیکریں، انگلیا، براؤن اور کریم کلر کپڑے، جہانویں سے دھونا شروع کر دیئے۔ اس طرح کپڑوں کی دھلائی میرے لئے ایک نیا تجربہ تھی تاہم میں جانتی تھی کہ یہ نیا تجربہ چند دن میں پرانا بن جائے گا اور کیا پتہ کہ یہ میرے معمولات جیل کا حصہ بن جائے۔

میں نے کپڑوں کو صحن میں آریا پر لگے مار پر لٹکا دیا، کینتھی نے مجھے کہا کہ میں نیکروں کو ڈھانپ دوں، کیونکہ بقول اس کے، طالبان سپاہی صحن پر اور ہم پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں اندرونی طور پر پہنے جانے والے ہمارے کپڑے بہت برے لگتے ہیں، ”چلو دفع کرو“ یہ کہہ کر میں نے وہی کیا جو وہ کہتی گئی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

جارج نامکس نے جو افغانستان میں امدادی کاموں کا ڈائریکٹر تھا، مجھے پرسکون رہنے کی تلقین کی اور کہا کہ زیادہ احتجاجی اور گستاخانہ رویہ اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

میں نے اس پر فوراً احتجاج کیا، کیونکہ میں تو اسے بالکل جانتی ہی نہیں تھی میں سمجھی کہ وہ مجھ پر سرپرستانہ شفقت کر رہا ہے، میں نے بھی اسی پیرائے میں کہا کہ ممکن ہے آپ نے یہاں کی زندگی اپنے لئے بخوشی قبول کر لی ہو، میں اس سسٹم کی مخالفت جاری رکھوں گی۔ اگر وہ مجھے یہیں بند رکھنا چاہتے ہیں تو میں ہر دن کو ان کے لئے ایک زندہ دوزخ بنا کر رکھ دوں گی۔ اگر آپ با شعور نہیں ہیں تو آپ اس مقام کے عادی ہو کر رہ جائیں گے یا ”سناک ہوم سنڈروم“ قسم کی بے ہودگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا تو انہیں ناخوش پایا۔ میرا انداز گفتگو انہیں پسند نہیں آیا تھا، غالباً وہ ایک اچھا آدمی ہے مگر اس نے میری غلط طریقے سے فہمائش کی تھی جیسا کہ آسٹریلیو لڑکے نے کیا تھا۔

بیتھر صحن میں آئی اور اس نے مجھے وکیل کا دیا ہوا ایک پاکستانی اخبار پکڑ لیا جس میں میرے بارے میں لکھا تھا کہ ”میں پیشینہ فورسز کی ممبر ہوں اور طالبان کے سرکاری ترجمان نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔“ بات بہت سنگین تھی میں ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ ایڈورکرز اور لیگل ٹیم چلی گئی اور وکیل میری طرف مڑا اور اس نے مجھے کہا، پریشان نہ ہو پیٹے گا۔ میں نے شور کرتے ہوئے کہا کہ میرے اخبار کو صرف ایک پیغام دیجئے کہ ”مجھے ایک اچھے وکیل کی فوری ضرورت ہے۔“ اس نے غضبناک ہو کر میری طرف دیکھا، لیکن اس نے خود ہی تو مجھے اس کی دعوت دی تھی۔ میں پھر بہ آواز بلند بولی۔ ”بائی دی وے، میں ہرگز پریشان نہیں، مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟ میں تو یہاں سے جا رہی ہوں۔“

چونکہ یہ جمعے کا دن تھا میں اس روز کابل سے نہیں نکل سکتی تھی کیونکہ ان لڑکیوں نے مجھے بتایا تھا کہ مسلمانوں کا متبرک دن ہوتا ہے، اس لئے ان کا ہر کام رک جاتا ہے۔

اگلے روز میں صحن میں گئی اور وہاں یوگا کی مشق شروع کر دی۔ پرانا گیٹ چڑھتا ہوا اٹھتا تو جلال آباد سے میرے ساتھ آنے والا سکا لہنا پتیلی جنس انسر، تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے پاس آیا اس نے مجھے کہا، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں جلد ہی جیل سے چلی جاؤں گی۔ میں یہ بات سن کر غرا دی۔ میں ان پر مزید اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ سب نفسیاتی حربے استعمال کر رہے تھے۔ میں نے کابل جیل میں پہلی رات گزارتے ہوئے جو آنسو بہائے تھے ان میں کچھ حصہ اس شخص کا بھی تھا میں ان دوغلی نسل کے لوگوں کو یہ موقع نہیں دے سکتی کہ یہ مجھے دوبارہ رُلائیں۔

کورنر جیل ٹہلتا ہوا آیا اور اس نے مجھ سے میرا نام پوچھتے ہوئے کہا کہ اسے میری رجسٹریشن مکمل کرنی ہے۔ لیکن میں اسے نظر انداز کر کے اپنی کوٹھڑی میں واپس چلی گئی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ پہنچا اور لڑکیوں سے کہا کہ میں رجسٹریشن کے بغیر کسی قسم کے کھانے کی حقدار نہیں ہو سکتی۔ میں نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ اسے پشتو میں مطلع کر دیں کہ میں بھوک ہڑتال پر ہوں۔ بہر حال اگر اسے میرا نام معلوم نہیں تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، اور اب یہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ اس کے سوالوں سے مجھے الجھن ہو رہی ہے۔

جب میرے جملوں کا ترجمہ اسے سنایا جا رہا تھا، میں اس کے چہرے کے تاثرات کا اتنا رچہ چاؤ دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ خشکیوں سے خشکیں تر ہو رہا تھا، اس نے واپس پلٹنے سے پہلے اکھڑے ہوئے انداز میں کوئی سخت جملہ کہا۔ ہر کوئی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ڈیانا سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بھی مغموم دکھائی دے رہی تھی بالا خر اس نے سرکوشی کے انداز میں یہ الفاظ کہے، ”اس نے کہا کہ پھر تم مر سکتی ہو“ میں نے ہنستے ہوئے اسے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ تمہیں سچ بتاؤں میرا گارا زندہ گیا تھا اور باہر نکل کر میں نے ایک سگریٹ سلاگیا تھا۔

بعد میں ہم نے ساری صورت حال پر گفتگو کی، بیتھر نے ایک کینیڈین مرد کا ذکر کیا، جس نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ اس کے بدلے میں جیل قبول کرنے کو تیار ہے اس نے کہا مجھے پتہ تو نہیں وہ کون تھا تاہم اس نے جس جذبے کا اظہار کیا وہ قابل قدر تھا۔ اس ریمارک نے مجھے جلال آباد جیل کے دنوں کی ایک یادداشت تازہ کرادی، مجھے وہاں بتایا گیا تھا کہ طالبان لندن میں قید ایک شخص کو چھڑوانے کے لئے مجھے بطور ذریعہ تبادلہ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کی ایک تفتیش کے دوران میں نے اس بات کا ذکر کر دیا تھا۔ وہ ایک عجیب دن تھا۔ یکے بعد دیگرے اتنے واقعات ہو رہے تھے کہ میرے لئے ان سب کو تو تھ پیسٹ کے گتے کے ڈبے پر لکھنا ناممکن ہو گیا، میں اس ڈبے کو بھی بطور ڈائری استعمال کرتی تھی۔

ایک شخص نے میری تفتیش رکوا دی، اس نے جوئی اپنا سردروازے میں سے اندر کیا تو سب تفتیشی حکام اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ہر ایک کے ساتھ مصافحہ کیا، پتہ چلا کہ موصوف طالبان فورسز کا ملٹری کمانڈر تھا۔ تاہم

وکیل۔ اُمید کی کرن

خواتین اس روز اپنے وکلاء کی متوقع آمد کے پیش نظر اپنے اپنے خطوط لکھنے لگیں تاکہ وہ انہیں باہر کی دنیا میں ارسال کر دیں۔ میں اپنے نیوز ایڈیٹر جم مرے کے نام رقعہ تیار کیا اور اس امید پر لکھا کہ میرا وکیل اسے حوالہ ڈاک کر دے گا۔ میں نے اس کی آخری سطر یہ لکھی۔ ”جم، یہ دوزخ کا گڑھا ہے، پلیز مدد کرو“ میں زیادہ دواویلا کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اپنے دفتر کے لوگوں کو ضرورت کی حد سے بڑھ کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تاہم یہ صورت حال فی الواقعہ پریشان کن تھی، میں نے اس کیلئے ”hell“ (دوزخ) کا لفظ استعمال کیا تھا، اور اس میں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی تھی۔

مگر افسوس، میرا وکیل سخت اصول پسند نکلا، اس نے کہا کہ وہ صرف اپنے ”کام سے کام رکھتا ہے، پیغام وغیرہ پہنچانا، اس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے مٹھی نے بتایا کہ وہ مجھے کابل میں پا کر حیران ہوا ہے کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ میں جلال آباد میں ہوں، اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے وہاں جانے والے تھے۔ میں نے جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ”چلو دفع کرو، میں لندن کا کوئی ناپ کلاس وکیل کرنا چاہتی ہوں، ایسے ”کام سے کام“ رکھنے والے میرے کام کے نہیں۔

میرے اس جملے پر وہ بہت ناراض ہوا اور میرے رد عمل سے وکیل کو مطلع کر دیا جو اس وقت تک دوسری کوٹھڑی میں جا چکا تھا جہاں اس کی ان چھ جرمن عورتوں اور ان کے دومرد رفقہا جارج ناہمین (جرمن) اور پیئر بیچ (آسٹریلیئن) کے ساتھ لیگل کانفرنس ہونے والی تھی۔ مرد رہتے تو الگ کوٹھڑی میں تھے مگر انہیں قانونی صلاح مشورے کے لئے عورتوں کے سیکشن میں جانے کی اجازت دیدی گئی تھی۔

میں نے یہ وقت صحن میں گھوم پھر کر گزارنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس کے طول و عرض کا صحیح اندازہ کر سکوں۔ پھر میں چلتے چلتے دیوار کو چھونے اور ٹھوکریں لگانے لگی تاکہ اس کے کہیں سے کھوکھلی ہونے یا کمزور ہونے کا پتہ چلا سکوں۔ ٹھوکریں چھپ کر لگاتی تھی تاکہ کسی کو مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑنے کا شبہ نہ ہو جائے اتنے میں 24 سالہ بیٹھر، جو اپنی دوامریکی ساتھیوں سے کم عمر کی تھی کوٹھڑی سے باہر آ گئی وہ بہت پریشان لگ رہی تھی، صحن میں آ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔

میں اسے تنہا چھوڑ آئی کیونکہ بسا اوقات انسان روتے ہوئے تنہائی چاہتا ہے، عین اسی وقت پیٹر باہر آ گیا اور اس سے کچھ سخت باتیں کرنے لگا، اس نے اسے کہا کہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرے، پتہ نہیں مرد کب سمجھیں گے کہ جب بھی عورت پریشان ہوتی ہے تو تمہارے پاس کہنے کے لئے صرف یہی ایک بات رہ جاتی ہے۔

میں نے اس وقت اپنا فرض سمجھا کہ اس وقت مداخلت کر کے اس نقطے کی وضاحت کروں، چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ اسے رونا کی اجازت ہونی چاہیے تاکہ اس کے دل کا غبار نکل سکے۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھی کیونکہ وکیل نے انہیں بتایا تھا کہ وہ پاکستان واپس جا رہا ہے جبکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ کابل میں ان کے پاس ہی ٹھہرا رہے۔ بیٹھر نے محسوس کیا کہ وہ یہاں متوقع بمباری سے خوفزدہ ہو گیا ہے۔

آسٹریلوی مرد نے کہا کہ یہ بیہودہ بات ہے، یہاں کوئی بمباری وغیرہ نہیں ہوتی ہے، میں نے ایک بار مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ بمباری تو ہونی ہی ہے، سوال صرف یہ ہے کہ کب شروع ہونی ہے؟ اور آپ کو اس کے لئے تیار رہنا ہے۔ تین ہزار صحافی پاکستان بارڈر پر بیٹھے ہیں اور ان کے ایڈیٹروں نے انہیں امکان کی موجودگی کی وجہ سے ہی بھیج رکھا ہے۔

اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی پاگل ہوں، کہ وہ دو ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ سے حوالات میں تھا جبکہ مجھے آئے صرف ہفتہ بھر ہوا ہے میں نے پچشم خود فوجی تیاریاں دیکھی تھیں۔ میں عام طور پر خوفزدہ قسم کی انسان نہیں بلکہ حقیقت پسند ہوں اور میرا خیال تھا کہ جو مقامات ہوائی حملوں کا نشانہ بننے والے ہیں وہ بالکل واضح ہو جانے چاہئیں۔

اسے مجھ سے اتفاق نہیں تھا، چنانچہ وہ بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔ میں نے بیٹھر کی ہمت بندھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ رونا کی خواہش پیدا ہونا بالکل ایک فطری بات ہے اور بتایا کہ کل کی رات میں نے بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے آنسو بہائے تھے۔

پھر گورنر جیل لیگل میٹنگ کے لئے چلا گیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے سب سے کہا کہ اگر انہوں نے اپنے خطوط میں میرے بارے میں کچھ لکھا ہے تو ان خطوط کو نئے سرے سے لکھیں اور ان میں سے ایسے تمام حوالے نکال دیں۔ مجھے اس سے کچھ تشویش ہوئی، مجھے خفیہ کیوں رکھا جا رہا ہے؟

میں اندر گئی اور پوچھا کہ کیا سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے۔ لیکن ایڈورکر زڈ حال سے لگ رہے تھے۔ جرمن باشندے

اس مداخلت کے فوراً بعد میں نے انہیں بتایا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ مجھے اگلے بدلے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، میرے اس انکشاف پر وہ سخت پریشان ہو گئے کہ، ”آپ طالبان لوگوں کو پتہ ہونا چاہیے کہ اگر آپ نے میرا تبادلہ کرنے کی کوشش کی تو آپ کو سخت خفت اٹھانا پڑے گا۔ مارگریٹ تھیچر کے دور سے میری حکومت نے یرغالیوں کے تبادلے یا سودا بازی کے لئے ہر قسم مذاکرات کا انکار کر رکھا ہے۔“

ان میں سے ایک بولا ”اپنی اب کی حکومت کے بارے میں بات کرو؟“ میں نے اپنی آنکھیں رولتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے مجھے قید کرنے پر ٹوٹی پلیئر کتنا خوش ہے؟ اسے جب معلوم ہوگا کہ آپ نے مزید صحافیوں کو اندر نہیں کیا تو وہ بہت مغموم ہوگا۔“

میرا خیال ہے کہ میرے اس جواب پر وہ بہت حیران ہوئے تھے یا اس امر پر پریشان ہو گئے تھے کہ میں نے ان کے خیال کو مسترد کر دیا تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی اپنی تلیل کروا چکے تھے؟ مجھے اس کا پتہ نہیں چل سکا، غالباً کبھی بھی نہیں چل سکے گا۔

میری اس محویت کو بیٹھر کے قہقہے نے درہم برہم کر دیا، وہ کہنے لگی کہ وہ اپنے تبادلے کو یہاں ایک دن بھی مزید ٹھہرنے پر ترجیح دے گی۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ان بے چاروں نے واقعی بڑی پر مصائب اور طویل سزا کاٹی ہے اور میں اس پر انہیں بھرپور خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔

صبح تیار رہنے کی جھٹ اٹھانے کے بعد مجھے دوبارہ صرف کپڑے پہننے اور دھونے دھانے پر تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ کیتھی اور سلکے باہر صحن میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں اور ڈیانا دوسرے کونے میں بیٹھی تھی جبکہ مارگریٹ لیٹی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے بیٹھ چیل وارڈن سے باتیں کر رہی تھی۔ عین اسی لمحے مجھے اینٹی کرافٹ فائر کی فضا کرچیرتے ہوئے گزرنے کی آواز سنائی دی اور میں جس دری پر بیٹھی تھی اس پر سے اچھل پڑی اور اس کے بعد ہر قسم کی توپیں چلنے سنائی کر رہی تھی۔ عین اسی لمحے مجھے اینٹی کرافٹ فائر کی فضا کو چیرتے ہوئے گزرنے کی آواز سنائی دی اور میں جس دری پر بیٹھی تھی اسی پر سے اچھل پڑی اور اس کے بعد ہر قسم کی توپیں چلنے کا شور بلند ہونے لگا اور بیٹھرنے دیوانہ وار دوڑ بھاگ شروع کر دی، وہ پشتو میں چیخنے اور کورنر جیل اور دومر دایڈ ورکروں کو بے تحاشا آوازیں دینے لگی۔

مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ کونسی دوزخ پھٹ پڑی ہے بس یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بیٹھراتنی خوفزدہ ہو چکی ہے کہ اس پر قابو پانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں اور اس کی حرکتیں ہم سب کو متاثر کریں گی، حکام ہمیں کوٹھڑی کے اندر بند کر دیں گے۔ میں نے اسے پکڑا اور کہا ”بیٹھرخاموش ہو جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ اس سے ہم راستے میں مدد لے سکیں گے، تمہارے سلسلے میں آخری چیز جس کی ہمیں ضرورت پڑے گی یہ ہے کہ تم نیلے پیٹ والی ماکھی کی طرح چکر لگاتی رہنا اور کسی چیز کو پکڑ لینا اور میں تمہاری مدد کروں گی“ مگر اس نے مجھے پرے دھکیل اور ادھر ادھر دوزخا جاری رکھا۔

میں ڈیانا کے پاس گئی اور اسے کہا کہ کچھ کرو کیونکہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ پیش فوسز کے کام کا آغاز ہو، اگر وہ ہمیں یہاں سے نکالتے ہیں تو پھر ہمارے پاس بیس سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ بیٹھر بہت پتلی ہے اگر وہ خوفزدہ ہو جائے تو میں اسے کنٹرول نہیں کر سکتی۔

دیا۔ میرے ہاتھ میرے کلبوؤں پر تھے اور میں پاؤں کو زمین پر کھٹکھٹ مار رہی تھی۔ ان میں سے ایک مسٹر افغانی تھا جسے میں ہمیشہ ”متبسم قاتل“ (Smiling Assassin) کہتی رہی۔ اس نے وہی مصیبتوں کے پیش خیمہ الفاظ کہے جو میں جلال آباد میں کئی بار سن چکی تھی۔ ”لیکن آپ ہمارے مہمان ہیں، ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“ میں چا کر اس سے مخاطب ہوئی۔ ”میں تمہاری کوئی بلڈی مہمان نہیں ہوں میں ایک قیدی ہوں، اس جگہ سے کہیں جا نہیں سکتی، کسی ملک کو اس کی جیلوں کے حالات کے معیار سے پہنچانا جاتا ہے، اور یہ جگہ دوزخ کا غلیظ گڑھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تم کتنے فرسودہ اور ظالم طبع لوگ ہو، مجھے گھن آتی ہے آپ لوگوں سے۔“

اس کا ساتھی مدافعتی انداز میں بولا۔ ”مگر آپ کیا توقع رکھتی ہیں۔ وہ افغانستان ہے جہاں ہم بائیس سال سے حالت جنگ میں ہیں۔ ہماری جیلیں، ہماری زیادہ تر جج نہیں ہیں۔ آپ کا اپنا ہی رویہ خراب تھا، آپ بن بلائے ہم پر نازل ہوئی ہیں۔“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں پرے بٹ جانے کو کہا اور دوبارہ انہیں زبانی بھی کہا، ”جاؤ بھاڑ میں، مجھے دوبارہ نظر نہ آنا۔“ اس کے بعد پھر ان کے پاس جا کر ان کے پیروں پر تھوکا اور کوٹھڑی میں چلی آئی۔ لڑکیوں نے جو منظر دیکھا اور جو باتیں سنی تھیں، اس سے وہ ہم گئی تھیں اور مجھے احتیاط کی تلقین کر کے چھپ ہو گئیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس دفعہ میں نے جو کچھ کیا، بہت زیادہ تھا، میں بہت دور جا پہنچی تھی۔ اس لئے اندر سے ڈرنے لگی تھی۔ مجھ پر کھڑے کھڑے لرزہ طاری ہو گیا، جی چاہتا تھا کہ بیمار پڑ جاؤں۔ مجھے اپنے معدے میں ہزاروں تلتلیاں پھڑ پھڑاتی محسوس ہو رہی تھیں اور بری طرح غڈ حال ہو رہی تھی۔

بیتھر جو جیل سٹاف کے ساتھ بہت دوستانہ تعلقات رکھتی تھی، وہ ایک وومن جیل وارڈر کے ہمراہ آئی اور دروازے کے راستے میں آکھڑی ہوئی، اس نے کہا کہ ”وہ کہتی ہے کہ اگر آپ نے ہم لوگوں سے اس طرح کی باتیں کیں تو ممکن ہے کہ آپ کو زد و کوب کیا جائے یا کوڑے لگائے جائیں۔ میں نے سوچا کہ تمہیں خبردار کر دوں۔“ بات واقعی درست تھی ایسے موقع پر زیادہ تر عقلمند لوگ منہ بند ہی رکھتے ہیں، مگر میں تو عقلمندی کے راستے کی راہی نہیں تھی کیونکہ میں نے اس کو جواب یہ دیا کہ ”اگر مجھے زد و کوب کیا گیا اور مجھے اس سے درد محسوس ہوا تو مجھے خوشی ہوگی کیونکہ اس سے مجھے بھی محسوس ہو جائے گا کہ میں اب تک زندہ ہوں۔“

ایسے سخت الفاظ ایک خاص قسم کی فلموں میں ادا کئے جاتے تھے۔ میں حیران تھی کہ یہ الفاظ مجھے کہاں سے آموصول ہوتے ہیں اور اپنے آپ میرے منہ سے نکلنے لگتے ہیں۔ لیکن اصل حقیقت کچھ اور تھی، میرے دل میں خوف بڑھا چلا جا رہا تھا میں اندر سے کانپ رہی تھی اور منظر تھی کہ دیکھنے کب پکڑنے آتے ہیں اور پاپ سے میری پٹائی کرنے لگتے ہیں جیل کی مقامی آبادی میں یہ پٹائی ایک نام بات ہے۔

تقریباً بیس منٹ بعد گیٹ کے کھڑکھڑا کر کھلنے کی آواز آئی، اور چند مردوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آئیں، بیتھر خوفزدہ ہو کر کوٹھڑی کے اندر جا گھسی۔ متبسم قاتل ایک اور آدمی کو ہمراہ لے کر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی ناگوں کو لڑکھڑاتی پایا، جب آوازیں کوٹھڑی کے دروازے پر آ پہنچیں تو میں خود کو سہارے دینے لگی تاکہ گرنے سے بچ جاؤں۔

تین لڑکیوں نے خود کو فرش پر گرا کر مجھے سنبھال لیا، ساتھ ساتھ وہ دعائیں مانگ رہی تھیں کہ خدا مجھے طاقت دے اور مجھے اذیت برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ مجھے معلوم تھا ان کا مطلب کیا ہے مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ”مانٹی پائٹھن“ کی ”The life of brian“ کے ایک منظر میں پھنسی ہوئی ہوں۔ دعا کی قوت نے مجھے جلال آباد میں بھی سہارا دیا تھا، یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا خدا دوبارہ میری مدد کو آ گیا ہے۔ لیکن ہر ایک کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مسٹر افغانی (متبسم قاتل) کے ہاتھ میں سیٹلائٹ فون تھا، بجلی کا کوڑا نہیں تھا۔ اس نے سب سے کہا کہ وہ اس ٹیلی فون پر اپنے رشتہ داروں سے بات کر سکتی ہیں، ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، سب نے ایک ایک کر کے خوب جی بھر کر رشتہ داروں سے گفتگو کی۔ جرمن لڑکیوں اور ڈیانا کی حالت تو خاص طور پر قابل رحم تھی۔ کیونکہ جب سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی انہوں نے کسی سے بھی بات نہیں کی تھی۔ سبلے کو تو ایک قسم کا شہوکا دینے کی ضرورت تھی۔

جہاں تک میرا تعلق تھا، میں اس عنایت کے دائرے سے خارج تھی، اور کیتھی، خدا سے جزا دے، کہ اس نے مسٹر افغانی سے پوچھا کہ رڈ لے بھی اپنے والدین سے بات کر سکتی ہے۔ جواب ملا ”نہیں“ یہ کسی سے بات نہیں کر سکتی، یہ تعاون نہیں کرتی اور بری ہے، کیا تمہیں پتہ ہے اس نے ہم پر تھوکا تھا؟ میں اگرچہ اپنی فیملی سے بات نہ کر سکتے کی وجہ سے غمگین تھی پھر بھی میں ان عورتوں کو اس کا موقع مل جانے پر بہت خوش تھی اور وہ خوشی پانے کی مستحق تھیں۔

افغانستان میں بری خبریں یا بد مزاجی کی خبریں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں اور اگلے دن ڈپٹی فارن منسٹر، ایک چھوٹ کول منول سا اور خوش مزاج شخص مجھے ملنے اور یہ بتانے آ پہنچا کہ مجھے جلدی یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ میں نے

کورنر جیل آ پہنچا، اس نے دوسروں کو بلایا۔ آسٹریلیا کا پیٹر، بیٹھر سے کہہ رہا تھا، خاموش ہو جاؤ اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ ہم سب کو خندق میں لیجانا چاہتی ہے اور وہی آخری جگہ ہے جہاں میں پناہ لینا چاہتی ہوں، اس نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ یہ جھوٹ پر خاموش نہیں رہ سکتی تھی، میں نے کہا ”مجھے افسوس ہے اے ہمارے ساتھی، تم اوپر سے آنے والے میزائل کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، اس سے کوئی بچاؤ ممکن نہیں۔“ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کابل پر مارے گئے دواہر کی میزائل یا بغیر پائلٹ کے جاسوس طیارے تھے۔

مقام شکر تھا کہ سب خیریت گزری، دونوں آدمی اپنی کوٹھڑی میں واپس چلے گئے، بعد میں میں نے بیٹھر سے کہا کہ دوبارہ اس طرح خوفزدہ نہ ہو۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی خندق کے اندر ڈال دی جانا نہیں چاہتی، دوسری بھی میری ہمنوا تھیں، میرا خیال ہے کہ وہ سنبھل چکی تھی لیکن میں اس کے رویے سے پریشان ہو گئی۔

مجھے یقین تھا کہ ”SAS“ آکر ہمیں نکال لے گی، میں نے اسے یہ بات بتادی تھی مگر وہ بدستور خوفزدہ رہی۔ میں نے اسے کہا کہ اگر وہ بکر میں چھپنے پر مصر رہی تو سچ مچ کی بمباری شروع ہو جانے پر اکیلی رہ جائے گی۔ اس سے وہ مزید پریشان ہو گئی بہر حال وہ صرف شخصیت نہیں ہوں لیکن مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ میری زندگی کو کوئی ایسا فرد خطرے میں ڈال دے جس پر خوف کے دورے پڑتے رہتے ہوں۔

شکر ہے کہ اس دوران ایک کونے میں کچھ خوشی کی ہلچل دیکھنے میں آئی، اس وقت بیٹھر اور ڈیانہ کے لئے ڈاک آئی تھی۔ بیٹھر نے فاتحانہ انداز میں بتایا کہ اس کے والد نے اسے خط لکھا ہے کہ امریکہ نے اس وقت تک فوجی کارروائی روک رکھنے کا یقین دلایا ہے جب تک اس کی خیریت و حفاظت کا بندوبست نہ ہو جائے۔ میں اس پر برا فروختہ ہو گئی کہ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے، اس نے اپنی بات کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اس کا باپ امریکی سفارت خانے میں ہوتا ہے، وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے جواب دیا ”میں یقین سے کہتی ہوں کہ تیرا باپ جھوٹ نہیں بولتا ہوگا اور تو بھی نہیں چاہتی کہ وہ ایسا کرے، تاہم میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کون پاؤں تیرے باپ کو اعتماد میں لے کر اسے بتائے کہ بمباری کب سے شروع ہو رہی ہے اور خاص طور پر ایسے وقت میں کہ اسے معلوم ہے کہ وہ تمہیں طالبان کی جیل میں خط لکھ رہا ہے وہ تمہیں صحیح اطلاع کیسے دے سکتا ہے؟“

مجھے بری خبر سنانے کا افسوس تھا، لیکن جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ میں حقیقت پسند انسان بننے کی کوشش کر رہی تھی اور جیل جھوٹے خواب دیکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ تاہم ڈاک وصول ہونے سے وہ واقعی خوش ہو گئی اور میرا اور ڈیانہ کا خیال تھا کہ کیتھی کو جو خط ملا ہے اس سے اسے اس لئے بھی بے پناہ خوشی ہوئی ہے کہ جرمن لڑکیوں کو بمشکل ہی کوئی ڈاک ملتی تھی۔ اس کا پہلے انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا میرا خیال ہے کہ اس سے طالبان کو بہت مشکل پیش آتی تھی۔

سلکے کو کوئی خط نہ ملا تھا، اس کا اس کو بہت ملال تھا، اس کی طبیعت پہلے ہی کچھ نا ساز تھی۔ چنانچہ وہ چند آنسو بہانے کے لئے کوٹھڑی سے باہر چلی گئی اس سے میں گھبرائی کیونکہ وہ بہت مضبوط اعصاب کی تھی اور عموماً خود کو کنٹرول میں رکھتی تھی، سنبھلنے کے بعد وہ کچھ دیر صحن میں ہی رہی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے آنسوؤں نے کورنر کو، جس نے خطوط تقسیم کئے تھے، متاثر کیا کیونکہ رونا اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک رحمدل بوڑھا تھا بہر حال میں اس پر اسے کوئی کریڈٹ نہیں دیتی۔

بعد ازاں دن کو وزارت خارجہ کے دواہر آئے، ان کے ہمراہ یہ ادا اس چہرہ کورنر جیل بھی تھا، انہوں نے اعلان کیا کہ میں اب وزارت خارجہ کی مہمان ہوں اور یہ بھی کہا کہ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو اب مجھ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ سن کر میں کافی مطمئن ہوئی کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاسوسی کے الزامات اور پیشل فورسز سے تعلق والی باتیں اب نہیں سننا پڑیں گی۔

اس روز میں نے تھوڑی دیر پہلے، یوگا کا دوسرا سیشن چار بجے سہ پہر مکمل کیا تھا، یہ میں نے دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں شروع کیا تھا کیونکہ میں طالبان کو یہ بات سمجھانا چاہتی تھی کہ میں یا تو حیرت انگیز طور پر مضبوط عورت ہوں یا بک بک کرنے والی ایک پاگل سی عورت ہوں۔ دونوں صورتوں میں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ میری اس مشق سے بے حد مضطرب رہے اور جب تک میں نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں وہ ایک کونے میں بیٹھے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

مستند قاتل

وزارت خارجہ کی طرف سے خوشخبری لانے والوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ انہیں مجھ سے چند سوالات پوچھنے ہیں، اس پر چند گھنٹوں سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں اس پر تیخ پا ہو گئی اور ان کے ساتھ تعاون سے انکار کرتے ہوئے کہا، جاؤ سب جہنم میں، یہ کہتے ہی میں نے اپنی یوگا کا اگلا حصہ زیادہ تندی سے شروع کر

بات بے تو جہی سے سنی لیکن اس نے مجھے کہا پریشان مت ہوئے۔ میں بولی ”میں پریشان نہیں ہوں، میں بے حد ناراض ہوں، تمہارے الفاظ خاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کابل کے سفر کے بارے میں بری طرح دھوکا کھانے کے بعد میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتی اتیلی جنس کے لوگ جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہے، اب مجھے یہاں لا کر اس جہنم کے گڑھے میں لا کر بند کر دیا گیا ہے“ پھر میں نے باقاعدہ شور مچاتے ہوئے کہا ”آپ کیسے لوگ ہیں؟“

ہم صحن میں تھے اور گورنر جیل اوپر سے نفرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے کمبل کی طرف مڑی اور اپنی یوگا جاری رکھی، سورج گرمی پر سارہا تھا اور زمین تپ رہی تھی، میں جب بیٹھ گئی تو اسے کہا ”اب تم جاسکتے ہو“ میں سخت پریشان اور پڑمردہ تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں خواہ کتنی ہی گستاخ اور بیہودہ کو بننے کی کوشش کروں، مجھے ان کی طرف سے ملنے والا رد عمل ایک مسکراہٹ اور مہمان ہونے کی حیثیت کے روایتی جملوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں ”مسز اینگری“ کا کردار مسلسل ادا کرتے کرتے تھک چکی تھی، سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کب تک نبھاتی رہوں گی۔ میری فطرت میں گستاخی اور جارحیت تو ہے ہی نہیں۔ ہمہ وقت اپنے اصل مزاج کے منافی کردار کو جاری رکھنا بہت مشکل نظر آنے لگا۔

ہیٹھر نے مجھے ”Ken follet“ کا ناول ”Code to zero“ دیا۔ اس نے بہت پُر جوش انداز میں کہا۔ ”آپ اسے ہاتھ سے چھوڑ ہی نہیں سکیں گی، ہم سب نے اسے پڑھا ہے۔ یہ بڑا ہی انوکھا اور دلچسپ ہے“ میں نے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اتنی طویل کتاب پڑھنا شروع کر دی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہاں اتنا عرصہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے میں نے اسے قبول کر لیا ہے۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com

کی ایک ممبر ہوں۔ میں نے شور مچاتے ہوئے کہا ”لڑکیو! ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، میں SAS میں ہوں، میں تمہیں آج رات بڑے کیلی کا پٹر میں نکال لے جاؤں گی جو میں نے یہاں صحن میں دفن کیا ہوا ہے۔“ یہ مسخ شدہ صحافتی مزاح کی ایک اور مثال تھی جس نے بظاہر تو میری ہمت بڑھادی مگر اس آرٹیکل کے مواد پر مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں اس بلڈی جرنلسٹ کی گردن مروڑ دینا چاہتی تھی، مجھے محسوس ہوا جیسے اس شخص نے میری موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے ہیں، بہر حال مجھے ان افواہوں پر مٹی ڈال دینی پڑی۔

میرے دوراں تھے جو میرے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتے تھے۔ طالبان کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آنا تھی کہ میں نے ایک اسرائیلی (شوہر نمبر 3) سے شادی کیوں کی تھی اور آپ کو بالکل سچ بتا رہی ہوں کہ اس سے شادی کرنے کی وجہ مجھے بھی سمجھ نہیں آتی تھی اس وجہ سے مجھے کوڑے لگنے چاہئے تھے، اور دوسرا ”راز“ ایک حقیقت تھا۔ یعنی میں ٹیریوریل آرمی میں رہ چکی تھی۔

ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں اپنی کوٹھڑیوں کے اندر ہی رہنا چاہیے کیونکہ کچھ لوگ میرے لیے الگ کوٹھڑی کے انتظامات کے سلسلے میں کچھ رد و بدل کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں یہ بھی تاکید کی گئی تھی کہ ہم ان سے چھپی رہیں۔ یہ بڑا اٹھکا دینے والا کام تھا، میرے یہاں آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے لیکن میں خود کو تیسرے درجے کی شہری محسوس کرنے لگی تھی کیونکہ میں ایک عورت تھی۔

میں بعد میں اپنی کوٹھڑی کا جائزہ لینے کے لئے گئی، یہ بڑی ہی بدبیت اور قابل نفرت جگہ تھی۔ کنکریٹ کے فرش کے ایک کونے میں ایک بڑا سا گڑھا تھا، اس میں سے نکلتا ہوا ایک جنگلی چوہا دکھائی دیا۔ جب تک میں جھپکتی رہی وہ ادھر ادھر پھدکتا رہا۔ دیوار پر کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ان میں عربی الفاظ نمایاں تھے۔ کھڑکیوں میں سے مردوں کی جیل پر نظر پڑتی تھی۔

دروازہ دیکھا تو وہ ٹھوس دھات کا تھا، اس میں تالہ بھی تھا، اسے دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گئی کہ اگر میں نے گالم گلوچ کی تو اس کے اندر بند کر دی جاؤں گی جو پورے چوبیس گھنٹے کی بندش بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے لڑکیوں سے پوچھا کیس پر قسم کی کوئی ”گلیو“ مل سکتی ہے تاکہ میں وہ ڈال کر تالے کو بیکار بنا دوں۔ وہ نہ ملی تو میں نے اس میں مٹی ڈالی اور ایک پتھر مار کر اسے توڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد فارن مشنری کا وہ کول منول اور خوش مزاج شخص، کورنر جیل سمیت میرے پاس آیا اور میری کوٹھڑی کے حوالے سے میری رائے پوچھی۔ میں نے کہا کہ یہ انتہائی غیر مناسب ہے، میرا بس چلے تو میں اس میں مویشیوں کو بھی نہ رکھوں، افغانستان میں رہ کر بھی ان کے لئے مناسب نہ سمجھوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور مجھے ان غلیظ حالات میں رکھنے پر معذرت چاہی۔

اس نے مجھے اپنا سامان سینے کے لئے کہا کیونکہ وہ مجھے طالبان سلپنگ کوارٹرز میں اس سے زیادہ آرام دہ کمرے میں لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے اس حد تک نرم رویے پر حیرت ہوئی اور شبہ بھی پڑا کہ کہیں مجھے خوفناک اذیت دینے تو نہیں لے جا رہے ہیں، وہ ساتھ یہ بھی کہتا رہا کہ مجھے کل صبح رہا کر دیا جائے گا۔ میں نے صرف اتنا جواب دیا۔ ”جی ہاں جی ہاں، یہ بات بہت دفعہ سن چکی ہوں کل، بس کل، انشاء اللہ۔“

میں نے مطالبہ کیا کہ مجھے پہلے وہ کمرہ دکھایا جائے جس پر مجھے صحن سے باہر سیڑھیوں کے راستے اوپر لے جا کر ایک کشادہ کمرہ دکھایا گیا، جہاں سے کابل پہاڑ بالکل سامنے نظر آ رہا تھا۔ میں اس سے واقعی متاثر ہوئی۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اندر سے خوش ہونے کے باوجود میں نے اپنے چہرے کو کرخت بنائے رکھا اور اسے بتایا کہ ہاں ٹھیک ہے یہ موزوں رہے گا۔

پرانی کوٹھڑی میں واپس جا کر میں نے ڈیانا کو بتایا کہ ان کا رویہ تو نرم ہو چکا ہے مگر پتہ نہیں چل رہا کہ کیا ہو رہا ہے، امکان تو ہے کہ جلدی چلی جاؤں گی۔ آپ نے جو کچھ میرے لئے کیا، اس کا شکریہ، خدا آپ کو خوش رکھے۔ ایک اور لڑکی نے ”فالیٹ“ ناول میرے ہاتھ میں زبردستی پکڑا دیا اور مجھے باہر کر طرف دھکیل دیا۔

اتوار کے دن شام ہونے والی تھی، دھند کا چھارہا تھا میں نے کمرے میں لائیٹ سوچ آن کر دی۔ کمرے کے وسط میں ایک افغانی تالین بچھا تھا جس کے گرد تکیے لگے تھے کونے میں ایک پرانا سا ہاسپٹل بیڈ پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب کمرے سے نہیں نکلوں گی اور ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ خاصا دلچسپ تھا اس لئے میں فوراً اس میں کھو گئی۔

اچانک روشنی کے تیز شعلوں نے خاموشی درہم برہم کر دی، ٹریسرفضا میں بلند ہو رہے تھے پھر اینٹی ایئر کرافٹ فائر ہونے لگے۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے کروڑ مزائل اپنے اہداف کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ان مزائل کی آواز بیس میل کے فاصلے سے ہٹانے پر پہنچنے سے پہلے، ہی آ جاتی ہے مگر یہ جیل سے نصف میل کے فاصلے پر آ کر گر رہے تھے۔ جس سے کھڑکیاں اور دروازے بری طرح کھڑک رہے تھے۔

میں چھلانگ لگا کر بیڈ سے اُتری اور اپنا چہرہ کھڑکیوں کے ساتھ لگا دیا، رات کے تقریباً 9 بجے کا وقت تھا۔ پہاڑی

مارگریٹ نے کہا کہ میں ”اس کی“ ایک کتاب چاہوں تو پڑھ سکتی ہوں جب وہ اسے نہ پڑھ رہی ہو تو میں اسے اٹھا لیا کروں، یہ کتاب مختصر افسانوں کا ایک سلسلہ تھی۔ میں اپنے موڈ کے مطابق ان افسانوں میں سے نکل بھی سکتی تھی اور دوبارہ بات وہیں سے شروع بھی کر سکتی تھی۔ میں نے اس کی ورق گردانی کی اور اس میں چھپے ہوئے طنز پر ہنسنا شروع کر دیا۔ یہ کتاب ایک معتبوب سیاسی بد معاش جفری آرچر کی تالیف ہے۔ میں نے لڑکیوں کو بتایا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے یہ زمانہ قید میں لکھی ہے مگر میں شرط لگا سکتی ہوں کہ اسے ہر صبح پانی کے لئے ناکا نہیں بلانا پڑا تھا۔ مجھے لگتا تو نہیں کہ منوف کتاب میری ربائی سے پہلے رہا ہو جائے گا۔ پھر ہم ان مغربی ریغمالیوں کی باتیں کرنے لگیں جو بیروت میں قید تھے، ان میں ”Terry waite“، ”Terry anderson“ اور ”John mccarthy“ بھی شامل تھے۔ میں یہ یاد کر کے بے حد افسردہ ہوئی کہ وہ بڑے عرصہ سے اندر ستر رہے ہیں۔ میں نے بیتھر کو بتایا کہ موازنہ کیا جائے تو کابل جیل میں ہمارے حالات، ان کے حالات سے کہیں بہتر ہیں، ہم کم از کم انداز تو گھوم پھر سکتی ہیں۔

تاہم جیل کی زندگی پھر بھی ایک لگا بندھا معمول ہوتی ہے۔ اور جب آپ کچھ کھاپی نہیں لیتے تو معمول سے بھی زیادہ بیزاری اور اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ عورتیں جیل کی بنیادی غذا روٹی اور چاول کے ہمراہ کچھ اور چیزیں پکا لیتی ہیں، اس کے لئے اجزاء کی روزانہ ایک شاپنگ لسٹ بناتی ہیں، تازہ پھل بھی منگواتی ہیں، یہ لسٹ زنانہ وارڈز کو تنہا دی جاتی ہے، بہت سے بیرونی ممالک کی جیلوں کے قیدیوں کی طرح اگر آپ کے پاس مطلوبہ رقم ہے تو آپ باہر سے پکا پکایا عمدہ کھانا بھی منگوا سکتی ہے، زنانہ وارڈز نے اس کے لئے مناسب انتظامات کر رکھے ہوتے ہیں۔ ڈیانا کے پاس نقد رقم تھی اور عورتیں باری باری کھانے پکاتی رہتی تھیں۔ بھوک مجھے اگرچہ اب نہیں ستاتی تھی اور کھانے کا خیال آتے ہی میری رال پکھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ البتہ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دن جب سلکے کھانا پکانے لگی تو اس میں سے نکلنے والی خوشبوئیں بے حد دلفریب تھیں اور جب اس نے تازہ دھنیاں کے پتے کترنا شروع کئے تو ساری فضا مسکور کن خوشبوؤں سے معمور ہو گئی۔ میں آج بھی آنکھیں بند کر کے اس خوشبو کا تصور کرتی ہوں تو اسے محسوس کر سکتی ہوں۔

اس رات مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی کیونکہ آخری سرے کی کوٹھڑی میں کوئی بچہ رات بھر چنچتا رہا تھا۔ وہ اس کوٹھڑی میں بند دو عورتوں کے ساتھ تھا، انہیں سزا اس لئے ملی انہوں نے رات کو اپنے پاس ایک اجنبی مرد کو ٹھہرا لیا تھا جو ان سے تالین خریدنے کے لئے آیا تھا۔

سدا محروم عورتیں

افغانستان کے طالبان دور میں عورتوں کی کوئی زندگی نہیں تھی۔ مگر یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس سے پہلے کے ادوار میں بھی انہیں اس سے بہتر زندگی میسر نہیں آئی تھی۔ یہ بے حد افسوسناک بات ہے کہ اس ملک میں عورتیں سدا محروم رہی ہیں۔ ان کا بچے جننے کے سوا کوئی کردار نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ جب وسط نمبر میں طالبان کو شکست ہونا شروع ہو گئی تو عورتیں بے باکانہ انداز میں سرعام اپنے چہرے دکھانے لگ گئی تھیں، اس کے بعد ان کی زندگی کا معیار کیسا رہے گا، اس کا آگے چل کر ہی پتہ چلے گا۔

اس روز وزارت خارجہ کا آدمی سہ پہر کو آیا اور اس نے بتایا کہ مجھے بہت جلد اپنی لاگ کوٹھڑی مل جائے گی اور یہ بھی کہا کہ ”ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ آپ ہماری مہمان ہیں۔“ اس پر میں ایک بار پھر احتجاج کرنے لگی تھی لیکن اس نے فوراً اگلی بات شروع کر دی ”ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ایران میں بھی ایسے ہی حالات کا تجربہ ہو چکا ہے مگر معلوم نہیں آپ ہمیں ہی قدم زمانے کے لوگ کیوں قرار دیتی ہیں۔“ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی زبردست انکشاف کر رہا ہو یا کسی رزا پر سے پردہ ہٹا رہا ہو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا بات کہہ رہا تھا، میں تو زندگی بھر ایران نہیں گئی۔

کابل جیل کے باہر کیا ہو رہا تھا، مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میرے اخبار نے اسلام آباد میں طالبان کے سفیر کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا کہ کیا ”ایکسپریس“ کا چیئر مین رچرڈ ڈیسمنڈ اسامہ بن لادن سے خصوصی انٹرویو کے انتظامات کو حتمی شکل دے رہا تھا یا نہیں، جو اس کے ”ok“ میگزین میں زیر عنوان ”My cave“ میں چھپنے والا تھا۔

کورنز جیل، ان لڑکیوں میں سے ایک سے گفتگو کر رہا تھا اور اس نے غالباً یہ کہا تھا۔ ”جارج بش تم لڑکیوں کے سلسلے میں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اب ٹونی بلیئر اس خوفناک انگریز عورت کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔“ میں شدت جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ میں اپنے آپ کو اتنی اہم نہیں سمجھتی تھی اور تو فیہ رکھتی تھی کہ میرے ملک میں کوئی خاص ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی۔ پھر مجھے ایک پاکستانی اخبار دکھایا گیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ میں سیشل فورسز

پڑے ہوئے مکانوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں، یہ اندھیرے میں الپس کی پہاڑیوں اور کمرس ٹری کا سا منظر تھا۔ ہمیں کسی وارننگ کے بغیر اندھیرے میں دھکیل دیا گیا تھا، اتنے میں آٹھ طالبان سپاہی دوڑتے ہوئے سیدھے میرے کمرے میں داخل ہو گئے، میں چونک پڑی، کیونکہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ دستک دینے بغیر کبھی نہیں آتے تھے۔

مجسوں کے ذخیرے پر بھڑا ہوا ہتھیار

ان میں سے کئی ایک میرے بیڈ کے نیچے جھکے اور وہاں سے راکٹ سے چلنے والے گرینیڈوں (RPG's) کے تھیلے باہر کھینچنے لگے۔ میں نے سوچا ”اسے یسوع، کیا میں ہتھیاروں کے اتنے بڑے ذخیرے سے صرف ایک میٹر کے فاصلے پر بیٹھ کر یوں کے بھاری کش لے رہی تھی۔“ میں سخت غضبناک ہوئی اور دھاڑتے ہوئے پوچھا کیا کر رہے ہو یہاں پر؟

ان میں سے صرف ایک نے جواب دینے کی کوشش کی، اس نے ہنستے ہوئے اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”امریکا! امریکا! امریکا! آج، آج، آج، آج“ میں اس کونگوں جیسی زبان پر مزید برہم ہو گئی۔ میں نے کہا یہ کلاشنکوفیں اور یہ ”RPG“ آسمان پر چنگھاڑنے والے ”بی 52“ بمبارطیاروں کو نہیں گرا سکتے۔ وہ اپنا اسلحہ لے کر بھاگتے جا رہے تھے۔ میں نے پیچھے سے آواز لگائی، ”چاہو تو تیرکمان بھی استعمال کرلو۔“

اتنے میں کورنر جیل اندر آ گیا اور اس نے مجھے اشارے سے خاموش رہنے اور پریشان نہ ہونے کی تاکید کی۔ میں اپنے لئے پریشان نہیں تھی مگر سیڑھیوں کے نیچے ایڈورکرز اور بالخصوص ہتھڑے کے لئے پریشان تھی۔ اگر اس پر ہفتے کو بغیر پائلٹ طیارے کے حملے سے خفقان کا دورہ پڑ گیا تھا تو یہ حملہ پتہ نہیں اسے کہاں پہنچا دے گا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے سیڑھیوں سے نیچے لے جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔

پھر وہ چلا گیا، میں خود بھی جاسکتی تھی لیکن وحشت ناک آنکھوں والے طالبان، تیزی سے ایک طرف سے دوسری طرف دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ لوگ تو نشا نے ڈھونڈ رہے ہیں، جنگ کی دھند چھائی ہوئی ہے، کہیں کوئی ایسی ویسی نہ ہو جائے، میں واپس اپنی نشست پر جا بیٹھی اور بمباری دیکھنے میں محو ہو گئی جو تقریباً چالیس منٹ جاری رہی۔ ان کے دو ہدف تھے میرے خیال میں ایک تو ایئر پورٹ کے قریب تھا جہاں کسی شتم کا فوجی تربیتی کیمپ تھا اور دوسرا ہدف دوسری سمت میں معلوم ہو رہا تھا۔

اور جو ایک پر اسرار اور نرالی چیز تھی، وہ رات کا آسمان تھا کیونکہ نیچے سے جو چیز اوپر پھینکی جا رہی تھی سلوروائیٹ اور گرے شیڈوں میں تھی، اور ساری کی ساری یک رنگی (مونو کروم) تھی۔ لیکن جو بات میرے لئے باعث تشویش تھی یہ تھی کہ میں کابل میں واحد مغربی صحافی تھی جس نے مغرب کی بمباری کا آغاز اپنی آنکھوں سے دیکھا مگر میرے پاس سنو ری فائل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

پورا ہوائی منظر میرے سامنے پھیلا ہوا تھا اور میں فون کر کے اپنے نیوز ڈیسک کو نہیں بتا سکتی تھی کہ میں کیسے کیسے خوفناک مناظر کا مشاہدہ کر رہی ہوں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں کب تک رہوں گی اور وقفے وقفے سے فضا میں بلند ہونے والے آگ کے شعلوں کی کیفیت بیان کر سکوں گی۔

پہلے تو میں کچھ اطمینان محسوس کرتی رہی اور پھر مجھے مکروہ چہرہ مسٹر افغانی عرف ”متبسم قاتل“ یاد آ گیا جس نے طالبان کے ہاتھوں جا سوس طیارہ گرائے جانے پر فضا میں مکہ مارا تھا، چنانچہ میں نے اس کے اعزاز میں چلاتے ہوئے جنگی نغمہ..... ”رول برطانیہ رول“ گانا شروع کر دیا۔

میں نے بیجان خیز ”ایڈرینالین“ کو اپنے جسم میں پوری شدت سے گردش کرتی ہوئی محسوس کیا اور بمباری شروع ہو جانے پر خود کو محفوظ ہوتے پایا۔ میری بات کسی کو خواہ مطلب پرستی اور خود غرضی لگے، میں اپنے دفاع میں صرف یہ کہوں گی کہ جیل کی زندگی یہاں تک پہنچا کر چھوڑتی ہے لیکن میرے اندر یہ احساس موجود رہا کہ ممکن ہے کہ وہ میرے اور ایڈورکرز کی وجہ سے بمباری سے گریز کر رہے ہیں۔

میرے خیالات اچانک اپنے خاندان کی طرف مرکوز ہو گئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ جارج بش کی جانب سے اس اعلان پر کہ بمباری شروع کر دی گئی ہے، میرے خاندان کو کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔ طالبان سپاہی واپس آ گئے اور میرے دروازے پر دستک دی، جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ سر جھکا گئے قطار میں اندر آئے اور RP's کو آہستہ آہستہ میرے بیڈ کے نیچے رکھ کر واپس چلے گئے۔

اسلام آباد میں واپسی

پیر 18 اکتوبر کی صبح میں 5.30 پر اٹھی اور نہانے اور اپنے بال دھونے کا فیصلہ کیا۔ ٹائلٹ کی طرف گئی تو تے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وہاں بہت گندگی پڑی تھی، یہ نش بیت الخلاء تھا مگر غلاظت پا کر طبیعت بے حد خراب ہوئی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کسی جگہ منتقل ہونے پر رضامندی کا اظہار کرنے سے پہلے سب ٹائلٹس کا معائنہ کیا کروں گی۔

چنانچہ میں نے نہانے کا ارادہ بدل دیا، کیونکہ جتنی جلدی ٹکنا ممکن تھا، میں نکل جانا چاہتی تھی۔ بیڈروم میں واپس آ کر میں نے اپنے دانت صاف کئے مجھے چھ بجے صبح تیار رہنے کے لئے کہا گیا تھا، عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں عجلت میں اسے کھولنے گئی تو وہاں صرف ایک کارندہ ناشتے کے لئے بریڈ اور کچھ سبز چائے دینے کے لئے کھڑا تھا۔

میں بمباری کے بعد لڑکیوں کی خیریت کے بارے میں متفکر تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ میں نے اپنے مکین ساتھیوں کو تو اطمینان دلایا تھا کہ بمباری کا ہدف دہشت گردوں کے ٹھکانے ہیں مگر ان لڑکیوں کے بارے میں پریشان ہو گئی تھی۔ مجھے پتھر کو یہ بتانا یا د تھا کہ ”سارٹ مرائل“ نشانے پر اتنے صحیح بیٹھتے ہیں کہ اگر اسے استعمال کرنے والے یہ چاہیں کہ وہ اگلے باغ کے فلاں درخت کو نشانہ بنائیں تو وہ ہمیں نقصان پہنچائے بغیر اسے تباہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف تھا وہ بمباری کے خلاف کابل کے عوام کا رد عمل تھا۔ کیونکہ اگر وہ امریکا اور برطانیہ سے انتقام لینا چاہتے تو انہیں معلوم تھا کہ مغربی ممالک کی لڑکیاں کس جیل میں رکھی گئی ہیں۔ تاہم اس رات ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

میرا ذہن، خود میری طرف واپس آ گیا اور میں اترائی کی طرف گئی جہاں چند طالبان کھڑے کھڑے کورز جیل سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بلند آواز سے کورز کو متوجہ کیا اور بازو کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”میری گاڑی کہاں ہے؟ میرا ڈرائیور کہاں ہے؟ یہ بہت بے ہودہ حرکت ہے اگر تم جنگ چاہتے ہو تو ہم تمہیں جنگ دیں گے، دیکھو کیا حشر ہوا سلو بوڈن ملسووک (یوگوسلاویہ کا سابق صدر Slobodan Milosovic) کا: اسے قید کر لیا گیا ہے۔ تیرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا، میں اس بارے میں لکھوں گی اور تم میں سے ہر ایک کی الگ الگ نشاندہی کروں گی اور تم پر جنگی جرائم کے ٹریبونل میں مقدمہ چلے گا۔“

یوں دھمکیاں سنانے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی اور دروازہ بند کر کے اندر سے چھنی لگالی۔ میں غضبناک اس لئے ہوئی تھی کہ وہ میرے ساتھ ایک بار پھر چلا کی کر رہے تھے اور مجھ پر قسم قسم کے ذہنی حربے آزمائے جا رہے تھے۔ میں اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں، تو یوں نظر آ رہا ہے کہ میں اس وقت دراصل اندر سے ٹوٹ رہی تھی اور دماغی توازن تیزی سے بگڑ رہا تھا۔ کیونکہ میں کسی طرح بھی ان لوگوں کو دھمکیاں دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ میں نے ایک رات پہلے مزائلوں کے خلاف تیرکمان کے استعمال کا فقرہ بحث کر کے ان کا تمسخر اڑایا تھا، لیکن خود میں نے عام رائفل بھی نہیں چلائی تھی۔

مجھے اس ڈھیلے ڈھالے بیڈ کے طرف واپس جانے اور اس کے نیچے پڑے ہوئے تمام ”RPG's“ (گرینڈ وں) کو دوبارہ دیکھنا بھی یاد ہے اور میرا خیال اس طرف بھی گیا کہ ایک لحاظ سے یہ بھی ایک اچھی علامت تھی، کیونکہ اگر میں ان کی نظر میں ”GI Jane“ یا سیشل فورسز وومین ہوتی تو وہ ایسے ہتھیاروں کی میرے پاس نہ چھوڑتے۔ ٹیریوریل آرمی کے دنوں دوران تربیت گنوں کے ساتھ میری نازیبا حرکت کے حوالے سے تصور کیجئے کہ ”RPG“ کے ساتھ میں کتنا برا نقصان پہنچا سکتی تھی، ہو سکتا تھا کہ اپنا پاؤں یا سر اڑا لیتی۔

میں نے خود کو لڑکیوں کی دی ہوئی کتاب میں ہی مصروف رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا کہنا بالکل درست تھا۔ میں واقعی اس میں کھو گئی تھی لیکن پہلے روز میں اتنی جلدی میں تھی کہ جب میں آخری باب پر پہنچی تو میں حیران ہو گئی کہ میں تو اپنے آپ کو بے پناہ مصروف کر رہی ہوں کیونکہ بات صاف واضح تھی کہ مجھے کہیں بھی جانا نہیں تھا۔

میں سگریٹ باکس میں سے ایک سگریٹ لینے کے لئے اٹھی، یہ 200 سگریٹوں والا باکس تھا جو ان ایڈورکرز نے مجھے خرید کر دیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ خود سگریٹ نوش نہیں ہیں، میں نے سوچا کہ پیار بڑھانے کا یہ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی میرے پاس ماچس کی ڈبی میں صرف ایک تیلی ہے، اب میرے لئے خالی ڈبی ہاتھ میں پکڑے گرفتار کرنے والوں کے پاس دوبارہ جا کر درخواست کرنا کہ مجھے نئی ماچس دو، مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں نے ایک سگریٹ سلا لیا اور پھر اس کے بجھنے سے پہلے دوسرا لگالیا، اس طرح چین سموکنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طبیعت خراب ہو گئی، خیال ہے میں نے چلتے چلتے کتاب پڑھتے ہوئے کم و بیش سات سگریٹ پی لئے اور ساتھ کتاب بھی ختم کر ڈالی۔ اس کے بعد میں ”رول

برطانیہ رول“ گاتے ہوئے کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتی رہی۔ یہ صرف اس لئے کہ مجھے پچھلے سال ”لاسٹ نائیٹ ایٹ دی پرامز“ گانا یاد تھا اور اس سال اس کا نغمہ ہو گیا کیونکہ اب میں یہاں تھی۔ پھر میں نے بلند آواز سے اپنا قومی ترانہ گانا شروع کر دیا، میں کبھی صحیح طور پر گانے نہیں سکی تھی اور آج پریشان بھی تھی۔ اس لئے میں نہ صرف بھدے اور بے سرے طریقے سے ترانہ الاپ رہی تھی بلکہ کانپ بھی رہی تھی۔ غالباً باہر سپاہی سوچتے ہوں گے: ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ گانا ممنوع کیوں ہے۔

بلاشبہ انہوں نے یہی سوچا ہوگا کہ مجھ سے گانے کا پلاٹ کھو چکا ہے، اس لئے بے سری ہو گئی ہوں۔ جب میں ذرا ہمت کر کے کھڑکی کے قریب گئی اور نیچے دیکھا تو ایک سپاہی مجھ پر نظر پڑھتے ہی مسکرا دیا۔ اس نے ایک پرانی گرد آلود کار کی کھڑکی پر ہاتھ سے جلدی جلدی لکھا:

”تم کابل سے جا رہی ہو“ میں مسکرا دی، لیکن اس پر یقین نہیں کیا۔

پھر میں پیچھے ہٹ گئی اور جب واپس آئی، تو اس نے مزید الفاظ لکھے ہوئے تھے، جن میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اپنے گھر جا رہی ہوں، یہ کہ وہ مجھے الوداع کہہ رہا ہے اور یہ کہ میں اسے بہت یاد آیا کروں گی۔ میں اس پر حیران ہوئی کیونکہ مجھے یاد نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے سے کبھی ملے ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ان بہت سے سپاہیوں میں سے ہو جو مجھے صحن میں یوگا کرتی ہوئی پا کر محفوظ ہوتے رہتے تھے یا انہوں سے میری لڑائیوں پر مجھے دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرتے تھے۔

میں نے اپنا قلم نکالا اور سگریٹ کی ڈیبا پر لکھا: ”اچھے لفظوں کا شکریہ، لگتا یہی ہے کہ میں جا رہی ہوں، اگر واقعی چلی گئی تو تمہارے اچھے مستقبل کے لئے دعا کو رہوں گی“ یہ لکھ کر گتے کا یہ ٹکڑا، کھڑکی کے ایک سوراخ میں سے نیچے گر دیا، اس نے وہ اٹھایا اور خوشی خوشی چا گیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ کیا ملا عمر نے اس قسم کے میل جول کو حکماً ممنوع قرار دے دیا تھا، غالباً اس نے میرے جیل کے اندر ہونے کے دنوں میں کوئی ایسا قانون نافذ کر دیا تھا کہ عورتوں کو پکنک پر جانے کی اجازت نہیں ہے تاوقتیکہ وہاں کوئی خیمہ نہ گاڑ دیا گیا ہو اور انہیں مردوں کی نظروں سے دور رکھنا پینا چاہیے..... پاگل لوگ

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ آندو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com

کے اس فقرے کی مانند تھا۔۔۔۔۔ ”اوہ، دوبارہ بارش ہو رہی ہے۔“ ایسا لگتا تھا کہ اگر بارش ہوئی ہوتی تو ان میں پہچان کچھ زیادہ ہوتا۔ کابل بھوتوں کا مسکن بن چکا تھا، جن لوگوں کو یہاں سے چلے جانا تھا، وہ جا چکے تھے۔ شہر سے باہر نکل کر کابل کی گھاٹی میں سے گزرنے کا منظر میرے لئے بے حد ڈرامائی اور درہ خیبر کی بہ نسبت زیادہ حیرت انگیز تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات انتہائی تنگ پہاڑی سڑکوں پر گاڑی کے موڑ کاٹنے پر میرے رو گئے کھڑے ہو جاتے تھے، صحیح موڑ نہ کاٹ سکنے والی گاڑیاں ڈھانچے بنی ڈھلوانوں اور کھائیوں میں پڑی نشانِ عبرت بنی ہوئی تھیں۔

گھاٹی سے اور ان طویل سڑگوں میں سے، جو چٹانیں کھود کر نکالی گئی تھیں، گزرتے ہوئے میں آگے کے چھ گھنٹوں کے سفر کے بارے میں سوچتی اور ٹوٹی پھوٹی چٹانوں اور روڑی کنکر سے اٹے ہوئے راستے سے گزرنے کی مشکلات پر متفکر ہوتی رہی۔ ہم جس چیک پوائنٹ پر سے بھی گزرے سفارتی افسروہاں ملا عمر کے دستخطوں سے جاری ہونے والا کاغذ دکھانا رہا، جس میں کہا گیا تھا کہ ”یو آئے رڈ لے کو انسانی بنیادوں پر رہا کیا گیا ہے۔“ طالبان کا ایک گروپ جو میری رہائی کے حق میں نہیں تھا، وہ خاص طور پر رات کی بمباری پر ہم تھا، وہ چیک پوائنٹ پر سب کو گاڑی میں سے اترنے کا حکم دیتا تھا، اس نے ڈرائیور کے اور ان کے درمیان تلخ کلامی شروع ہو جاتی، پھر وہ اس بیش قیمت کاغذ کے ٹکڑے کو ان کے ہاتھ سے چھین کر گاڑی چلا دیتا۔ مجھے ڈرتو لگتا تھا تاہم اس کی طرف سے مزاحمت ہونے سے قدرے اطمینان ہو جاتا تھا۔

نصف راستہ طے ہو جانے پر ہم ایک سنگل سٹوری بلڈنگ کے پاس رکے۔ سپاہی ایک طرف چلے گئے اور مجھے دوسری جانب چلنے کا اشارہ ملا۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ نائلٹ کا کوئی انتظام ہے۔ اندر پہنچی تو کئی عورتیں بچوں سمیت دسترخوان پر کھانا کھانے میں مصروف تھیں، میں نے ان سے نائلٹ کا پوچھا، انہوں نے میری بات سمجھے بغیر ہی ایک پردے کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں اطمینان سے ادھر بڑھ گئی، پردہ اٹھایا ہی تھا کہ مجھے یک دم رک جانا پڑا۔ وہاں تقریباً بیس مرد دو قطاروں میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ فوراً رک گئے اور وہ مجھے تنکے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اندر قدم رکھتے ہی اپنا ڈریس اوپر نہیں اٹھا دیا تھا، ایسا کرنے کے لئے مجھے یہ جگہ خالی کرانا پڑتی۔ میں نے اپنی پارٹی کی طرف دیکھا تو انہوں نے مجھے ساتھ ہی بیٹھ جانے اور کھانے میں شریک ہو جانے کا اشارہ کر دیا۔

اس ملک میں آمد کے بعد یہ میرا پہلا صحیح معنوں میں کھانا تھا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ کھانا بے حد لذیذ تھا، خواہ یہاں مکھیوں کی بہتات تھی۔ بعد ازاں اپنے ملک میں آکر میں نے اپنے دوستوں کو اس کا ”Restaurant of a Thousand Flies“ کے نام سے حوالہ دیا۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک طرف تو مجھے ایک نیلی مکھی، میری توجہ اپنی طرف مرکوز کر کے سارے گھر میں دوڑائے پھرتی ہے مگر یہاں میں مکھیوں کی کثیر تعداد کے باوجود ملک جھپکائے بغیر اس سفارت کار، ڈرائیور اور دو مسلح محافظوں کے ساتھ خاموشی سے کھانا کھا رہی ہوں، پھر ہم دسترخوان سے اٹھ گئے اور مرد نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔

قضائے حاجت کی اب بھی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یہاں بنا ہوا قدیم طرز کا شاور اور واش روم یاد تھا جو حکومت لینڈ انے تعمیر کرایا تھا، کیوں بنوایا تھا، اس کا مجھے یقینی طور پر علم نہیں تاہم اس کے صاف ستھرے ہونے اور حفظانِ صحت کے اہتمام پر میں اس کی شکر گزار تھی۔ مگر ان بڑی تیزی سے میری طرف آیا اور جب اس نے مجھے زنا نہ بیت الخلاء کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا، تو اس کا دروازہ اندر سے مقفل ہو چکا تھا۔

اس کے ہاتھ میں چابی تھی اور اس نے مجھے بخوشی اپنے چمکتے ہوئے نئے نائلٹس استعمال کرنے کی دعوت دی، میں بھی اتنی ہی خوشی سے اندر چلی گئی۔ جب میں باہر نکلی تو اس نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔ ”انگلش جرنلسٹ؟“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا، میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اسے یہ بات محافظوں نے بتائی تھی یا کسی اور نے۔

آگے ہم اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑوں والے کاروانوں کے پاس سے گزرے۔ میں نے سوچا یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ یہ بے حد خوبصورت اور صحتمند اور توانا ہیں۔ کتنا متنوع ہے یہاں، مضبوط چہرے، لمبے بال، زمردی آنکھیں، گہری بادامی آنکھیں اور گہری بھوری آنکھیں۔

یہ ملک بعض جگہوں پر بالکل بنجر، اجاڑ اور سنسان ہے، خدا کی زمین کا آخری ٹکڑا دکھائی دیتا ہے۔ ارضی منظر اندک سا ہے، یہ اس وقت بھی ایسا ہی تھا جب مجھے کابل لے جانا جا رہا تھا۔ سارے راستے میں مجھے بمباری کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا۔

ہم جلال آباد میں سے گزرنے لگے تو لوگ ہماری گاڑی کے قریب آئے شور کرنے لگے ”انگلش جرنلسٹ، انگلش جرنلسٹ۔“ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھے ایک ہفتے سے کچھ زیادہ دن جب یہاں پر یڈ کرانی گئی تو میں اس وقت سے

خوش مزاج افسر کو دھتکار دیا

9.15 پر دفتر خارجہ کا وہ خوش مزاج افسر آیا اور اس نے دروازے پر دستک دینے کے بعد مجھے کہا کہ میں دروازے کھولوں۔ میں نے جواب دیا کہ ”مجھے تم پر کوئی اعتبار نہیں، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ تم سب جھوٹے ہو میں دوبارہ تمہاری چالوں میں آنے والی نہیں۔“ وہ زور دیتا رہا کہ کار آچکی ہے اور میں جاسکتی ہوں، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کے بعد دستک مزید زور سے دی جانے لگی چنانچہ میں نے دروازہ کھول دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جونہی چٹخنی نیچے پھسلے، لکڑی کا نیلا دروازہ چوٹ کھل گیا اور پانچ آدمی دندناتے ہوئے اندر آ گئے، انہوں نے اصرار کیا کہ میں جاؤں۔ پھر بتایا کہ مجھے بارڈر پر پہنچانے کے لئے کار تیار کھڑی ہے۔

کورنز جیل نے مجھے ایک خوبصورت موٹی مٹل کا ڈریس، مع ایک سرخ اور سنہرا برقع پیش کیا اور اصرار کیا کہ میں رواںگی سے پہلے پہلے یہ لباس پہن لوں اور اس نے بتایا کہ یہ افغانستان کا روایتی لباس ہے۔ میں اس کی جانب سے تحفہ ملنے پر بہت متاثر ہوئی۔ خاص طور پر اس لئے بھی میں اس آدمی کو بے حد رنج کرتی رہی تھی لیکن میں نے کہا کہ خدشہ ہے کہ بارڈر تک چھ گھنٹے کے سفر میں اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ وزارت خارجہ کے خوش مزاج شخص نے کہا ”مجھے آپ کے بارے میں بہت تشویش رہی اور میں کل رات کی بمباری کے بعد آپ کو پھر تسلی دینے کے آیا تھا، لیکن جب میں پہنچا تو آپ سوچکی تھیں۔“

میں نے جواب دیا، ”کون سی بمباری؟ اچھا، وہ والی، میں تو سمجھی تھی کہ یہ طالبان کی طرف سے کوئی الوداعی آتش بازی پارٹی ہے۔“ اس پر اس نے میری طرف دیکھا اور داد دینے کے انداز میں کہا..... ”رڈ لے، تم ایک مرد ہو، بہت بڑا گیم پلیئر ہو، اٹھو، اب رواںگی کا وقت آ پہنچا ہے۔“

میں پہلی بار پر جوش طریقے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اپنے برے رویے پر معذرت چاہی اور کورنز جیل کا ڈریس کے تحفے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ میں ایک بد شکل انسان رہی ہوں، لیکن اس بات کو ذاتی طور پر نہیں لیا جانا چاہیے۔ میں نے تاکید کی انداز میں کہا کہ تمام انگریز عورتیں اتنی اکھڑ نہیں ہوتیں، جتنی کہ میں رہی ہوں۔ اس نے میرے سر پے پر اوپر سے نیچے تک ایک نگاہ ڈالی اور اس کا پتھر کا سا چہرہ نرم پڑ گیا، ایک دلاویز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی گہری ہڈیاں آنکھیں چمک اٹھیں۔

اس کے بعد میں چل پڑی اور محو حیرت طالبان سپاہی مجھے نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے تھے کیونکہ ”مرد نما رڈ لے“ کو منتظر سپیس کروزر گاڑی میں باعزت طریقے سے بٹھا کر الوداع کہی جا رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا اور ہم وزارت خارجہ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں ایک ڈپلومیٹک افسر مجھے بارڈر تک چھوڑنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

”مستبسم قاتل“ میری طرف آیا، میں اس شخص کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور میں نے اپنے چہرے کو جذبات سے ناری رکھتے ہوئے اس کی وہ بات سنی جو وہ کہنے آیا تھا..... ”امید ہے کہ آپ انگلستان واپس جا کر ہمارے بارے میں غلط باتیں نہیں لکھیں گی، آپ کے ساتھ ناروا برتاؤ انتہائی جنس کے لوگوں نے کیا، وزارت خارجہ نے نہیں۔“ جو نبی اس نے مسکراتا بند کیا میں نے اسے نظر انداز کر دیا یہ میری ایک واضح اخلاقی فتح تھی۔

جو سفارت کار ہمارا شریک سفر بنا وہ اچھی طرح انگریزی نہیں بول سکتا تھا، ہم نے زیادہ تر سفر خاموشی ہی میں طے کیا۔ ہمیں اس کے گھر بھی جانا پڑا کیونکہ وہ اپنا پاسپورٹ بھول آیا تھا۔ اس ناگہانی صورت حال کی ذمہ داری ہماری ابلاغی مشکلات کے باوجود، ہم میں سے کسی ایک پر نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔

وہ شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں فلیٹوں کے ایک بلاک میں رہتا تھا جس میں ظاہر ہے کہ کابل کا امیر طبقہ رہتا تھا، وہاں چاروں طرف نصب ٹی وی سیٹلائٹ ایریلز میری نظر سے نہیں بچ سکتے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ یہاں کے حکمران طبقے نے اپنے بچوں، بشمول بیٹیوں کے، اچھی تعلیم دلوانے کا پکا انتظام کر رکھا ہے اور وہ پاکستان میں اعلیٰ درجے کے سکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔

دن کے وقت کابل میں سے گزرتے ہوئے مجھے ”کہانی دوشہروں کی“ یاد آئی۔ ایک کا ایک حصہ رات کی بمباری سے بری طرح برباد ہو چکا تھا جب کہ پچھلے برسوں کی جنگوں کی تباہ کاری کے اثرات بھی موجود تھے، اور دوسرا حصہ درختوں کی دور روئے قطاروں میں سے گزرتے ہوئے خیابان تھے جہاں سفارت خانے خالی پڑے تھے۔ ایک بلند عمارت پر چینی پرچم لہرا رہا تھا۔

میں رات کی بمباری سے تباہ شدہ عمارتوں میں سے نکلتا ہوا دھواں دیکھ رہی تھی مگر کہیں کہیں ابھی ابھی بمباری ہوئی تھی۔ اس سے طبیعت بہت مضطرب ہوئی۔ کابل پر بار بار بمباری ہوئی لیکن مقامی لوگوں کا رد عمل مانچسٹر کے کسی شخص

یہاں کی ایک معروف شخصیت بن گئی ہوں۔ سفارت کار نے ہنسنا شروع کر دیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلیں میں کہا.... ”آپ بہت مشہور ہو گئی ہیں، ہر کوئی آپ کا چہرہ آشنا بن گیا ہے۔“ طورخم کی طرف جاتے ہوئے ہم نے ایک ڈائن پک اپ ٹرک کو ”اوور ٹیک“ کیا، اس میں پیچھے بیٹھے ہوئے دو مسلح افراد اونگھ رہے تھے، ان کی باتیں پچھلے گیٹ کے اوپر سے ہو کر ان کی کلاشنکوفوں کے ساتھ بھینچی ہوئی نیچے لٹک رہی تھیں۔

اور وہ آخری دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد میں سے ایک کے ساتھ میری نظریں ٹکرائیں تو مجھے اس کی طرف ایک بار پھر دیکھنا پڑا۔ یہ دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ اس سے ڈر آنے لگتا ہے۔ اس کے عقب میں ایک سبز زمردی آنکھوں والا آدمی بیٹھا تھا، جس نے میرے ایڈونچر پر اچانک ضرب کاری لگا دی تھی، یعنی اس کے اڑیل گدھے کی وجہ سے میرے ساتھ ناقابل فراموش واقعہ پیش آ گیا تھا۔

اس نے بھی میری طرف بے یقینی کے ساتھ دیکھا اور پھر فوراً پہچان گیا، یہ ٹرک کئی دفعہ ہم سے آگے اور پیچھے ہوا، زمردی آنکھوں والے نے شور کرتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا، کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ مجھے لحو بھر کے لئے تو خوف ہوا کہ شاید وہ مجھے دوبارہ گرفتار کرنا چاہتا ہے اور میں پھر اس عذاب میں سے گزروں گی، مگر اس نے ہنسنا شروع کر دیا اور خوش ہوا کہ میں واپس گھر جا رہی ہوں۔

اگلے چند میل وہ ہمارے پیچھے پیچھے آتے رہے اور آنے جانے والوں کو شور کر کے ہماری گاڑی کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ یہ بہت حیرت انگیز لوگ ہیں، کسی سے دشمنی یا تعصب نہیں رکھتے پھر بھی چند گھنٹے قبل برطانیہ اور امریکا نے ان پر بمباری کر کے تباہی پھیل دی تھی۔

جب ہم بارڈر پر پہنچے تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ہم ایک بھاری ہسٹی ڈبل گیٹ کے سامنے بیٹھے تھے جو میری آزادی اور باہر کی دنیا کو ایک دوسری سے الگ کر رہا تھا۔

میں نے خاموشی سے دعا کی کہ گیٹ جلدی سے کھل جائے مگر مجھے 38 منٹ کے طویل وقفے کے لئے بیٹھے رہنا پڑا۔ چند گھنٹے پہلے بارڈر پر فساد برپا ہو گیا تھا جس میں تین افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ خدشہ تھا کہ افغانوں کو اگر پتہ چلا کہ مجھے امریکا اور برطانوی بمباری کے 24 گھنٹے سے بھی کم عرصے میں واپس بھیجا جا رہا ہے تو وہ مشتعل ہو جائیں گے۔

طالبان سپاہی بھی کچھ گھبرائے ہوئے تھے، وہ یکے بعد دیگرے آہستگی سے گاڑی میں سے اتر گئے اور کسی قریبی جگہ سے کچھ مک مک منگوالی مجھے شک پڑا کہ کیا یہ ایک اور دھوکہ تو نہیں، پھر مجھے بتایا گیا کہ مجھے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا کیونکہ برطانوی سفارت خانے سے مجھے کوئی لینے نہیں آیا۔ یہ سن کر میں بری طرح شپٹا گئی اور سوچنے لگی میرے ساتھ ایک اور نفسیاتی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

نوجوان سفارتکار جو اس دوران واپس آچکا تھا، اس نے میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر مجھے خود رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا، حالانکہ اسے حکومت کی طرف سے، مجھے برطانیہ کے حوالے کرنے کا حکم ملا ہوا تھا، میں اس کے لئے اس کی ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔ ڈبل گیٹ آہستہ آہستہ کھلا، کارپانچ فٹ آگے سرک آئی، پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا، آپ جاسکتی ہیں، اور میں سن ہو کر رہ گئی۔

جب میں نے قدم زمین پر رکھے اور ٹیلی ویژن کیمرے کی لامیٹ میرے چہرے پر پڑنے لگی، تو میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی، یعنی میں چند لمحوں کے لئے چندھیان گئی۔ ایک تیز آواز آئی.... ”طالبان نے آپ سے کیسا سلوک کیا؟“.... تو پچھلے دس دنوں کی تمام یادداشتوں اور نفسیاتی کھیلوں کی تصاویر میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ میں نے جواب دیا.... ”مجھ سے بے حد خوش خلقی اور احترام کا سلوک ہوا ہے۔“

میں پھوٹ پھوٹ کر رو دینا چاہتی تھی مگر میں نے سوچا کہ ممکن ہے میرے والدین اور ڈیزیزی بھی اس وقت ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں، میں نے اپنے خاندان، دوستوں اور ہم پیشہ لوگوں اور اپنے رفقاء کے بارے میں بھی سوچا کہ وہ سب مجھے دیکھ رہے ہیں، میں کسی کو اپنے بارے میں تشویش اور اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

میں خوشی سے ہوا میں مکے بھی چلانا چاہتی تھی مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ دو آدمی اور چھوٹی لڑکی، ابھی تک کابل میں جرمن چیریٹی شیلٹر انٹرنیشنل کے ایڈورکرز کے ساتھ بند تھے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن گیٹ پر ہونے والی ناروانا خیر کی وجہ سے اور برطانوی نمائندوں کے یہاں موجود نہ ہونے پر میں شدید غم و غصے میں تھی۔

یہاں ایک جم غفیر تھا، مجھے آہستگی سے ایک عمارت کے اندر لے جایا گیا اور چند میٹر حیاں اوپر لے جا کر ایک لمبے کمرے میں پہنچا دیا گیا جو اعلیٰ فوجی انسروں، سفارتکاروں اور صحافیوں سے بھر ہوا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کیا پینا چاہوں گی؟ میں نے جواباً یہ ہنا چاہنا ”لارج سکاچ“ لیلین مجھے یاد آ گیا کہ میں ایک مسلمان ملک سے نکل کر دوسرے مسلمان ملک میں آگئی ہوں، مجھ پر یہ سوچ اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔

کیمرہ لائنس پھر آن ہو چکی تھیں، مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مجھ پر ایک رپورٹر ہونے کا احساس طاری ہو گیا اور میرے اندر یہ شعور احساس بیدار ہو گیا کہ میرے پاس تو ایک اپنی مخصوص، اور بلا شرکت غیرے خبر (Exclusive) موجود ہے جو میرا اپنا اخبار ”ایکسپریس نیوز“ ہی چھاپنا پسند کرے گا۔

میں ڈپٹی چیف آف پروٹوکول پشاور کی طرف مڑی اور اس سے کہا کہ کیا وہ پاکستانی ٹی وی کے عملہ سے کہہ سکتا ہے کہ وہ تصویریں لینا بند کر دے کیونکہ میں بہت تھکی ہوئی ہوں اور کسی سے گفتگو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ تصویریں لینا بند کر دی گئیں، میں نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ پاکستانی رپورٹروں نے جو میری دائیں جانب بیٹھے تھے، میری خواہش کا احترام کیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چائے اور بسکٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ شائستگی اور تہذیب کی ایک برطانوی صورت ہے اور میں یہاں واحد انگریز تھی۔ طالبان سفارت کار میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ پاکستانی رپورٹروں نے جو میرے دائیں جانب بیٹھے تھے، میری خواہش کا احترام کیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چائے اور بسکٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ شائستگی اور تہذیب کی ایک برطانوی صورت ہے اور میں یہاں واحد انگریز تھی۔ طالبان سفارت کار میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تشویش دور ہو گئی تھی، میں نے اس کے لوگوں کے بارے میں کوئی بری بات نہیں کہی جیسا کہ میں اپنی قید کے دوران مسلسل دھمکیاں دیتی رہتی تھی کہ میں یہ کروں گی وہ کردوں گی۔ اب وہ اطمینان سے کابل جاسکتا تھا کہ اسے وہاں نہ کوئی ماری جائے گی اور نہ پتھر مارے جائیں گے۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ، طالبان اپنی شہرت کے برعکس مجھ سے نہایت اخلاق اور احترام سے پیش آئے۔ بربریت کرنے کی زبردست صلاحیت رکھنے والوں نے مجھ سے بے حد شرافت اور وضع داری کا سلوک کیا بلکہ اس سے کہیں زیادہ اچھا برتاؤ کیا جو نام نہاد ساتھی صحافیوں کی طرف سے میرے ساتھ عنقریب روا رکھا جانا تھا، اور جو بعض اوقات وحشیانہ رویے کا مظہر بننے والا تھا۔

مجھے درہ خیبر سے پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر تک مسلح محافظوں کی نگرانی میں لے جایا گیا، راستے میں اس کے ڈپٹی شہر اوضیاء الدین علی نے مجھ سے پوچھا ”کیا آپ کو یاد ہے کہ چند ہفتے پہلے آپ کو درہ خیبر تک پہنچنے میں، میں نے

آپ کی مدد کی تھی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ آپ یہ کچھ کرنے جا رہی ہیں تو آپ کو افغانستان میں داخل ہونے میں، میں خود مدد دیتا، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے ساتھ کیمبرہ ہرگز نہ لے جانا۔“ اس پر وہ خود ہی چپکے سے ہنس دیا۔

جب ہم دفتر میں جا کر ر کے تو وہاں چند رپورٹر اور فوٹو گرافر گیٹ پر کھڑے تھے، انہوں نے ہماری گاڑی پر دوسری نظر نہیں ڈالی، اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک پر شکوہ اور ساکوان کی لکڑی کے پینلوں اور فرنیچر سے مزین آفس میں پہنچا دیا گیا جہاں فدا محمد وزیر ”شرانگیز مس رڈ لے“ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی کرسی کے پیچھے بورڈ پر درہ خیبر کے ان پولیٹیکل ایجنٹوں کے نام لکھے تھے جو انیسویں صدی سے اب تک اس عہدے پر مامور رہے اور آخر میں مسٹر وزیر کا نام تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا اور اس نے بتایا کہ اس کا تقرر، میری گرفتاری سے چند ہفتے قبل ہوا تھا۔

وہ ذرا آگے جھکا اور مجھ سے پوچھا کہ ”آپ کو اندر کون لے گیا اور پکڑے جانے سے قبل آپ کو افغانستان میں کون گھومتا رہا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، آپ کا احترام بجا لیکن اگر میں نے دس دن زیر حراست رہ کر بھی طالبان کو یہ بات نہیں بتائی تو اس کا کوئی امکان نہیں کہ میں آپ کو بتا سکوں۔ اس نے سر ہلا دیا اس سے مجھے اس کے خوش یا ناخوش ہونے کا کوئی اندازہ نہ ہوسکا۔

پھر میں نے پوچھا کہ میری گرفتاری کے بعد افغانستان میں آپ کے کچھ لوگوں کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ آپ کو موصول ہوئی تھی، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دراصل مجھے اپنے دو گائیڈوں اور چھوٹی لڑکی کا کچھ کرنا تھا لیکن میں اس سلسلے میں اسے اعتماد میں نہیں لے سکتی تھی، ورنہ میرے وہ ساتھی اپنی رہائی کے بعد اس سے بھی زیادہ مشکل میں پھنس سکتے تھے۔

میں نے اسے مزید کہا ”شہزادہ کہتا ہے کہ مجھے صدر شرف کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ میرے خیال میں انہوں نے میری رہائی میں مدد کی ہے۔“ اس نے سر ہلایا اور کہا صدر شرف نے طالبان پر ”بے پناہ“ دباؤ ڈالا تھا۔ میں نے اسے کہا تو پھر میری طرف سے انہیں بے حد شکریے کا پیغام پہنچا دیجئے۔

عین اسی لمحے ”ڈیلی ایکسپریس“ کے ڈیوڈ سمیتھ نے دروازے پر دستک دی اور اپنا سراندر کر کے ادھر ادھر دیکھا، جب اس کی نظر مجھ سے ٹکرائی تو وہ ہنگامہ مچا رہ گیا۔ میں ایک دم اپنے حلیے کے بارے میں پریشان ہو گئی کیونکہ میرا میک اپ بالکل نہیں تھا، میرا سر اب تک سکارف میں مقید تھا، بال بے ترتیبی کی حالت میں تھے اور میں نے جو شلواری میض پہن رکھی تھی وہ گر دوغبار اور پسینے کی وجہ سے بے حد خراب ہو چکی تھی۔ میں نے خود سے پوچھا کیا میں واقعی اتنی ہی بھدی ہو گئی ہوں؟

تاہم ڈیوڈ کے فوری رد عمل کے بعد اس کے تحریر کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی سفارت خانے کے ایک انس نے دو منٹ پہلے اسے بتایا تھا کہ میری رہائی کی خبر قبل از وقت ہے، ڈیوڈ نے سفارت خانے کے انس کی آواز کی تقابلی کرتے ہوئے ”پریشان نہ ہوئے بارڈر پر ہمارے آدمی موجود ہیں، جونہی وہ رہا ہوگی سب سے پہلے تمہیں ہی مطلع کیا جائے گا۔“

اس نے مجھے زور سے اپنے سینے سے لگایا اور پھر ”ایکسپریس“ کے مقرر کردہ ایجنسی فوٹو گرافر نے جلدی سے اس کی بھی تصویر بنالی۔ پھر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ ایڈیٹر ”ڈیلی ایکسپریس“ کرس ولیمز لائن پر تھا اور اس نے پر جوش انداز میں کہا.... ”واپسی مبارک ہو، جب ہمیں خبر پہنچی تو نیوز روم تالیوں سے کونج اٹھا، ہر کوئی اتنا خوش ہے جیسے اسے زندگی میں پہلی بار خوشخبری ملی ہو، تو سناؤ کیسی ہو؟“

شاندار مصافحت

میرے اندر بھی جذبات لدا آئے، میں نے اسے کہا کہ تم سے بات کر کے میں خوشی سے پھولے نہیں سارہی اور ”سٹیمر“ کے ہوٹل میں شاندار مصافحت کھانے کے لئے تو مری جا رہی ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں ڈیوڈ کو ایک چیختی چنگھاڑتی ہوئی خبر دے رہی ہوں۔ میں اپنے آپ کو یہاں کے میڈیا کوئٹریس کانفرنس“ دینے کی بھی پابند سمجھ رہی تھی۔ میں نے ڈیوڈ کو اپنی سنٹوری ”ریلے“ کر دی اور میں جانتی تھی کہ بطور رپورٹر مجھے اسے کون کون سے نکات دینے ہیں۔ میں چائے کی ایک پیالی پینے پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس بیٹھ گئی، اس نے مجھے کسی بونے سے لائی ہوئی کھانے کی اشیاء پیش کر دیں، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ کچھ اور لوگوں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں، اس نے بتایا کہ اس کا تاثر یہی تھا کہ میرے ہمراہ برٹش ہائی کمیشن کے کئی انس رہا ہوں گے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مجھے اس سے بے حد صدمہ پہنچا اور میں سوچنے لگی: میرے خدا کیا کوئی اتنی بری بات ہو گئی ہے کہ انہیں مجھ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ شہزادہ نے مجھے کہا کہ پریشان نہ ہو، میں نے اپنے گھر میں ایک بہت بڑی استقبالیہ دعوت کا انتظام کر رکھا ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بارڈر پر برٹش ہائی کمیشن کے کسی انس کی مجھ سے ملاقات نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ میری آمد کی بہت پہلے توقع کئے ہوئے تھے اور جب مجھے آزاد کر دیا گیا تو اتنا اندھیرا چھا چکا تھا کہ رائل نیوی کے ہیلی کاپٹروں کے لئے پرواز ناممکن ہو گئی تھی۔

میں نے ڈیوڈ سے اپنے خاندان کے بارے میں پوچھا، کیونکہ میرا تاثر یہ تھا کہ میری ماں اسلام آباد میں کہیں آچکی ہے۔ تمام پاکستانی حکام اس کا بڑے اشتیاق سے ذکر کرتے تھے جیسے وہ اس سے ذاتی طور پر گفتگو کر چکے ہوں۔ مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ وہ راتوں رات ایک عظیم برطانوی ”ادارہ“ بن گئی ہے۔ مجھے گارڈن گیٹ میں آنے والے دنوں میں اس کی میڈیا سے متعلقہ حیرت انگیز کارکردگی کے بارے میں معلومات حاصل ہونے والی تھیں۔

پھر ڈیوڈ نے مجھے کونے میں ایک خاموش بیٹھے نوجوان سے متعارف کرایا جس کا نام اکبر شنواری تھا، وہ دن رات ڈیوڈ کے ساتھ کام کرتا اور اس کے لئے کاروں کی فراہمی کا انتظام کرتا تھا۔ میری متوقع رہائی کی صورت میں سیکورٹی کے امور بھی اسی کے ہاتھ میں دیدیے گئے تھے۔ اکبر نے باہر نکل کر میرے لئے برقع بھی خریدا تھا جسے ہمارے ایک فوٹو گرافر نے پریس کو اس وقت دھوکہ دے کر دور رکھنے کے لئے استعمال کیا تھا جب ہم پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر سے نکل آئے تھے۔ یہ توجہ بنانے کا ایک اچھا حربہ تھا لیکن اس سے صرف چند ایک افراد ہی کو یہ تاثر دیا جاسکتا تھا کہ کار کی عقبی نشست پر بیٹھی برقع پوش عورت میں تھی۔

”کون مکا ہی“ ایک ریج روور“ میں آیا اور ہم اسی پر سوار ہو کر اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ مجھے اس کی کچھ باتیں ناگوار گزری تھیں مگر وہ بڑا دلچسپ اور ہر دلچیز آدمی تھا۔ اسی بنا پر وہ ایک سفارتکار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ دارالحکومت کی جانب سفر کے دوران اس نے کہا کہ ”مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ اندر سے کافی ضدی انسان ہیں، کیا آپ پہلے بھی کسی غیر ملکی جیل میں رہ چکی ہیں؟ ایسے کئی کورسز جاری ہو چکے ہیں جو یہ سکھاتے ہیں کہ گرفتاری کے دوران انسان کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔“

میں نے جواب دیا کہ اس سے پہلے میں کبھی جیل نہیں گئی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھا ہے۔ دو مفتوں میں مجھ سے یہ سوال دوسری مرتبہ پوچھا گیا تھا۔

میں نے اسے بتایا ”اگر مجھے عراق یا ایران میں حوالات بھیج دیا گیا ہوتا تو میں گھنٹوں پر جھک کر ان سے رحم کی خواستگار ہوتی مگر یہ لوگ بہت مختلف تھے۔ میں نے طالبان کو خود سے اتنا دور بنانے کی کوشش کی جتنا کہ میں کر سکتی تھی کیونکہ میں چاہتی تھی کہ وہ یہ سوچنے کی ضرورت محسوس کریں کہ وہ اپنی عورتوں سے جن چیزوں کی توقع کرتے ہیں، میں اس سے بالکل برعکس ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے طرز عمل سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی وہ مجھے حاصل ہو گیا ہے اور آج میں یہاں ہوں۔ توقع ہے کہ مجھے اسلام آباد ہی میں رہنے دیا جائے گا اور میں ان خطوط پر اپنا کام جاری رکھ سکوں گی۔“

اس نے کہا کہ میرے یہاں قیام کا کوئی جواز نہیں، میں ایک سیکورٹی رسک بن چکی ہوں کیونکہ میں فوری طور پر قابل شناخت ہو گئی ہوں۔ مجھ پر یہ بات اس وقت واضح ہونا شروع ہوئی تھی جب میں اپنی گرفتاری اور قید کی وجہ سے میڈیا کے لئے ایک ہجان خیز مسئلہ بن گئی تھی۔ عین اسی لمحے اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اس نے موبائل مجھے پکڑا دیا۔ پال ڈشور ڈالائن پر تھا۔ میں نے ڈانٹ پھٹکار سننے کے لئے خود کو تیار کر لیا۔ وہ تھکا ماندہ خستہ حال اور جذباتی طور پر خوش بھی سنائی دے رہا تھا۔ میں نے اس سے اتنا پریشان کن مسئلہ بنی رہنے پر معافی مانگی اور پھر اخبار کی سرکولیشن پر اس نے پڑنے والے اثر کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا ”یو آنے یہ وقت اخبار کی مقبولیت کے بارے میں سوچنے کا نہیں، ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم کیسی ہو، تم نہیں جانتی ہو کہ تم نے ہمیں کہاں جا پھنسا یا ہے لیکن ہم اس بات پر بے حد خوش ہیں کہ تم صحیح سلامت واپس آ گئی ہو۔“

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے جذبات کی گرمی موبائل فون میں سے کس طرح لڑھکتی ہوئی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ ڈشور ڈالائن لحاظ سے ایک ٹھنڈی مچھلی ہے۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ یہ ایک لمبا پتلا اور بارش انسان ہے جب دفتر کے ارد گرد پھر رہا ہوتا ہے تو سب سے الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے۔ یہ چیئر مین رچرڈ ڈسمنڈ کے انتہائی معتمد اور درست راست لوگوں میں سے ہے، اس لئے عملہ کے بعض ارکان اس سے بہت محتاط رہتے ہیں۔ گھڑی رات کے 11 بجے کو چھوڑی تھی، چنانچہ ہم نے صبح ہائی کمشین میں اکٹھے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جب صبح ہم وہاں پہنچے تو تصاویر بنانے والوں نے گاڑی کے کپاؤنڈ کی طرف جاتے ہی ہماری تصاویر بنانا شروع کر دیں، جہاں برطانوی سفیر، ہلیری سائٹ اپنی بیوی ”اینی“ سمیت میرے منتظر بیٹھے تھے۔ پر جوش ملاقات کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کھاؤ گی میں نے کہا۔ ”ایک لارج سکاچ اور ایک بلیک سینڈوچ“ پھر جلدی سے بولی ”ٹھیک ہے، چھوڑیے، میں سینڈوچ کے بارے میں تو مذاق کر رہی تھی، مجھے تو گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔“

تاہم ”اینی“ جو کہ ایک مستعد میزبان ہے، پھرتی سے لنڈین بلیک سینڈوچ بنالائی اس اثنا میں، میں اپنی ماں کے گھر میں فون ملانے میں کامیاب ہو گئی، مگر وہاں سے کوئی مرد بول رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا ”کون ہو تم؟“ وہ تو نیوکیسل میں مقیم ”ایکسپریس“ کا صحافی مارک ہلیکواک نکلا۔ اس نے میری ماں کے گھر میں ”بے بی سنگ“ کی حباب کر لی تھی تاکہ اس امر کی ضمانت حاصل کر لی جائے کہ میری ماں ہمارے حیرت انگیز اداروں کے ہتھے نہ

میں نے اپنی ماں کو کال کرنے کی کوشش کی مگر اس کا فون مصروف تھا۔ غالباً وہ ”ویو“ سے باتیں کر رہی تھی کیونکہ ڈیوڈ سمجھنے سے بتا دیا تھا کہ میں واپس آ چکی ہوں اور اسے بعد میں کال کروں گی۔ ”ایچر سیز فرینز“ کے فونو گرافری نے ٹراٹر نے بیٹا تصاویر بنائیں تھیں اور پھر ڈیوڈ اور میں بھاگ کر ایک منتظر کار میں بیٹھ گئے۔ میں عقبی نشست پر ”ایچر“ کے ایک اور فونو گرافر ”ارال سیڈاٹ“ کے ساتھ بیٹھ گئی اور ہم شہزادہ کی کار کے پیچھے لگ گئے لیکن جونہی ہم اس کے دفتر پہنچے اور کار کے اندر ہی تھے کہ تقریباً پچاس فونو گرافروں، رپورٹروں اور کیمرہ مینوں نے ہمارا چانک گھیراؤ کر لیا، ڈیوڈ نے شور کرتے ہوئے مجھے کہا ”سر جھکا لو، چہرہ چھپا لو اور بولنا بالکل نہیں۔“ مجھے سخت ہچکا لگا اور اچانک ایک بازگشت کا احساس ہوا، کیونکہ یہی الفاظ اور جملے تھے جو طالبان کے ملک میں داخل ہونے کے بعد مجھے سننا پڑے تھے۔

افنگوں کے نرغے میں

کار کئی مرتبہ کپکپائی اور ہلکے بولنے والوں میں سے ایک نے اچانک ڈرائیور کا دروازہ کھولا اور انکیشن میں سے چابیاں نکالنے کی کوشش کی تاکہ گاڑی کو ساکن کر دیا جائے۔ ڈرائیور پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا، اگر وہ مستند شخص ہوتا وہ ان حرامزدوں کے بیچ میں سے گاڑی نکال لیتا اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ جاتے، اس کا یہاں گاڑی روکنا بہت بڑی غلطی تھا۔

اتنے میں کسی نے میرا دروازہ کھول کر مجھے باہر گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن ”ارال سیڈاٹ“ نے مجھے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا۔ جب دوبارہ دروازہ کھولنے کی کوشش ہوئی تو ڈیوڈ نے شور کیا ”لوکو، دیکھو اس بے چاری کو اطمینان کا سانس لینے دو، ابھی دس دن جیل میں کاٹ کر آئی ہے، ہمیں کوئی پتہ نہیں کہ یہ کس حال میں ہے۔ اس ہڑبونگ کو یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔

”انسانی ہمدردی“ ڈکشنری میں پایا جانے والا ایک عام لفظ جس سے کہ ہر ایریغیر واقف ہے اس رات پشاور میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔ ایک فونو گرافر بھونکا۔ ”باہر نکالو اس کٹیا کو، اسے سارا منصوبہ معلوم ہے۔“ کسی اور نے کہا ”یہ ایک فاحشہ ہے جس نے صحافی کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ اسے باہر نکالو“ اس کے بعد اور کئی لچر نعرے میرے خلاف لگائے گئے جن کا ذکر مناسب نہیں۔

میں نعروں کا موازنہ جلال آباد کے واقعے سے کرتی ہوں، مجھے امریکی جاسوس قرار دے کر جلال آباد میں چکر لگوائے گئے، کسی افغان یا گروہ طالبان نے اس طرح کے نعرے نہیں لگائے اگرچہ انہوں نے اپنے غصے کا اظہار ہوائی فائرنگ کے ذریعے بھی کیا تھا مگر اس مجمعے کا موڈ ان سے کئی گنا بدتر تھا۔ میری سماعت سے جو الفاظ تکرار ہوئے تھے مجھے ان پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ طالبان کے ”اذیت رسالوں“ نے بھی ایسا لب و لہجہ اختیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے میرا احترام کیا تھا مگر یہ لوگ..... تو احترام سے بالکل ہی نا آشنا تھے، میں بری طرح الجھ گئی تھی۔

آخر شہزادہ کار سے چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور مکے، لاتیں رسید کر کے سب کو بھگا دیا، جب میں اس کے دفتر میں پہنچی تو میں سخت مڈ حال اور بد حال تھی۔ ڈیوڈ نے پوچھا، کیا طبیعت پر بہت گرانی ہے، میں نے کہا کہ میں بالکل ہی چکرا گئی ہوں۔ اس نے پھر تیسری بار کوشش کر کے اسلام آباد میں ”ہمارے آدمی“ کو جگایا اور اس نے بالآخر ہائی کمیشن کے ڈپلومیٹ (Colin Mulchahy) سے رابطہ قائم کیا اور اسے اب پتہ چلا کہ ”نیوآ“ نے رڈ لے شہر میں واپس آ چکی ہے اور ایکسپریس نیوز پیپر کے ہاتھ میں ہے۔“ اس نے کہا اچھا میں اسے برٹش ہائی کمیشن میں لانے کے لئے پہنچ رہا ہوں۔

پھر ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ ”ایکسپریس نیوز پیپر“ کا ایڈیٹر ریل ڈائریکٹر پال لشفورڈ اور اردو پیکنگ لائبریری صالہ حسین الدین جو کمپنی کے لیگل ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی ہے، وہ بھی اسلام آباد میں ہیں۔ یہ سن کر میرا تو سر چکرا گیا، ”کیا کہا لشفورڈ؟ لشفورڈ یہاں کیسے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ اوہ میرے خدا! طالبان نے مجھے بتایا تھا کہ ایک ”ہائی ڈائریکٹر“ نے ان کے سفارت خانے سے بات کی ہے لیکن میں سمجھی تھی کہ یہ یقیناً ٹیلی فون پر بات کی گئی ہوگی۔“ ڈیوڈ نے بتایا کہ جونہی میں پکڑی گئی اسے کوئٹہ سے اسلام آباد بھیجا گیا تاکہ پال لشفورڈ کے پہنچنے تک بطور پورٹر، ڈپلومیٹ اور فکسر (ر کے ہوئے کام بذریعہ اثر و رسوخ نکلوانے والا) فرائض انجام دیتا رہے۔ اس کے بعد نسبتاً بہتر خبریں آنے لگیں۔

صالہ حسین الدین اس کے ہمراہ اس لئے آئی تھی کہ ثقافتی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونے والی الجھنیں دور کرنے میں مدد دے۔ رچرڈ ڈیسمنڈ نے نومبر 2000ء میں فرائض سنبھالے تو اس کے بعد صالہ اور میں دوست بن گئیں۔ لیگل ڈیپارٹمنٹ میرے ڈیسک کے قریب واقع دفاتر میں منتقل ہو گیا تھا اور پال لشفورڈ نے اپنا دفتر اس کے بالکل سامنے قائم کر لیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے لئے چائے اور کافی بنایا کرتے تھے۔

چڑھ جائے۔ یہ ایک عجیب ضمانت سوچی گئی تھی۔

بالآخر ماں سے میری بات ہو گئی وہ بے حد خوش تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے صبح بات کروں گی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ڈیڑی سے بات ہوئی ہے اور ڈیڑی خبر سن کر خوشی سے شیخ پڑی اور فون فوراً بند کر کے تمام دوستوں کو بتانے کے لئے دوڑ گئی تھی۔

سفیر ہیلری بہت نفیس مزیدار تھا، اس نے مجھے وہ کچھ بتایا جس سے میں نا آشنا تھی۔ پھر اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم جیل کے اندر ”انتہائی اکھڑ انسان“ رہی ہو، اسے یہ بات طالبان کے سفیر ملا طعیف نے بتائی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ طعیف نے اسے یہ کہا تھا کہ برٹش ہائی کمیشن کو اپنا کوئی نمائندہ مجھے لینے کے لئے بارڈر پر بھیجنا چاہیے کیونکہ میں بقول ان کے ”یہ ہمارے بارے میں بہت گندی گندی باتیں کرتی ہے آپ اس کا منہ بند کروائیں۔“ مجھے اس تصور پر بہت ہنسی آئی دنیا کی خوفناک ترین حکومت محض میری اس دھمکی سے پریشان ہو گئی تھی کہ میں انہیں بے نقاب کر کے چھوڑوں گی۔ اس سے وہ بھی محفوظ ہوا اور بولا ”میں نے انہیں بتا دیا کہ ہم برٹش پریس کے ارکان کی زبان بندی نہیں کر سکتے ان پر میرا کوئی زور نہیں چلتا۔“ میرا خیال تھا کہ ہیلری کو اپنا آخری جملہ اس وقت تک ادا نہیں کرنا چاہیے تھا جب تک میں بحفاظت باہر نہ آچکی ہوتی۔

میں اپنی ہولڈال لے کر اوپر کی منزل پر چلی گئی، ڈیوڈ نے اسے کروائن پلازا میں میرا کمرہ خالی کرتے ہوئے پیک کیا تھا، پتہ نہیں مرد لوگ بیگ پیک کرتے ہوئے نا امل کیوں ثابت ہوتے ہیں؟ جب میں نے اسے کھول کر چھان بین کی تو اس میں سے کئی چیزیں نہیں تھیں، ان میں سے سب سے زیادہ قابل ذکر میری ”اشتعال انگیز خوشبو“ تھی جس کا نام ہی ”Provocateur perfume agent“ تھا اور یہ گرینیڈ کی شکل کی گلابی رنگ کی بوتل میں تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پر کون ہاتھ صاف کر گیا تھا۔ لیکن میں حیران تھی کہ ”اس“ سے کسی کو کیا فائدہ ہونا تھا۔ مجھ پر جاسوس کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس لئے یقیناً کوئی میرے کمرے میں داخل ہوا ہوگا اور اسے بطور گواہی یہی بوتل ملی ہوگی۔

پھر میں ”شاہور“ لینے چلی گئی اور ٹب میں خوب غوطہ لگایا جو بے حد فرحت بخش تھا۔ یہ حقیقی شاہور تھا، کوئی جستی بالٹی کا ٹھنڈا پانی نہیں تھا۔ مسرت ہی مسرت تھی۔ ہر چیز صاف ستھری تھی اور خوشبوئیں مشام جان کو معطر کر رہی تھیں۔ جسم کا رواں رواں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی نانیٹی بھی نہ ملی تھی چنانچہ میں نے اپنی ”اسامہ بن لادن ٹی شرٹ“ پہن لی اور نفیس کاشن شیمس اوڑھ کر لیٹ گئی، جیسے جنت میں داخل ہو گئی ہوں۔

اگلی صبح میں سات بجے کے قریب اٹھ بیٹھی اور برٹش ہائی کمیشن کے خوبصورت گراؤنڈز میں چہل قدمی کرنے لگی۔ کئی لان تھے، ان میں سے ایک لان میں نہایت پیاری سی آبشار تھی، مکان کی ایک جانب نسبتاً ایک زیادہ پرائیویٹ گارڈن تھا لیکن یہ فن تعمیر کے نقطہ نگاہ سے لطف انگیز نہیں تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

(C)۔ www.UrduPoint.com

اور جیل میں! کیوں کیسا ہے؟

یہ درست ہے کہ میں نینسی کیسل کو کوئی ایسی بات نہیں بتانا چاہتی تھی جو اسے پہلے سے معلوم نہ ہو لیکن میرے الفاظ سے اسے کافی اطمینان حاصل ہو، مجھے خود بھی یہ بہتر محسوس ہوا بعد میں میں نے یہ بات اپنی کو بتائی اور اس کے دانشمندانہ الفاظ پر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اس دوران فوٹو گرافری ٹرائز آگیا، اس نے میری انکلیڈنڈ فالٹ بال شرٹ پہنے ہوئے تصویریں اتاریں، سر دست میں یہی پہن سکتی تھی، میں نے یہ اس وقت خریدی تھی جب ہم نے البانیہ کی ٹیم کو شکست دیدی تھی۔ یہ مقابلے سینٹ جیمز پارک میں منعقد ہوئے تھے بعد میں وہ ایک بار پھر آیا اور کہا کہ ”لندن“ بالفاظ دیگر ”دی ڈیلی میکسپریس“ نے کہا ہے کہ میں کسی پھولدار پہناوے میں تصاویر بنوا کر بھیجوں۔

میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، ”میرے پاس یہاں کوئی پھولدار چیز نہیں، میں کوئی پھولداری نہیں کر سکتی، میں کسی کے لئے پھولدار بلاؤز میں نہیں سج سکتی۔“ پھر میں نے کہا میرے پاس قسم قسم کے کپڑے کہاں سے آسکتے ہیں، اگر تم سچ مچ یہی چاہتے ہو تو اپنی ٹی شرٹ اتار دو، میں اسے پہن کر تصویر بنوا لیتی ہوں۔ چنانچہ اس نے اتار دی اور میں نے پہن کر تصویر بنوائی مگر میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کبھی یہ تصویر چھپی ہوئی دیکھی گئی ہو۔

ایک روز میں ملکہ وکٹوریہ کے ایک پرانے مجسمے کے سامنے کھڑی تھی جو چند سال پہلے کسی سابق سفیر نے پاکستان کے کسی گاؤں سے برآمد کر لیا تھا، یہ بالکل صحیح حالت میں لگتا تھا تا وقتیکہ آپ اس کے نچلے حصے کی طرف نہ دیکھیں، اس بے چاری وکٹوریہ کے ہاتھ نہیں تھے۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے سفارت خانے کے ایک انسر نے کہا۔ ”جی ہاں یہ ایک محفوظ راز ہے کہ یہ دکانوں میں سے چیزیں چوری کر لیا کرتی تھی، میرے خیال میں یہ طالبان کے ہاتھوں سب سے پہلے سزا پانے والوں میں سے ہے۔“

سفارت خانے کے عملہ نے بتایا کہ وہ مجھے براستہ دوئی لندن جانے والی پرواز کے ذریعے بھیج سکتے ہیں، چنانچہ ہم نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں پڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ میں کہیں باہر تو جا ہی نہیں سکتی تھی۔ میں اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ اس بلاک کا کوئی بھی خطی مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔

جب ہم امارات کے طیارے میں سوار ہو گئے تو پال، صالحہ اور میں اتنے تھک چکے تھے ہم اس کے ٹیک آف سے پہلے ہی سو گئے۔ میں تو جسمانی طور پر ٹوٹی ہوئی تھی اور وہ دونوں جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ سے عاجز آ چکے تھے۔

صالحہ اور میں نے دوئی ایئر پورٹ کی دکانوں میں سے شاپنگ کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہوا تھا، وہ غارت ہو چکا تھا، کیونکہ یہ طیارہ واقعی لیٹ ہو گیا تھا اور ہماری متصل پرواز کو ہمارے پہنچنے تک روک رکھا گیا ہوا تھا۔ اس پرواز پر بیٹھے ہی ہم نے چہکننا شروع کر دیا، اور پال نے تفصیلاً بتایا کہ مجھے رہائی دلانے کے لئے اسے اور صالحہ کو کیا کچھ کرنا پڑا ہے۔

حقیقی جرنلسٹ ہونے کا ثبوت

انہوں نے بیشتر خبروں کے تراشے، تنخواہ کی سلیپیں اور میرے سابق آجروں کی طرف سے خطوط وغیرہ اکٹھے کئے تھے اور ان شواہد کے ذریعے ثابت کیا تھا کہ میں 25 سال سے بطور جرنلسٹ کام کر رہی ہوں، پھر انہوں نے ان سب شواہد کا پشتو میں ترجمہ کر لیا اور پال نے اسلام آباد میں طالبان کے نائب سفیر سے ایک ملاقات کا انتظام کیا۔ ان کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور وہ یقیناً اس سے متاثر ہوئے ہوں گے، کیونکہ طالبان نے دوران تفتیش اس کا ذکر کیا تھا۔ پال نے بتایا کہ طالبان نے کہا تھا کہ اگر میں نے اپنی زبان کو لگام نہ دی اور مناسب رویہ اختیار نہ کیا تو مجھے جیل سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ ”ہم تمہاری رہائی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے مگر تمہارے سخت رویے نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا تھا، میں خود کا بل پہنچ کر تم سے کہنا چاہتا تھا کہ تم اپنا منہ بند رکھو۔“ لیکن اس نے اعتراف کیا کہ بدترین مرحلہ بمباری کی پہلی رات تھی اور اس کا خیال تھا کہ میری رہائی کا معاہدہ اب ٹوٹ کر رہے گا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ کہ طالبان کے بارے میں تمہارے کیا رائے ہیں، میں نے کہا ”یہ بہت مشکل ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ وحشی اور جنگلی ہیں، اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے شفقت اور احترام کا سلوک کیا، ہمارے لوگ شاید یہ سننا کو ارا نہ کریں، مگر مجھے اس معاملے میں سچ بولنا ہے۔“ اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”لوگ واقعی اس بات کو پسند نہیں کریں گے، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ بڑے شریف اور باوقار لوگ ہیں، انہوں نے وعدہ کیا کہ تمہیں رہا کر دیا جائے گا اور اپنے الفاظ پر قائم رہے، اس کی اپنے قسم کی ایک ایمانداری ہے۔ رچرڈ (ڈیسمنڈ) نے مجھے تمہاری رہائی کے لئے ایک سادہ چیک دیدیا تھا لیکن مجھے شروع سے ہی معلوم تھا انہیں رقم کی پیشکش کی گئی تو وہ برائے فروخت ہو جائیں گے۔“ پھر اس نے انکشاف کیا کہ پیرس میچ“ نے اپنے ایک رپورٹر مائیکل پیرارڈ کی رہائی کے لئے، جو کہ جلال آباد میں برقع پہنے پکڑا گیا تھا، ان کے دفتر سے رابطہ

سفیر کے ہاں دو کتے تھے اور آپ پہلے سے جانتے ہیں کہ میں کتوں سے بہت نفرت کرتی ہوں۔ ان میں سے ایک کتا، بلی کوڈرانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سیمنٹ کی جالیوں کے قریب، اس سے محفوظ فاصلے پر بچاؤ کی پوزیشن لیے اسے گھور رہی تھی۔ میں اس سے کافی فاصلے سے ہو کر گزرنے لگی لیکن اس مکروہ مخلوق نے مجھے بلی کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ چیز پا کر میرا تعاقب شروع کر دیا اور مجھے گارڈن کی سیڑھیوں تک پہنچا کر دم لیا۔

سفیر کی اہلیہ نے ”اینی“ ہنسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے ناشتے کی میز پر بیٹھنے کی دعوت دی، جہاں اوپر سے گارڈن دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دن کے آغاز کا انتہائی مہذب طریقہ ہے، اتنے میں ڈیوڈ سمیت بھی آمو جو وہاں میرے جیل کے تجربے کے ”حصہ دوم“ پر کام کر رہا تھا۔

سیکرٹ ڈائری

میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ میں نے اپنی ایک سیکرٹ ڈائری رکھی ہوئی تھی، ڈیوڈ نے مجھ سے وہ مانگی مگر میں نے اسے واضح طور پر بتا دیا کہ میں نے اس پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ صرف ”سندے ایکسپریس“ کے لئے ہے۔ میں نے اس سے پرفیوم کی بوتل کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کرنے کے تھوڑی دیر بعد کہا ”تمہارے کمرے میں داخل ہونا، ایک بیہوش ناک بات تھی، کیونکہ کوئی پتہ نہیں تھا کہ تم پر کون سی آفت ٹوٹنے والی ہے، کمرے میں ہر چیز بکھری ہوئی تھی بیڈ دیکھ کر انداز ہوتا تھا کہ اس میں کوئی سویا کرنا تھا، ٹیلی ویژن اس وقت بھی چل رہا تھا، لائٹس بھی آن تھیں جبکہ دروازے پر ”Do not disturb“ کا نشان تھا۔

مجھے تمہارا بیگ اور پاسپورٹ تو مل گیا مگر روم سیف میں تمہاری کارڈز و اج نہیں مل سکی تھی جس کو ڈھونڈنے کے لئے مجھے کہا گیا تھا۔ روم سیف بالکل کھلا پڑا تھا۔ بعد ازاں مجھ پر انکشاف ہوا کہ تم نے دراصل وہ واج چلی منزل پر ہوٹل سیف میں رکھ دی تھی۔“

مجھے ڈیوڈ کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی میں نے اس سے کہا ”لیکن ڈیوڈ، جب میں نے کمرے سے نکلی تو میں نے ہر چیز کا سوچ آف کر دیا تھا۔ یہ تو واقعی بڑی عجیب بات ہے، میں تو یہ سوچ کر ہی پریشان ہو گئی ہوں کہ کوئی میری تلاش لیتا رہا ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ طالبان نے کسی کو یہاں بھیجا ہو؟ کیونکہ میں نے اپنے تفتیش کنندگان کو اپنے کمرے کا نمبر بتایا تھا اور کہا تھا کہ میرا پاسپورٹ کمرے میں ہے۔“

پریشان کن انکشاف

یہ انتہائی پریشان کن انکشاف تھا۔ لیکن اصل راز بعد میں کھلا کہ انا لین ٹیلی ویژن کے عملہ نے رشوت دے کر میرا کمرہ نمبر 109 کھلوا دیا اور اندر سے اس کی تصاویر بنائی تھیں ”ایکسپریس“ کا فوٹو گرافر بھی اندر گیا تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی جو تصویریں مجھے دکھائی گئیں۔ ان میں اس کمرے کی اس حالت سے کوئی مشابہت نہیں تھی جس میں، میں نے اسے چھوڑا تھا۔ میری رابطوں کی کتاب کھلی پڑی تھی، میرا بیڈ درہم برہم تھا، ڈریسنگ ٹیبل پر سے پرفیوم غائب تھی، اور کمرے کے باہر ”Do not disturb“ والا نشان میں نے آویزاں نہیں کیا تھا۔

میں نے اس وقت ان چیزوں پر زیادہ غور نہ کیا کیونکہ میرے ذہن پر ان سے کہیں زیادہ اہم معاملات سوار تھے لیکن ہر اتفاقی جملہ، اور واقعات کا ہر مکروہ موڑ مجھے بار بار کمرہ نمبر 109 کی طرف کھینچ لاتا تھا۔

جب میں گھر پہنچی.....

اس روز کے پچھلے پہر امریکی، آسٹریلوی اور جرمن سفارت خانوں کے نمائندے سے ملنے آئے، انہیں جرمنی میں قائم ”شیلٹر انٹرنیشنل“ کی ایڈورکرز کے بارے میں بہت تشویش تھی۔ وہ یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ان کے ملکوں کے کارکن کیسے حالات میں وقت گزار رہے ہیں۔ مجھے انہیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی تھی کہ جارج ٹیمین، کیتھی جیلنک، مارگریٹ شپنر اور سلکے دراکوف پر مشتمل جرمن ٹیم اور اسی طرح آسٹریلین پیٹرین بچ اور ڈیانا تھامس بھی، سب خیریت سے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے جذبے بلند اور ہمتیں جواں تھیں اور خدا پر پختہ ایمان ان کی مشعل راہ تھا۔ سفارت کار میری رپورٹ سے بہت مطمئن ہوئے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

پھر میں امریکی سفیر کی طرف متوجہ ہوئی اور بتایا کہ ڈیانا نے کڑی بھی ٹھیک ٹھاک ہے لیکن مجھے گروپ کی سب سے کم عمر ”ہیٹرمرسر“ کے بارے میں کچھ تشویش ہے۔ کیونکہ وہ حالات سے کافی گھبرائی ہوئی ہے۔ میں نے ان عورتوں کے ساتھ نسبتاً کم وقت گزارا ہے، ہیٹر بہت ذہین، سمجھدار، محبت کی طلبگار اور محبت بانٹنے والی لڑکی ہے، میں نے امریکی جاسوس طیارے گرائے جانے والے دن اس کے ردعمل کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے میں اور ہیٹر کی ہمارا ہی عیسائی لڑکیاں سب پریشان ہو گئی تھیں۔ میں نے زور دے کر کہا کہ آپ کو ان لڑکیوں کو چھڑوانے کے لئے خاص طور پر کوشش کرنا ہوگی، ممکن ہے کہ ان پر منصفانہ انداز میں مقدمہ نہ چل سکے۔ ہیٹر کے

اعصاب، مزید بوجھ کے تحمل نہیں ہو سکیں گے۔

جیل کا خفیہ خاکہ

پھر میں نے جیل کا خاکہ بنا کر، اس میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے راستوں کی نشاندہی کی، سٹاف کی شفٹوں کی تبدیلی، دیواروں کی مضبوطی اور ان کے کھوکھلے مقامات کی تفصیل بتائی۔ حتیٰ کہ اندر تنے ہوئے حفاظتی جالوں کا بھی ذکر کیا، صحن کا رقبہ بھی بتایا جس میں، میں اکثر ٹہکتی رہتی تھی۔

امریکی تو فیصل جنرل ڈیوڈ ڈوناہو (David Donahue) میری باتیں نہایت غور سے سنتا رہا جب میں نے بریفنگ ختم کی تو اس نے بے حد شکریہ ادا کیا، اس نے مجھے ڈیاناہ کری کی ماں نینسی کیسل کا ٹیلی فون نمبر دیا، جو مجھ سے بات کرنے کے لئے بے چین تھی۔

معلوم نہیں میری فراہم کردہ معلومات سے کیا فائدہ اٹھایا گیا ہوگا، لیکن میں نے یہ سب کچھ اس لئے بتایا تھا کہ ممکن ہے کوئی سپیشل فورسز ٹیم جیل پر چھاپہ مار کر ایڈورکرز کو باہر نکال لائے۔ اصل رکاوٹ یہ تھی کہ افغانستان میں ”شیلٹر“ کا ڈائریکٹر جارج اور اس کا نائب پیٹر، جیل میں الگ الگ جگہوں پر رکھے گئے تھے اور وہ ان عورتوں سے ہفتے میں صرف ایک بار ملاقات کر سکتے تھے۔ اگر یہ عورتیں فرار کرادی جاتیں تو پیچھے رہ جانے والے قیدی طالبان کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتے، باوجودیکہ جارج کو طالبان عزت کی نگاہ دیکھتے تھے۔ یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی، جو اپریل 1980ء میں امریکی ریغالیوں کو رہا کرانے کی تباہ کن کوشش کے بدصدی جی کارٹر کے لئے پیچیدہ ترین معمہ بن چکی تھی۔ اس کے لئے ایک بہادر اور حوصلہ مند صدر کی ضرورت تھی جو ایک زوردار اور ڈرامائی ریسکیو مشن بھیج سکتا۔

تاہم میں نے اپنی بہترین تجاویز پیش کر دی تھیں، اب صرف دعائیں تھیں، وہ میں دل میں دوہراتی رہی۔ میں اپنے بیڈروم میں واپس گئی جو وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی اسلام آباد گزشتہ آمد کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ میں سفیر کی اہلیہ اپنی کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ میں اپنے ساتھ شدید کھلی اور خارش لے کر آئی ہوئی ہوں لیکن اُمید ہے کہ میں اپنے ہمراہیوں اور جوئیں نہیں لائی۔

یہ بڑے مضبوط اعصاب والی عورت تھی، بعض عورتیں، یہ سنتے ہی گھبرا جاتی ہیں اور یقیناً آپ سب ”درخواست“ کر کے آپ کو بھڑوں کو نہلانے والی جگہ (Sheep dip) میں ایک مخصوص محلول سے نہلا کر، بیڈا استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہیں، مگر ”آئی“ ایسی نہ تھی۔ اس نے ابرو تک نہ اٹھایا اور سرسری انداز میں کہا کہ میں تمہاری دیکھ بھال کے لئے ابھی نرس کو بلاتی ہوں۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ ایک کوالیفائیڈ کونسلر ہے، اگر میرے ذہن پر کوئی بوجھ ہو تو وہ اسے ہلکا کرنے میں مدد کر کے بہت خوش ہوگی۔ کچھ دیر بعد پال لہنفو رڈ اور صالحہ آہنچے، ہم بے پناہ گرمجوش معانقوں اور بوسوں سے آپس میں ملے۔ صالحہ شلوار میض میں بے حد بچ رہی تھی اور دلقریت شخصیت لگ رہی تھی، ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے اور خوب گپ شپ کرتے رہے۔ میں نے جلدی سے تھوڑا ”میک اپ“ بھی کر لیا تھا۔ اتنے میں نرس نے دروازہ کھٹکھٹایا، وہ اپنے ساتھ کئی قسم کی کریمیں لوشن اور مرہمیں لائی تھی، میں نے اسے اپنی خارش زدہ جگہیں دکھائیں۔ اس نے کہا کہ یہ صرف گرمی اور کھجانے کے اثرات ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ مجھے جنسی طور پر تو استعمال نہیں کہا گیا، میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر واپس چلی گئی۔ میں اس روز بعد میں پھر اپنی کے پاس گئی تاکہ میں ڈیاناہ کی ماں کو فون کر سکوں لیکن ساتھ ہی میں خود کو بے حد قصور وار اور بزدل سمجھنے لگی کہ میں فون نہ اٹھا سکی۔ حالانکہ میں افغانستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئی تھی، گرفتار ہوئی گرفتار کنندگان کو گالم گلوچ کرتی رہی اور دس دن بعد دھکے کھا کر باہر آئی تھی۔ دوسری طرف ڈیاناہ تھی جس نے غریب افغانستان میں رہ کر ناداروں کی مدد کے لئے اپنی آرام کی زندگی تھ دی تھی اور اب من گھڑت الزامات کے تحت قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہی تھی۔ میں نے خود سے پوچھا۔ ”اس میں کون سا انصاف ہے، اگر میں اس کی ماں ہوتی تو میں اپنے آپ سے نفرت کرتی۔ میں اس کو ہرگز کال نہیں کروں گی۔“

تاہم، کچھ دیر بعد مجھ پر ایک اور احساس طاری ہو گیا، میں نے خود کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ اگر میں وہ کال نہ کروں تو میں بزدلی کی مرتکب ہوں گی اور اپنے ضمیر کے ساتھ کیسے زندہ ہوں گی جبکہ اس کی بیٹی تو دلیر ہے؟

ہم آپس میں باتیں کرتی رہیں، آخر کار میں نے فون کر دیا نینسی کیسل ایک عمدہ شخصیت تھی، میں نے اسے بتایا کہ تمہاری بیٹی شکل و صورت اور جذباتوں کے لحاظ سے بھی خوبصورت ہے، اور یہ کہ ڈیاناہ اب بھی میک اپ کرتی ہے اور اپنی شخصیت پر بجا طور پر فخر کرتی ہے۔ اس کے پاس کرنے کو اگرچہ کوئی کام نہیں اور اسے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں، جیل کی زندگی اس کے لئے محض ایک معمول کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ ڈیاناہ ایک خصوصی چیز ہے، اس میں سے نیکی اور شرافت کی کرنیں پھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔ جب میں نے اسے ”آئی لیشن کرلرز“ استعمال کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ کیا میں انہیں مستعار لے سکتی ہوں، اس طرح میرا دن بڑی خوشی سے گزرا۔ آئی لیشن کرلرز

قائم کیا تھا، اس پر جاسوسی کا الزام تھا اور اس کے لوگ جاننا چاہتے تھے کہ پال نے میری رہائی کے لئے کیا کیا تھا اور کیا وہ ان کے لئے بھی ایسا ہی کرے گا۔ پال نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”واہ دنیا کا تو یہی لگا بندھا اصول ہے، اب زندگی دوبارہ اس شکل میں واپس نہیں آئے گی۔“

جو نہی ہمارے طیارے کے پہیوں نے بیتھر وائر پورٹ کو چھوا، مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ بالآخر گھر آ پہنچے۔ میں اپنی لیڈر جیکٹ پہنے ہوئے تھی اور میری پرانی بیس بال کیپ میرے سر پر سختی سے جمی ہوئی تھی اور بال اتر ہو چکے تھے۔ میں جو ڈائی استعمال کرتی تھی اس نے انہیں تبدیل کر کے غلے کے سوکھے ڈنھل بنا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ انہیں اب کٹوا ہی دینا پڑے گا۔ میں نے آنکھوں پر دھوپ کے چشمے چڑھا لئے کیونکہ میں نے کوئی آئی میک اپ نہیں کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے میں بھیانک شے لگ رہی تھی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

کرنا گروہ سنی ان سنی کر دیتی۔ چنانچہ دس دن تک اخباروں کی تمام سرخیاں، اس کی بتائی ہوئی باتوں پر مبنی ہوتیں، یہ خبریں لیبر پارٹی کی کافر نس کے دوران حکمرانوں کے چہرے پر طمانچہ ثابت ہوتیں۔ ٹونی بلیئر کے سرکاری ترجمان ایلن سٹیئر کیسٹل تھا تو میری ماں (جائس رڈلے) کے پاس ”ٹیڈ پینڈز“ اور ”جیمز ہنٹ“ جیسے ماہرین ابلاغ تھے جو اس کی طرف سے انتھک دوڑ دھوپ کر رہے تھے، انہوں نے اخبارات، رسالوں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے ایک بین الاقوامی مہم شروع کر رکھی تھی اور طالبان کو باور کرا رہے تھے کہ میں ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوں اور خالصتاً ایک صحافی ہوں جس کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں ہیں۔

انہوں نے ورلڈ میڈیا کے ذریعے میرے نام اور چہرے کو اس طرح پیش کرنے کو اپنا مشن بنایا ہوا تھا کہ میرے صیادوں کے دل پلیج جائیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ طالبان پر اس کا کتنا اثر ہوا مگر اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ”ٹیڈ پینڈز“ فلیٹ سٹریٹ کا ایک پرانا عیار انوسٹی گیٹر اور سابق ”Cook report“ کا ریسرچر ہے۔ اس میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور وہ اپنے ”کام نکلوانے“ میں زبردست مہارت رکھتا ہے۔ جیمز ہنٹ ایک طاقتور سیاسی میڈیا کنسلٹنٹ ہے اس نے اپنی اس صلاحیت کے ذریعے متعدد سینئر سیاستدانوں اور تاجروں کو شیشے میں اتارا ہے اور ان کا معتمد خاص بنا ہوا ہے۔ یہ دونوں میرے پرانے دوست اور میرے ہیرو ہیں۔

انہوں نے میری گرفتاری کے چند ہی گھنٹوں کے بعد میری ماں کے سامنے میری رہائی میں مدد کے لئے ایک ابلاغی حکمت عملی پیش کر دی۔ ماں بتاتی ہے کہ ان کی صرف دس منٹ کی ٹیلی فون کال سے ہی مجھے چھڑوانے کے لئے حکومت کی سیاسی حکمت عملی کے بارے میں اس کی رائے تبدیل ہو گئی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ حکومت اس کام کو کتنی اہمیت دی سکتی ہے۔ جیمز کے ساتھ اس کی بحث محض قیاس آرائیوں پر مبنی تھی، تاہم ان میں سے ایک قیاس اس کی سمجھ میں آ گیا اور اس پر اس نے فوری طور پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ جیمز نے اس مسئلے کو ”جبریت“ (determinism) بمقابلہ ”سیاسی ارادہ“ (political will) کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ماں کے لئے جیمز اور ٹیڈ کی رہنمائی بڑی اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ انہیں فوری طور پر احساس ہو گیا تھا کہ طالبان کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کام نہیں بنے گا۔

میری ماں کے الفاظ میں ان کے مذہب اور ان کی شرافت و انسانیت نوازی کے لئے احترام ضرور جھلکنا چاہیے تھا بشرطیکہ ان میں انسانیت نوازی موجود ہوتی۔ ٹیڈ نے کہا کہ طالبان سے گفتگو کرتے ہوئے شمشیر زنی کے جذبے کا مظاہرہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ فاک لینڈز اور خلیجی جنگوں میں کامیابی پر غلغلے بجانے اور بمباری کے ارادوں سے انہیں مرعوب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ٹیڈ اور جیمز نے مواصلاتی پھیلنے کو گھلا رکھا اور اس دائرے کو ممکنہ حد تک وسیع کر دیا تا کہ یہ الفاظ سنے جاسکیں۔ جائس (ماں) نے حرف بہ حرف ان کی نصیحتوں پر عمل کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ 74 سال کی ہو چکی ہے مگر ایک ریٹائرڈ ”بزنس سٹنڈرڈ“ کی لیکچرر رہی ہے اور چاق و چوبند اور توانائیوں سے بھرپور شخصیت ہے۔ میری بہن ”ہل“ نے ان دس دنوں کی ابتلا کو حوصلے سے برداشت کرنے میں اسے بڑی تقویت دی تھی۔ جیمز نے کہا کہ میری ماں نے اپنی سادہ اور دیانتدارانہ برہنگو سے قوم کے دل جیت لئے، اور سرڈیوڈ فراسٹ نے جس نے میری رہائی کے فوراً بعد مجھے اپنے ”بریک فاسٹ و دفرائسٹ ٹی وی پروگرام“ میں مدعو کیا تھا کہا کہ مجھے اپنی ماں پر بے پناہ فخر کرنا چاہیے کیونکہ وہ ان دس دنوں میں برطانیہ کا ایک عظیم ادارہ بن گئی تھی۔

میری ماں نے مجھے ایک فرض شناس ماں اور والہانہ محبت کرنے والی بیٹی کے طور پر پیش کیا۔ مثلاً ”یو آئے ایک پیشہ ور جرنلسٹ ہے، البتہ اس میں معرکہ آرائی کی طرف میلان پایا جاتا ہے، چنانچہ اپنے پیشہ ورانہ جذبے سے دنیا کو عام افغانوں کی حالت زار کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں دوڑ نکل گئی ہے۔“ یہ بات اگرچہ گھسی پٹی لگتی تھی لیکن بعض اوقات سادہ تصورات اور بنیادی نظریات کا اظہار بہت مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ جب طالبان نے مجھ سے کہا کہ ڈیزی اخباروں کے ذریعے مطالبہ کر رہی ہے کہ اس کی امی کو چھوڑ دیا جائے، مجھے یہ بات بہت بری لگتی تھی، میرا خیال تھا کہ میری ماں نے میری بیٹی کو ایسے سنگی پن سے استعمال نہیں کیا ہوگا لیکن جیمز نے مجھے بعد میں بتایا کہ اسے اس طرح ”استعمال کرنا“ بہت ضروری ہو گیا تھا۔

ان کی پہلی چال تو یہی تھی کہ ڈیزی کی نويس سالگرہ سے، جو گرفتاری کے بعد کے ہفتے کے دوران آرہی تھی، فائدہ اٹھایا جائے۔ ڈیزی، اس میڈیا مہم میں تروپ کا پتہ ثابت ہوئی، وہ ذاتی طور پر التجائیں کر رہی تھی کہ میں اس موقع پر ضرور گھر واپس آؤں، اس سے بین الاقوامی اعصاب پر بڑا جذباتی اثر پڑ رہا تھا۔ اس کا ملتجیانہ چہرہ مختلف پوزوں میں دنیا کے 280 مطبوعات میں چھپا، اس کا کیپشن یہ تھا۔ ”میں اپنی مٹی کو واپس بلانا چاہتی ہوں۔“

اس تسلسل کو سیاسی فرنٹ پر جاری رکھنے کے لئے نجی مساعی تیز تر ہوتی گئیں۔ جیمز نے ڈیزی سے ٹونی بلیئر کے نام ایک ذاتی خط لکھوایا جس میں اس سے مدد مانگی گئی۔ جب ان پر انکشاف ہوا کہ وہ اس سے پہلے دو مواقع پر ذاتی خطوط لکھ چکی ہے تو اس خط کو مزید اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس نے اپنا پہلا خط اس وقت لکھا تھا جب وہ سات سال کی

سوالوں کی بوچھاڑ

ہمارا خیال نہیں تھا کہ ہمارے خیر مقدم کے لئے میڈیا کے کوئی زیادہ لوگ آئیں گے مگر یہاں تو ایک بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا، اس لئے میں بدستور چلتی رہی اور سوالوں کی بوچھاڑ میں سے کسی کسی سوال کا جواب دیتی اور بہت سے سوالوں کو نظر انداز کرتی رہی۔ اتنے میں ایک مانوس اور پر شور آواز سنائی دی۔ ”یو آئے رڈ لے“ میں نے کن آنکھوں سے دیکھا تو یہ جین ڈریپر تھی جو نیوکیسل میں ”نہ ٹلنے والی“ (tenacious) ٹرینی رپورٹر تھی، اب ٹی وی کے لئے کام کر رہی تھی اور اس نے ایک انوکھی وضع قطع بنا رکھی تھی، میں اسے اپنے ساتھ چمٹالینا چاہتی تھی مگر مجھے چلتے بھی رہنا تھا، حتیٰ کہ میں ایک منتظر ”سپیس کروزر“ میں جا بیٹھی۔

وہاں اندر میری بہن ”ویو“ بیٹھی تھی اور ہم والہانہ طور پر آپس میں ملیں اور ایک دوسری کو گرمجوشی سے بوسے دیئے۔ گاڑی چلی تو اس نے میرے سر میں زور سے پھڑپھڑا کر کہا۔ ”تو نے یہ سب کچھ ہمیں جہنم میں دھکیلنے کے لئے کیا تھا۔“ ایسی باتیں کہنے کے لئے وہاں لوگوں کی ایک اور قطار بھی لگی تھی، پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ میرا نیوز ایڈیٹر ”جم“ مرے تھا اور بے حد ست اور غصہ حال دکھائی دے رہا تھا۔ میں بہت پریشان ہوئی، کہ پتہ نہیں یہ کس اندرونی عذاب میں سے گزرا ہے۔

گاڑی روانہ ہوئی تو جم نے پچھلے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جمعہ کے روز جب میں گرفتار ہوئی تو وہ اس وقت نیوز کانفرنس میں بیٹھا ہوا تھا اور اس نے کہا تھا ”مجھے یو آئے کی اب تک کوئی اطلاع نہیں ملی ہے مگر اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے دوپہر کے قریب رابطہ قائم کرے گی، میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے یاد دلایا کہ وہ ایک بے کیف ہفتہ تھا، وہ سوچ بچار ہی کرتے رہے کہ پہلے سات صفحات پر کون کون سی خبریں لگائیں۔

نیوز روم میں چلتے ہوئے ڈیلی (اخبار) کے ایک کارکن نے اسے آواز دے کر ایک فارن ایجنسی رپورٹر کی طرف توجہ دلائی جس میں کہا گیا تھا کہ طالبان نے ایک برطانوی صحافی کو گرفتار کر لیا ہے، اور یہ کہ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق وہ میں تھی۔ وہ فوراً کانفرنس میں واپس گیا اور خبر جاری کر دی۔

ٹائیٹ ایڈیٹر ڈک ڈسمور نے یقینی انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے یہ ایک Splash ہے، پھر خبر تیار کیجئے“ اس نے کہا کہ وہ اس لمحے کو ذہن میں تازہ تو نہیں کر سکتا لیکن اسے اتنا یاد ہے کہ دیگر شرکائے کانفرنس اس کی طرف چونک کر دیکھنے لگے۔ ڈک واقعی ایک پیشہ ور آدمی ہے، میں اسے کسی جذباتیت کے بغیر ایسا کہتے ہوئے تصور کر سکتی ہوں، اگرچہ وہ دلی طور پر کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔

پال ریشورڈ کو سخت اصرار کر کے اس اہم صلاح و مشورے کے لئے بلایا گیا اور اس نے کہا کہ ”اگر اس نے جان بچانے کے لئے وہاں سیاسی پناہ مانگ لی تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔“ اس نے یہ بات کہنے کا کھلا اعتراف کیا، میں اس پر ہنس پڑی۔ اس صنعت میں تباہی و بربادی کو سامنے پا کر بھی تمسخر اڑانا ایک نام چلن ہے۔ کیونکہ بعض اوقات حقیقی زندگی اتنی ناخوشگوار ہوتی ہے کہ آپ کو اس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ڈرائیور لیک ڈسٹرکٹ کا رخ کر رہا تھا جہاں ڈیزی کا سکول ہے اور جم نے پچھلے دس دنوں کے خاکوں میں تمام خالی جگہوں کو پُر کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اس نے کہا۔ ”یو آئے، میں تمہاری پرائیویٹ زندگی کے بارے میں بہت زیادہ جانتا ہوں، ماضی میں اس سلسلے میں مجھے کوئی تجسس نہیں تھا حقیقت تو یہی ہے کہ تمہاری کوئی پرائیویٹ زندگی نہیں رہی۔ ہمیں تو بالکل معلوم نہیں تھا کہ تم نے اتنی بارشادیاں کی ہیں، پھر لکڑی کے ڈبے میں سے یہ فلسفینی نمودار ہو گیا جس کے فوراً بعد ایک اسرائیلی آدھمکا، یہ سب کیا تھا۔“

اس نے یہ بھی کہا کہ اسے میرے متنوع رابطہ کاروں سے بھی بہت کچھ معلوم ہوا ہے، جن میں ”مالکم ایکس“ (Malcom X) نامی شخص بھی شامل ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ سابق ”Hereford boys“ میں سے ہے، میرے اور بھی چند دوست ہیں جو ”SAS“ (سپیشل ایئر سروس) میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

جم نے کہا۔ ”ہاں میں جانتا ہوں، ان سب نے مجھ سے رابطہ قائم کیا ہے۔ مالکم ایکس ایک ٹیم اکٹھی کرنا چاہتا تھا، کیونکہ بقول اس کے اسے معلوم تھا کہ گرفتاری کے بعد تمہیں کہاں رکھا گیا تھا، دیگر بہت سے لوگوں نے بھی ایسی پیشکشیں کی تھیں۔“

مجھے اس پر بے حد خوشی ہوئی، میں اس ”لبے بارلش“ شخص، جسے پال ریشورڈ کے نام سے پہچانا جاتا ہے، کی خدمات پر شکر گزار تو تھی، لیکن اگر میں نے سابق ”ایس اے ایس“ کے سر پھرے پچھروں کے ہاتھوں رہائی پائی ہوتی تو مجھے اس سے زیادہ خوش ہوتی۔ وہاں کچھ ”Underworld“ (منظم جرائم اور اخلاق سوز حرکتوں پر

گزارہ کرنے والے گروہ) کے لوگ بھی تھے جو میرے لئے افغانستان کے اندر جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ یہ بہت اٹوکی حرکت ہوتی۔ کچھ ”Blue Brother“ کے سخت جان گروہ بھی طالبان سے مکرمول لینے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔

کار میں کافی قہقہے لگتے رہے اور اخباری گیمیں ہانکی جاتی رہیں۔ لیکن مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میری گرفتاری نے مجھے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے جلال آباد میں طالبان کی قیدی کے طور پر جو پہلا اتوار گزارا تھا، اس روز جم کو گھر پر ایک دوست کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی اس میں اس نے کہا تھا..... ”خبر اچھی نہیں ہے، اے میرے یار، ہم نے ابھی ابھی سنا ہے کہ منگل کی صبح مقامی چوک میں اس کا سر قلم ہونے والا ہے۔“

فون کرنے والا، ایک ”باخبر“ انسان تھا اور اس نے یہ فون خیر خواہی کے جذبے کے تحت کیا تھا، لیکن معلوم نہیں کہ یہ پیغام مجھے موصول ہوتا تو میرا رد عمل کیا ہوتا۔ ایک اور دوست نے جس نے جم سے رابطہ قائم کیا، کہا کہ کابل سے میری کفایت کے لئے بھیجا گیا سکوڈ، دراصل ایک اذیتی سکوڈ ہے اس عذاب کی کوئی تاب ہی نہیں لاسکتا، کہ بتانا پھرے اس کے ساتھ کیا بیٹی۔ اس نے اسے یہ بات بذریعہ ای میل بتائی تھی۔

کرائس سنٹر کا قسام

میرے عرصہ قید کے دوران جم نے ڈیسک کا کام چھوڑ کر ایک ”کرائس سنٹر“ سنبھال لیا جہاں وہ میرے متعلق آنے اور جانے والی اطلاعات کو مربوط کر رہا تھا۔ انہیں اس سلسلے میں بھی بڑی تشویش یہ تھی کہ طالبان کو کہیں میرے آرمی رکارڈ سے متعلق کوئی بھنگ نہ مل جائے، اور انہیں یہ اطلاع ملنا بھی بے حد خطرناک ثابت ہوتا کہ میری ایک شادی ایک اسرائیلی سے بھی ہوئی تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ رابکہ ویڈ جو صحافت میں میری طرح عورتوں کی بانی ارکان میں سے ہے، اس نے متعدد ایڈیٹروں سے رابطہ قائم کر کے ان سے کہا کہ وہ میری بحفاظت واپسی تک خبروں میں میرا تذکرہ جاری رکھیں۔ ”آبز روز“ کی ”باربرا کوئیل“ اور ”ٹریسی میکوے“ اور گارڈین کی ”ہیلن کارٹر“ نے میری اسیری کے حوالے سے ڈونٹک سٹریٹ میں شمعیں روشن کرنے کے لئے ایک تنظیم بنادی جسے بعد ازاں ملک بھر کی صحافی عورتوں کی آشیر باد حاصل ہوگئی۔

”جولیا ہارٹلے بریور“ (GHB) لیبر پارٹی کانفرنس میں اپنے سیاسی دوستوں اور رابطہ کاروں سے باقاعدہ جھگڑا کیا اور میرے خیال میں میری چچا ”جوئلز“ نے بھی لیبر پارٹی سے میری رہائی کی کوششوں میں معاونت حاصل کی، میرے یہ چچا ٹرانسپورٹ اینڈ جنرل ورکرز یونین کے ریجنل سربراہ رہ چکے تھے، اس کے لئے ان کا اس پارٹی میں خاص اثر تھا۔ ارکان پارلیمنٹ کی ایک بڑی تعداد نے طالبان کو خطوط لکھے کہ وہ ازراہ رحم مجھے رہا کر دیں۔ جبکے نیشنل یونین آف جرنلسٹس اور برٹش ایسوسی ایشن آف جرنلسٹس نے بھی میری رہائی کے لئے آواز اٹھائی۔ جب جم نے مجھے ان مساعی سے آگاہ کیا تو شدت جذبات سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میرے دل میں اپنے دوستوں اور رفقاء کی عزت دوچند ہوگئی اور تشکر کے جذبات نے جنم لیا لیکن ان کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ ہی نہیں تھے۔

بین الاقوامی منظر کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ فلسطینی دہشت گرد احمد جبریل نے مداخلت کی تھی اور جمہوریہ تاجکستان کے صدر نور سلطان نذر بايوف نے بھی دباؤ ڈالا تھا۔ منوخر الذکر میرے ایک دوست جان میپس کی وجہ سے مدد کو آیا تھا۔ ان کے آپس کے تعلقات کی وجہ یہ تھی کہ جان میپس نے ایک تاجکستانی ہیلڈ انس ”ارینا“ سے شادی کر رکھی تھی، ایک اور ساتھی یان لنچ نے، جس کے ساتھ میں کارلن ٹی وی پر کام کر چکی تھی، ویب سائٹ کے ذریعے برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر سے درخواست کی تھی کہ وہ یو آئے رڈلے کے مسئلے کو اپنے ایجنڈے پر سر فہرست رکھے اور اسے جلد از جلد رہا کرانے کی کوشش کرے۔ اس درخواست کے الفاظ یہ تھے: ”یو آئے صرف اپنے صحافتی فرائض انجام دے رہی تھی، وہ افغانستان میں ایک انسانی بحران کی رپورٹنگ کے لئے گئی تھی جہاں اسے گرفتار کر لیا گیا۔“

اس کی استیغوں میں اور بھی کئی خفیہ منصوبے تھے مگر فارن آفس نے اس سے براہ راست رابطہ قائم کر کے اسے سمجھا دیا تھا کہ رڈلے کو اتنی زیادہ پبلشی دینے سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے کیونکہ اس سے طالبان یہ سمجھنے لگیں گے کہ میں بہت اہم شخصیت ہوں، اس لئے وہ مجھے سودا بازی کا ذریعہ بنانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، یہ سوچ بالکل بجا تھی۔

حکمرانوں کے منہ پر طمانچہ

جم مرے نے، میری ماں کی ورلڈ میڈیا کوروزمرہ کے بریفنگ کی کہانیاں سنا سنا کر مجھے دم بخود کر دیا۔ میڈیا اس سے کاؤنٹی ڈرامہ (ویسٹ ہیلٹن) میں اس کے گھر رابطہ قائم کرتا تھا۔ فارن آفس اسے اس سے باز رکھنے کی کوشش

تھی، اس خط میں کوسوو پر بمباری بند کرنے کی استدعا کی گئی تھی، اس پر اسے ڈاؤنٹک سٹریٹ سے جواب ملا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی۔ تین دن بعد جب بمباری بند ہو گئی تو اس کے اعتماد کو مزید تقویت ملی۔ پچھلے برس اس نے ”Dome“ دیکھنے کے بعد جب سنا کہ یہ بند ہونے والا ہے، اس نے پھر وزیر اعظم کو خط لکھ دیا۔ اس کا پرائیویٹ خط پُر اسرار طور پر گلوبل میڈیا میں چھپ گیا جس پر متعدد تبصرے شائع ہوئے۔

جیسے میں پہلے کہہ چکی ہوں، میری ماں ان کے منصوبوں میں دوسرے نمبر پر ایک کلیدی کھلاڑی تھی۔ جیمز اورٹیڈ نے اسے سلح جو یا نہ انداز میں آواز میں ایسا زیر و بم پیدا کرنے کی تربیت دی جو طالبان کے دلوں کو موم بنا کر رکھ دے۔ انہوں نے انٹرنیشنل ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے انٹرویوز کے سلسلے کا بھی انتظام کیا، جن میں میری ماں نے طالبان کا بے حد احترام سے ذکر کیا اور انہیں بھوت پریت کہنے کی غلطی سے پوری طرح احترام کیا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

کہا۔ ”ہم ایک چھت تلے جمع ہوں تو دس منٹ کے لئے بھی دنگا فساد کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“ میں نے کسی قدر نمسخر سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ماں اور باپ سے پھر ملاقات ہونے سے بے پناہ خوشی ہوئی مگر وہ کچھ تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ میری رہائی کے اگلے روز میرا رفیق کار ”گیرتھ کرکر“ (گلائیو کا بیٹا) انہیں گھر کے باہر منتظر پر لیس کے جوم کے زرخے میں سے، زندہ دلانہ انداز میں نکال لایا تھا۔ درجنوں رپورٹر خالی مکان کے سامنے پورے بارہ گھنٹے بیٹھے انتظار کرتے رہے تھے کیونکہ ان سے بات چیت گارڈن گیت کی پریفلنگ ختم ہونے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔

میری بھانجی بیانکا وہیں تھی، اسی طرح میری بہن بل اپنے پارنر پال ہیلے کے ساتھ موجود تھی، پھر ویو اور میں، ہم سات تھیں۔ ہم نے کانسن کے قریب ایک ”پب“ میں اکٹھے کھانا کھایا اور پھر دور افتادہ کالج میں واپس آ گئیں۔ پھر اتفاقی طور پر اپنی دو بہنوں کے ساتھ رہ گئی اور مجھے اعتراف ہے کہ ہم آپس میں چپک گئیں اور اس اتفاق پر خوب کھلکھلا کر ہنسیں۔ پھر بل کے ایک سوال سے ایسے محسوس ہوا کہ اس نے مجھے زمین پر ٹنچ مارا ہے، اس نے پوچھا تھا۔ ”جب تم نے سوچا کہ تمہیں ہلاک کیا جا رہا ہے تو تمہارے خیال میں وہ یہ کام کیسے کرتے؟“ ایسا منہ پھٹ گنواروں جیسا سوال! وہاں کے سنگ دل ترین شخص نے بھی مجھ سے نہیں پوچھا تھا۔

اگلی صبح میں اور ویو، آنکھیں ملتی ہوئی بمشکل اٹھ سکیں، اور بستر سے نکل کر سیدھی کچن میں جا پہنچیں، جہاں میرا باپ لیکن سینڈوچز بنا رہا تھا جو بہت مزیدار تیار ہوئے تھے۔ مجھے اپنے باپ کی اس مہارت پر بڑی حیرانی ہوئی کہ کوئی چیز اتنی سادہ ہو اور پھر اس قدر لذیذ بھی ہو۔

بعد ازاں ”مانجسٹر ایکسپریس“ کے فوٹو گرافر سٹورٹ مین نے میرے والدین سے دوبارہ ملنے اور کھیتوں میں ان کے ہمراہ ٹہلنے کی تصاویر بنائیں اور پھر سب ادھر ادھر نکل گئے۔ مجھے اور جم کو موقع مل گیا کہ ہم اس ”سندے“ کے لئے اپنی خفیہ ڈائریوں سے متعلق باتیں کریں، جس کی مدد سے مجھے مواد تیار کرنا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ ”میں نے طالبان سے بھی کہا تھا کہ میں غلیظ جگہوں پر نہیں رہ سکتی اور مضافاتی ماحول بھی مجھے کوارا نہیں، پیلز مجھے یہاں سے نکالو“ وہ جانتا تھا کہ میں سبزہ زاروں میں وقت گزارنے والے بریگیڈ کا حصہ نہیں ہوں۔ مجھ سے میری بہترین صلاحیتوں کے مطابق کام لینا ہے تو ہمیں شہر کا رخ کرنا ہوگا۔

چنانچہ میں نے امی ابو سے رخصت لی اور ہماری پارٹی مانجسٹر کے لئے روانہ ہو گئی۔ اس نے مجھے ہوٹل میں ”پریز یڈنفل سوئٹ“ دلو کر کمپیوٹر سیٹ کر دیا، اور میں نے جمعرات کو اپنی ڈائریوں کا متن ماسپ کرنا شروع کر دیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں نے نوٹس (notes) تو تھ پیسٹ کے ڈبے کی اندرونی جانب تاریخ وار لکھے تھے کیونکہ جلال آباد میں مجھے کاغذ وغیرہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن جب کابل جیل میں لائی گئی تو وہاں ”شیلٹر“ کی ایڈورکر لڑکیوں نے کچھ کاغذ دیدیئے۔ میں نے یہ چھپا کر رکھے ہوئے تھے اور ان پر اشاراتی زبان میں نوٹس لکھتی گئی اور وقت اور تاریخیں بھی درج کرتی رہی۔ وہاں سے رہا ہوئی تو ان نوٹس کو اپنی نیکر کے اندر گھسیٹ لیا، ساتھ ہی کیتھی کی طرف سے اس کے بھائی اینڈریاز کے نام لکھا ہوا خط بھی ڈال لیا، اس کا بھائی ”بینوور“ (جرمنی) میں رہتا ہے۔ تو تھ پیسٹ کے ڈبے کو انگلیا کے اندر محفوظ کر لیا، جس میں کچھ اور نوٹس اور کاغذ کے چند اور ٹکڑے بھی ڈالے ہوئے تھے۔

تھلکہ خسر شوری کی اشاعت

جمعہ کی سہ پہر تک میں نے بارہ ہزار الفاظ پر مشتمل ڈائری مرتب کر لی جو سندے ایکسپریس کے کئی صفحات پر پھیل ہوئی تھی اور دنیا کے چالیس سے زائد ممالک کے اخبارات اور جرائد میں چھپ گئی۔

ڈیزی اپنے ماموں بل برائون کے ہمراہ پہنچی اور ہم سب نے اس رات ہوٹل میں ڈنر کھایا۔ جب ہم سب میرے کمرے میں پہنچے تو ڈیزی بے حد خوش اور نازاں تھی، وہ ہوٹلوں میں قیام کی بہت شوقین ہے۔ ہم عموماً بیڈ پریٹ کرنی وی پر فلم دیکھتے ہیں لیکن اس روز تھ کاوٹ اتنی تھی کہ سب سو گئے۔ بیڈکنگ سائز کا تھا پھر بھی وہ کھسکتے کھسکتے میرے ساتھ آچھٹی تھی۔ مجھے یہ بہت اچھا لگا اور محسوس ہوا کہ وہ میرے لئے کتنی بڑی ڈھارس ہے۔

اگلے دن کا آغاز بہت سست رفتاری سے ہوا، مجھے سویرے جاگنا بڑا ناگوار گزرتا ہے، لیکن ڈیزی بے چینی سے بستر پر اچھل کود کر رہی تھی۔ اس کی بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ بل نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا وہ اسے بلیک پول کے فن فیئر میں لے جائے گا۔ میرا دل خود بھی چاہ رہا تھا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں کیونکہ میں بلیک پول کبھی نہیں جاسکتی تھی، مجھے معلوم ہے کہ ڈیزی میلے کے گراؤنڈ میں جھولوں اور سواری کی کتنی شوقین ہے۔

میں وہاں جانے کی بجائے ”ویو“ کو ساتھ لے کر لندن کے لئے روانہ ہو گئی۔ جب کار بلیک فریئر کے پل پر سے گزرنے لگی تو میں کچھ جذباتی ہو گئی ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ میری نظروں سے اوجھل ہونے والا ہے۔ ”ویو“ نے کہا۔ ”دیکھو اب تمہیں جذباتی پن چھوڑ دینا چاہیے۔“ یہ پرانا خاکستری رنگ کا ”لبیا نکا“ ہر اسماں کرتا ہوا دکھائی

اگلے آٹھ دنوں وہ اسی طرز کی زبان و بیان سے کام لیتی رہی۔ جیمز اور ٹیڈ میری ماں سے صبح کے وقت دن بھر کے لئے لائحہ عمل طے کرنے اور اس روز کے لئے مجوزہ تقسیم پر تبادلہ خیال کرتے اور چاشت کے وقت نیوز سنوری آگے منتقل کر دیتے۔ اس طرح اوور سیز میڈیا سے فون کالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ماں بتاتی ہے کہ جیمز دن بھر اس کے ساتھ رابطے میں رہتا اور ”یو آنے رڈ لے شو“ کو موثر تر بنانے اور نئے نئے زاویے تلاش کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ ماں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ٹیلی فون کے پاس تین رائٹنگ پیڈز رکھے، ہر آنے والی کال کو ٹیپ ریکارڈ کرے، اور ٹیلی ویژن پیڈ، ریڈیو پیڈ یا نیوز پیپر پیڈ پر ان کا اندراج کرے۔

دوسری ”رنگ سنوریز“ جن میں موضوع ہی اصل ایجنڈا ہوتا ہے، یہ معاملہ ان کے بالکل برعکس تھا، یہاں جیمز اور ٹیڈ، ڈھول کی اگ اگ اگ تھا پ پر مارچ کرنے لگے۔ ان کی مہم کے آغاز ہی سے ان کی میڈیا سے متعلقہ مساعی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا، یعنی طالبان سے استدعا کرنا کہ وہ مجھے چھوڑ دیں۔

انٹرنیشنل پولیس کے نمائندے جو گردہ در گردہ، میرے والدین کے گھر کے سامنے کمپ لگائے رکھتے تھے وہ میری امی سے بھی باقاعدہ پلیٹیفمز کے اجر کی توقع کرتے رہتے تھے۔ جیمز اور ٹیڈ اس کی مسلسل کو چنگ کرتے رہتے تاکہ وہ جو کچھ کہے، اس کی غلط تعبیر ممکن نہ رہے۔ شروع میں میری جلد رہائی ممکن دکھائی دے رہی تھی مگر جب سے انہوں نے میرے بارے میں جاسوسی کا لفظ استعمال شروع کر دیا تو صورت حال خراب ہو گئی۔

ٹیڈ نے مجھے بعد میں بتایا کہ فارن آفس کی کارگردگی سے میرے خاندان کی مایوسی نے طالبان کے سامنے ان کے پیش کردہ کیس کو کافی تقویت دی تھی اور اس نے ان کو اپنی حکومت پر عدم اعتماد سے آگاہ کرتے ہوئے مجھے گرفتار کرنے والوں پر میرے خاندان کے بھروسے کا حوالہ دیا تاکہ ان کے اندر ہمدردی کا جذبہ جگایا جاسکے۔ لیکن میری ماں کی کارکردگی منوثر نہ ہوتی تو ان کا کام غیر منوثر ہو کر رہ جاتا۔

جم مرے نے مجھ سے پوچھا کہ ”جیمز ہنٹ کون ہے“

میں ہنسی اور کہا ”یہ وہ آدمی ہے، جو کسی پر سایہ نکل نہیں ہوتا اس لئے یہ بات نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔“

جب ہم ایک ڈسٹرکٹ کے قریب پہنچے تو میں نے جم سے کہا کہ مجھے میری بیٹی سے نجی ملاقات کی اجازت دو کیونکہ میں نہیں چاہتی اسے آئندہ کبھی ”استعمال“ کیا جاسکے۔

میں نے سکول میں کال کر کے اجازت مانگی کہ اگر میں گھنٹے بھر کے لئے بیٹی کے پاس ٹھہروں تو کیا کوئی ہرج نہیں سمجھا جائے گا۔

یہ ایک جادوئی لمحہ تھا۔ ان کے بورڈنگ ہاؤس سے ایک وینڈر میسر کا خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچی تو بچوں کی چہل پہل اور ان کی ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک ٹیچر نے مجھے کارز کی طرف جانے کا اشارہ کیا، جونہی میں وہاں پہنچی ڈیزی عین اسی وقت ہاتھ روم میں سے برآمد ہوئی۔ اس کے کندھیاں بال گیلے تھے اور اس کے رخساروں پر تازگی اور ہلکی گلابی متمہاٹ نمایاں تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بازو اٹھائے دوڑتی ہوئی آئی اور میرے گلے کے گرد بازو حائل کر کے اپنی مانگیں میرے گرد پلٹ لیں۔ میں اسے اٹھائے ہوئے اس کے بیڈ روم میں لے گئی اور ہم بیڈ پر ایک دوسری کے ساتھ چمٹی ہوئی بیٹھی رہیں۔ پھر اس نے چند ایک سسکیاں لیں اور میں نے پوچھا کہ کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔ ”نہیں مجھے پتہ ہے کہ یہ آپ کی جاب ہے، مگر آپ ایسی حماقت کیوں کر بیٹھیں کہ اپنا پاسپورٹ ہی بھول گئیں۔“

ہم کچھ دیر باتیں کرتی رہیں، میں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ میں اس کی سالگرہ میں شرکت سے محروم رہی۔ ”البتہ میں جس کمرے میں تھی میں نے وہاں تمہارے برتھ ڈے کا گیت گایا تھا۔“ اس نے اپنی ان براؤن آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، آپ کی آواز مجھے سنائی دے گئی تھی۔“ پھر اس نے مجھے اپنی پوٹیری بک دکھائی اور وہ نظمیں پڑھ کر سنائیں جو اس نے خود لکھی تھیں۔

اس کے بیڈ روم کی دیوار پر تھ ڈے کارڈز سے دھکی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا تقریب کیسی رہی تھی۔ اس نے بتایا ”زبردست اور شاندار، مجھے ڈھیروں تحفے ملے، حقیقی تحفے، اور ہر کوئی میرے ساتھ جڑ کر بیٹھنا چاہتا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ سب اس وجہ سے تھا کہ آپ موجود نہ تھیں، وہ آپ کی عدم موجودگی کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔“

ایک گھنٹے کے بعد، ایک دوسری سے گلے مل کر اور بو سے لے کر میں یہ وعدہ کر کے وہاں سے نکلی کہ آئندہ اسے بتائے بغیر کبھی بیرون ملک نہیں جاؤں گی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ ویک اینڈ پر پھر ملنے آؤں گی۔ وہ مسکراتی اور دوڑتی ہوئی اپنی کھیلنے میں مصروف دوستوں کے پاس جا پہنچی۔

سپیس کروزر گاڑی واپس آگئی اور ہم کانسٹن کے قریب لائل لینڈ میل میں ایک دور افتادہ فارم ہاؤس کے لئے روانہ ہو گئے۔ جم نے بتایا کہ ساری رڈ لے فیملی اس وقت وہاں موجود ہوگی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور

دے رہا تھا اور مجھ پر ایسے لمحات گزر چکے تھے کہ میں سوچتی تھی اس عظیم الشان پل کو میں دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔

جب میں نیوز روم میں پہنچی تو تمام شناساچروں کو دوبارہ دیکھنا بڑا عجب لگا۔ ان کے تاثرات کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے رفقاء کار میں سے بعض کا گمان تھا کہ وہ مجھے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

مارٹن ناؤن سینڈ قریب آیا تو میں اس کا وزن کم ہو جانے کی طرف اشارہ کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے کہا ”ہم جہنم رسید ہو گئے تھے بہر حال بچ نکلے۔“ پھر میں نے اپنی ای میل چیک کی تو چار سو سے زائد پیغامات موجود تھے، ان میں سے بیشتر خوشگوار تھے لیکن تین بے حد ناگوار نکلے۔ اسی حساب سے میں نے ان کا جواب لکھ دیا، اور ان تین ناگوار پیغامات کا بھی اخبار کے ڈائری تجب پر حوالہ دے دیا۔

میری وائس میل مشین بھی فل تھی، اس لئے میں نے سارے پیغامات سنے۔ زیادہ تر دوستوں اور خیر خواہوں کی طرف سے تھے، اور کچھ ”انٹرنیشنل تھرڈ پوزیشن“ کے فاسٹ گروپ کی جانب سے گھناؤنے پیغامات بھی تھے۔ میں مسکرا دی، مگر دل میں فیصلہ کر لیا کہ ان نازی حرامزادوں کو مزہ اچکھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

اس رات شراب خانے میں بہت بلاگلا تھا، زبردست قہقہے بگ رہے تھے، ”میڈ ہیڈ پب“ کے مینجر نے بھی ترنگ میں آکر کہا کہ میں اس کے پب کی تیار کردہ سستی شراب کی پیشکش کرتا ہوں۔ اس پر میرے دوستوں میں سے بعض نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، جاؤ دفع ہو جاؤ، ایک اکھڑتھم کے دوست ”سٹوکر شا“ نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”یہ دو ہفتے کی سیر کے لئے افغانستان گئی اس کی خوشی میں وہ شراب کا ایک گلاس پینے لگی ہے تم یہاں بیٹھے بٹھائے مفت شراب کیوں بانٹ رہے ہو۔“

اس ویک اینڈ پر میں نے اخباروں کے تراشے پڑھنے شروع کر دیئے، جو مجھے دکھانے کے لئے دوستوں نے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ایسا تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ کسی کو اپنے تعزیت نامے پڑھنے کا موقع مل جائے مگر مجھے مل گیا تھا۔ ان دوستوں نے جن کے لئے میری واپسی متوقع نہیں تھی بڑے رقت انگیز تعزیتی جملے لکھے تھے۔ سب سے بہترین تعزیت نامہ ”ویلز آن سنڈے“ کے چیف رپورٹر مارٹن شپٹن کا تھا۔

کے لئے وقت لے لیا۔ اس وقت وہ سات ماہ کے حمل سے تھی، اور اس سے یہ پوچھنے کے لئے دمشق پہنچی کہ کیا ”لا کر بی“ کے فضائی حادثے میں اس کی تنظیم کا ہاتھ تھا؟

جب وہ 1993ء میں ”ویلز آن سنڈے“ کی ڈپٹی ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالنے کے لئے کارڈف میں منتقل ہوئی تو داؤد کے ساتھ اس کے تعلقات شدید دباؤ کا شکار ہو گئے۔ اس کے آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزر رہا تھا کہ اس وقت کے ایڈیٹر کی بیماری کی یہ تشخیص ہوئی کہ اسے کینسر لاحق ہو گیا ہے، جس پر اس نے طویل چھٹی لے لی۔ ایڈیٹر کا چارج سنبھالنے کے بعد وہ ایسا کرتی کہ کام نمٹانے کے بعد ہفتے کے روز لمبا سفر کر کے نیوکیسل جا پہنچتی جہاں داؤد اور ڈیزی رہتے تھے اور پھر کی سہ پہر کو واپس آ جاتی۔

اگست 1995ء میں یو آنے، ویلز کو چھوڑ کر ایک نیا کیریئر شروع کرنے کے لئے فلیٹ سریت پہنچ گئی، جہاں اس نے کونا کون اخباروں میں کام کیا، شروع میں اسے کچھ بدقسمتیوں سے بھی سابقہ پڑا، اس نے مردوں کی فوقیت پر مبنی معاشرے کی اذیتیں برداشت کیں اور علاقائی ذہنیت رکھنے والے صحافیوں کی تحقیر کا بھی شکار ہوئی۔ اس کی اس وقت بھی سخت حوصلہ شکنی ہوئی جب ایک نیوز ایڈیٹر نے سیرالیون میں غیر قانونی اسلحہ کی فروخت کے بارے میں اس کی بنائی ہوئی خبر کا تمسخر اڑایا۔ چند غمتوں کے بعد اسے کہا گیا کہ وہ شاف کے ایک رکن کی خاطر اپنی نوٹ بک خالی کر دے، جس نے بالآخر وہی خبر خود بتائی تھی۔

تاہم پچھلے سال سے اس نے ”سنڈے ایکسپریس“ کو اپنے لئے ایک محفوظ ٹھکانہ بنا رکھا تھا متعدد بلا شرکت غیرے خبریں (exclusives) لانے کی وجہ سے چیف رپورٹر کے عہدے پر ترقی پا چکی تھی۔ داؤد کے ساتھ اس کے تعلقات افسوسناک طور پر ختم ہو گئے اور ایک اور شادی بھی ناکام ہو چکی تھی اور وہ آجکل کسی پارٹنر کے بغیر رہ رہی تھی۔

جیسا کہ وہ پہلے کرتی رہی ہے، وہ اپنے پیشے کی خاطر اپنی جان کو کسی بھی خطرے سے دوچار کر دیتی تھی، یہ ہر مشکل کو اپنے لئے چیلنج سمجھتی تھی، لیکن اسے جو مشکل اب پیش آئی تھی، اتنی سخت کوئی بھی نہ تھی۔

یو آنے ماضی میں چمک کر سابقہ حالت میں واپس آنے کے متعدد مظاہرے کر چکی تھی، مجھے امید تھی کہ وہ بہت جلد اپنی زندگی کی عظیم ترین سنوری لکھنے کی پوزیشن میں واپس جائے گی۔ مگر.....

بعد ازاں میں نے مارٹن شپٹن سے بات کی تو اس نے کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے مجھ سے دوبارہ مل سکتے یا گفتگو کا موقع ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

ذیل میں فری لانس جرنلسٹ جان سوینے کے تعزیتی الفاظ پڑھئے:

جلال آباد میں طالبان کی جیل میں رائے سریت فیئرنگڈن جیسے ماحول کی توقع تو نہیں کی جاسکتی مگر میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تھوڑی بہت رشوت دیدی جاتی تو اس کی ٹیلی فون پر گھر سے بات چیت آسانی ہو جاتی۔

ہر قیمت پر خبر کرید لانے والی ”آبزور“ کیا یہ ناز صحافی ایک تاریک کمرے میں بند ہے اور وہاں طالبان کی مہمان کے طور پر وقت گزار رہی ہے۔

طالبان نے یو آنے رڈ لے کو اس کے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران پکڑا تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک صحافی تھی، اگر وہ جیسا کہ الزام لگایا گیا ہے کہ برٹش پشیل فورسز کے لئے کام رہی تھی، تو پھر میں ایک مرغابی ہوں۔

تقریباً دو ہفتے ہو گئے ہیں کہ اس کی نہ آواز سنی اور نہ شکل دکھائی دی، پتہ چلا کہ اسے سنڈے ایکسپریس کے لئے کام کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس وقت سے اس کی 9 سالہ بچی ڈیزی ماں کی آواز سننے کو ترس گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہوں کہ خبروں کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لے لینے اور طالبان کی جیل میں وقت گزارنے پر تیار ہو جانا، پاگل پن تھا۔

لیکن چائے اور نمکین بسکٹوں کی قیمت کے رپورٹروں نے کبھی کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ میرے قابل احترام رفیق کار، بی بی سی ورلڈ فیروز کے ایڈیٹر جان سمپسن نے کئی بار عورت کا لباس پہنا اور برقع اوڑھ کر افغانستان میں داخل ہوا اور خبریں لے کر آتا رہا۔ اسے کوئی قابل اعتراض سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے۔ لیکن اس نے اس لئے جان کا خطرہ مول لیا کہ یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔

میں نے اپنے کیریئر میں جیسا کہ یہ ہے، کئی بار خود کو لارڈ سوینے، ظاہر کیا پھر ایک چیچن باشندے، ایک انجینئر، جڑیا گھر کے منتظم، اور ایک تھیٹر کیل ایجنٹ کا روپ دھارا اور ایک بار تو میں نے خود کو صدر ”بو پھو تھاٹسوانہ“ (اس نام کا کوئی ملک نہیں پایا جاتا) ظاہر کر کے پروٹوکول لے لیا اور مطلوبہ خبریں حاصل کر لیں یہ ایک لمبی اور دلچسپ کہانی ہے۔

ایک دفعہ ڈیورونیک (جنوب مغربی یوگوسلاویہ) کے محاصرے سے باہر نکلنے کے لئے میں کشتی کے زنا نڈا ٹائلٹ میں چھپ گیا، اگر سرب مجھے گرفتار کر لیتے، کس کو پتہ ہے کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔

وقت انگیز تعزیت نامہ

اسی طرح ایک فری لانس جرنلسٹ جان سوینے نے ایک تعزیت نامہ لکھا، وہ چھپ نہ سکا تھا تاہم آج ہم اسے پڑھ سکتے تھے۔ پہلے مارٹن شیٹن کا تعزیت نامہ پڑھئے:

”جب جمعے کی سہ پہر کو مجھے بتایا گیا کہ یوآنے رڈ لے افغانستان میں گرفتار کر لی گئی ہے تو مجھے ذرہ بھر بھی حیرت نہیں ہوئی۔ ان 24 برسوں میں، جب سے پہلی بار ہماری ملاقات ہوئی، ہم دونوں شمال مشرقی انگلینڈ میں زیر تربیت رہپورٹرز ہوا کرتے تھے وہ ہمیشہ خطرات مول لیتی رہی ہے اور اکثر صرف بال بال بچتی رہی ہے۔

مید ہے کہ اس کی تقدیر اسے اس منحوس گھڑی میں بھی ثابت قدم رکھے گی۔ یوآنے، 1970ء کے عشرے کے آخری سالوں میں ”ویک اینڈ“ سکولوں میں زیر تربیت نوجوانوں میں سے تھی، ہم میں سے زیادہ تر وہ پر عزم لوگ تھے جو برطانیہ بھر کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹ تھے اور صحافت کو ایک مشن سمجھ کر اس میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ یوآنے، یونیورسٹی سے ہوتی ہوئی نہیں آئی تھی اور اسے میڈیا کے تخیلاتی تصورات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف صحافی بننے کی تربیت حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ غیر معمولی اطلاعات حاصل کرے، ان کے بارے میں لکھے اور ایسا کرتے ہوئے لطف اٹھائے۔

وہ پارٹیوں میں آپے سے باہر ہو جانے والا جانور تھی، جو اپنی ذاتی کشش و جاذبیت کا مظاہرہ کرتی ہوئی چوٹی پر جا پہنچتی تھی۔ وہ رت جگے کرتی اور بالآخر زیادہ شراب پی کر میز کے نیچے ڈھیر ہو جانے والے مردوں کو جگاتی اور ٹاشٹے کے لئے چکنائی بھرے چمچوں والی کیفے میں پہنچا دیتی تھی۔

اس کے کینئریر کا ابتدائی حصہ شمال مشرق کے کونا کونا اخباروں ”سٹیلے نیوز“، ”ناردرن ایکو“، ”دی جرنل“ اور ”سندھ سن“ میں کام کرتے گزرا۔ 1980ء کے عشرے میں نیوکیسل اس کی اقلیم (Domain) بن گیا، جہاں اس نے سطح زمین کے نیچے اتر کر اس شہر کے منظم جرائم کے احوال کو منظر نامہ پر لانا، اپنا ایک معمول بنالیا۔ اس نے منشیات کی تجارت اور اس میں ملوث مجرموں کی پشت پناہی کرنے والوں کے راز فاش کئے اور ان کی باہمی چپقلشوں کی کہانیاں بھی لکھیں۔

کئی بار میں بھی اس کے ہمراہ اس پر اسرار دنیا میں گھوما پھرا ہوں، وہی بڑی بے تکلفی سے ان لوگوں میں گھل مل جاتی تھی جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مقامی جتھوں کے لیڈر ہیں۔ وہ اس میں بے پناہ کشش پاتے اور اسے اپنے قریب تر لانے کی کوشش کرتے، غالباً اس لئے کہ یہ اپنے جنسی حسن کو بروئے کار لانے میں ذرا بھی نہیں جھجکتی تھی اور ثابت کر دیتی تھی۔ کہ اسے کسی کا خوف نہیں ہے۔

1980ء کے عشرے کے آخری حصے میں اس کے لئے ایک ایسی سنوری میں دلچسپی پیدا ہو گئی، جو اس کے لئے نہایت خطرناک نتائج کی حامل تھی۔ چند سال پہلے شمال مشرق سے تعلق رکھنے والا ”ایان ڈیولین“ نامی شخص جو کسی خاص وجہ کے بغیر باغی بنا ہوا تھا، تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) میں شامل ہو گیا، تنظیم نے اسے ایک مشن دے کر قبرص بھیج دیا، جہاں اس نے پی ایل او کے چند دوسرے ارکان کی مدد سے ایک کشتی اغوا کر لی اور اس میں سوار تین یہودیوں کو قتل کر دیا جو مبینہ طور پر اسرائیل کی اتھلی جنس سروس موساد کے کارکن تھے۔

ڈیولین قبرص میں قید کے دن کاٹ رہا تھا اور یوآنے جیل میں جا کر اس کا خصوصی انٹرویو کرنا چاہتی تھی، اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اسے نکوشیا میں پی ایل او کے سفارت خانے سے ربط و ضبط قائم کرنا پڑا جس میں اس کی کشش اور جاذبیت نے مطلوبہ نتائج پیدا کئے اور وہ ڈیولین سے انٹرویو لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس میں بھی اس کے لئے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ پی ایل او کے کرٹل داؤدزارورہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور وہ قبرص چھوڑ کر اس کے ساتھ رہنے کے لئے نیوکیسل چلا آیا جس سے اس کے ہاں بیٹی، ڈیزی پیدا ہو گئی اور وہ آنے والے بدھ کے روز پورے 9 سال کی ہو جائے گی۔

داؤدزارورہ نے کچھ عرصے کے لئے اپنا نام انگریزوں سے مشابہ ”ڈیوڈ“ رکھ لیا۔ اس سے ملاقات ہونے تک یوآنے رڈ لے کی ذاتی زندگی بے لگام گھوڑی کی سی تھی، اس سے پہلے وہ دونا کام شادیوں اور متعدد غیر تسلی بخش تعلقات کے تجربوں سے دوچار ہو چکی تھی۔ اسے صرف اپنے کام میں محنت و انہماک ہی میں سکون ملتا تھا۔

داؤد کے ساتھ گزرنے والے وقت نے اسے ایک نئے استحکام کے حصول میں مدد دی۔ وہ نیوکیسل میں ہی آباد ہو گیا جہاں وہ اب ”نارتھ آف انگلینڈ ریویو جی سروس“ کے چیف ایگزیکٹو کے طور پر کام کر رہا ہے۔ یہ بہت ذہین اور مہذب شخص ہے جو پی ایل او کے زیر قبضہ لبنانی حصے میں کچھ عرصہ نہایت مؤثر کمان کرتا رہا، اس کے پاس اتنی ہی وافر سٹوریج تھی جتنی یوآنے کے پاس ہوں گی۔

یوآنے نے داؤد کے رابطوں کے ذریعے پی ایل او کے پاپولر فرنٹ کے سربراہ احمد جبریل سے ایک خصوصی انٹرویو

گارڈین کی رپورٹ اور میری دوست میگی اوکین بسوں میں بوسینا آتی جاتی تھی اور خود کو کھنکھاس ایک ہاؤس وائف ظاہر کرتی تھی، وہ اس امید پر پاسپورٹ کو کمر کے پیچھے چھپا لیتی تھی کہ پاسپورٹ کسی نے چیک کرنا ہے۔

1990ء میں ایک بار سٹالینٹ البانیہ کی سرحد پر 17 افراد کو روک لیا گیا وہ ایرین آنا قدیمہ کا دورہ کرنے کے متمنی تھے، ان ستر ہمیں ایک تھیٹر ریکل ایجنٹ، ایک ماہر تعمیرات، ایک فینسی گڈز کا سیلز مین، میں، میگی اور سکاٹی نیوز کا کیمرہ مین بھی شامل تھا۔ تمام اچھے رپورٹرز خطرات مول لیا کرتے ہیں، یوآ نے خواہم خواہ پکڑ لی گئی۔

میں اسے اس وقت سے اچھی طرح جانتا ہوں جب ہم دونوں ”آبزور“ میں ہوتے تھے۔ یہ دنیا کا قدیم ترین اور مدہ ترین اخبار چلا آ رہا ہے، اور 1791ء سے داستان طرازی کا بزنس کر رہا ہے اور یوآ نے ایک ہنسوز داستان کو ہے۔

وہ کوچ پر سامعین میں گھری ہوئی بیٹھ کر کہانیاں سنایا کرتی تھی جو اخبارات کے مالکان کے ساتھ اس کی تازہ ترین جھڑپوں سے متعلق ہوتیں یا اس کی حیرت انگیز محبتوں بھری زندگی کی دلچسپ روئادیں ہوتی تھیں۔

وہ انگلستان کے شمال مشرقی خطے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی تعلیم، کہنے والوں کے مطابق، عملی زندگی کے تجربات سے اخذ شدہ تھی غرور اس میں نام کو بھی نہیں تھا اور اسے ہمہ دانی کا دعویٰ بھی نہیں رہا۔ لیکن بعض اوقات ثقافتی حوالہ سے غیر متوقع صورتحال سے دو چار ہو جاتی تھی۔ ”آبزور“ کے دفتر میں ایک کمپیوٹر فائل ہے جسے ”کوٹ

کوٹ“ (quot quot) کہتے ہیں۔ یہ چند ”نثر مندہ کن الفاظ“ کی ایک فہرست ہے۔ ایک آپ نے کبھی ایسا جملہ بولا ہو جو کسی قدر احمقانہ معلوم ہوتا ہو تو اس ”کوٹ کوٹ“ کی فہرست پر نظر دوڑائیے تو اس میں سے اخذ کرنے کے لئے یوآ نے کے بارے میں میرا پسندیدہ ترین جملہ یہ ہوگا ”یوآ نے کو سنڈے نامنر کے کلچرل سیکشن کو نہ پڑھنے

سے بہت سے فائدے حاصل ہوئے تھے۔ یہ سفید شراب تھی، اسی لئے خطرناک تھی، مگر اس کا دل خالص سونا تھا۔“ مجھے اب بھی سنائی دے رہا ہے کہ وہ ایک کہانی کے پیچ کھول رہی ہے، اس کے سامعین رویتے رویتے قہقہے بھی بکھیر رہے ہیں۔ وہ بد قسمتی کی ظالم دستکوں کا ذکر کرتے ہوئے بتا رہی ہے کہ وہ کس طرح راستے سے ہٹ کر زد

میں آنے سے بچ گئی تھی۔

آبزور کی پارٹیاں کچھ پر تصنع ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ وہ ایک اپنے رفیق کار کی لکھی ہوئی کتاب کی تعارفی تقریب میں ایک ایسے شخص کے ساتھ آئی جس نے اس کا بازو تھاما ہوا تھا اور وہ غالباً سارے انگلینڈ مشہور (اور بدنام) ترین دم پھینک آدمی تھا۔

یوآ نے ایک ورلڈ کلاس کردار ہے جس نے سارا میلہ لوٹ لیا ہے۔ میرے کان میں جب پہلی بار اس کے پکڑے جانے کی خبر پڑی، مجھے اچانک ایک دھچکا لگا، پھر میں مسکرا دیا۔ بعد ازاں اس کے حلقہ یاراں میں سے، ایک کو میں نے ای میل کی، وہ آبزور، بہتر ٹائٹ لائر ہے، الفاظ یہ تھے: ”مجھے طالبان پر ترس آتا ہے۔“

ہمیں امید ہے کہ طالبان ہوش کے ناخن لیں گے اور ہماری رفیق کار کا جلد رہا کر دیں گے۔ دریں اثنا یہ اپنی جگہ کی بات ہے اور بہت اہم نقطہ ہے کہ صحافی جنوبی حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟ بلاشبہ ہم بہترین سٹوریٹس پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ایسی سٹوریٹس وہ ہیں جنہیں کہ طاقتور لوگ، جو خطرناک حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کی تشہیر نہیں

چاہتے۔

اور اے یوآ نے اگر کسی طلسم کی مدد سے افغانستان میں اپنی جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی تم میری باتیں سن رہی ہو، تو جان لو کہ تمہارے تمام دوست جانتے ہیں کہ جو کچھ تم نے کیا، وہ کیوں کیا ہے؟ ہم شدید انتظار میں ہیں کہ تمہارے تازہ ترین حالات کا کچھ پتہ چل سکے۔

دونوں خراج عقیدت یا خیر خواہانہ خواہانہ تحریریں متاثر کن ہیں، لیکن مجھے یہ کہنے سے خوشی ہو رہی ہے کہ میں ایک کڑی آزمائش میں سے زندہ سلامت نکل آئی ہوں اور مجھے آج سب کچھ بتانے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ میری کہانی کا صرف اختتام ہو سکتا تھا اور اس کتاب کا بھی اچھا انجام ہو سکتا تھا، لیکن واقعات کا ایک تسلسل ہے جس نے مجھے

بہت مغموم اور نرسدہ کر کے رکھ دیا ہے۔

ہوئی تھی۔

میں چیخ اٹھی ”یہ کیسی بے ہودگی ہے، اگر افغانستان کے اندر داخل ہوتے وقت اپنا پاسپورٹ تک لے کر نہیں گئی تو اسرائیلی دستاویزات لے کر کیوں اندر جاتی؟“ ناصر مسکرایا اور پھر فاتحانہ انداز میں میری، ہرموش (میں اب بھی اس کے نام کا پہلا جزو استعمال کرنا برداشت نہیں کرتی) اور ڈیزی کی وہ تصویر نکال دکھائی جو کشتی میں سفر کے دوران کھینچی گئی تھی۔ وہ بولا ”یہ ایران کے ایک دریا میں اس وقت کھینچی گئی تھی جب آپ لوگ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہوئے تھے۔“ میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تب مجھے یاد آیا کہ میری گرفتاری کے کئی دن بعد طالبان کے تفتیش کاروں نے کہا تھا کہ ان کے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے کہ میں ایران میں رہ چکی ہوں۔

میں سوچ میں پڑ گئی، یہ کون تھا جو میری تصویر بنانے میں اس تندہی سے لگا ہوا تھا؟ میں نے تصویر پر ایک اور نظر ڈالی اور مسکرا کر کہا کہ یہ اکتوبر 1998 میں جنوبی وارویک شائر (انگلینڈ) کے قصبہ ”سریٹھو رڈ این ایون“ کے دریا نے ”ایون“ میں کھینچی گئی تھی۔ میری طبیعت اتنی مملکت رہوئی کہ قے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے ذہن پر زور ڈالا کہ یہ تصویر میں نے کہاں رکھی تھی؟ یاد آیا کہ یہ میں نے ”سوہو“ میں اپنے نئے فلیٹ کی سب سے اوپر کی دراز میں ڈال دی تھی۔

یہ تصاویر بننے کے چند ہفتوں کے بعد میں نے اپنے شو ہر نمبر 3 کو دھکے مار کر نکال دیا تھا۔ اور یہ اس کے جانے کے بہت بعد تک ڈیویڈپ نہیں کرائی گئی تھیں۔ تو پھر میرے فلیٹ میں کون رہا تھا؟ پھر مجھے لوہار کی وہ بات یاد آئی جو اس نے میری بہن سے کہی تھی۔ اس سے میں اپنے دل میں شدید بے چینی محسوس کرنے لگی۔

ناصر اس وقت اس کتے کی مانند تھا جس کے منہ میں ہڈی پکڑی ہوئی ہو۔ پھر اس نے کہا ”ہمارا خیال ہے کہ یہ یقیناً انٹیلی جنس کی فراہم کردہ ہیں، ہم پر ان تصاویر کی بو چھاڑ کر دی گئی تھی لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ان میں کچھ جعلی ہیں یا نہیں ہیں۔ یہ فائل دراصل قطر میں ہمارے ہیڈ کوارٹر کو بھیجی گئی تھیں پھر وہاں سے مجھے بذریعہ ای میل اور فیکس موصول ہوئیں۔“

”یہ کام بڑی محنت اور سرگرمی سے کیا گیا ہے، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ غالباً طالبان انٹیلی جنس کے پاس بھی یہی فائل ہے، یہ بہت پیچیدہ معاملہ ہے، اس کا مقصد یا تو تمہیں استعمال کرنا یا پھنسانا تھا، دونوں میں سے کوئی بھی صورت ہوئی اس کے نتائج بہت سنگین ہونا تھے۔“

میں نے سوچا، ”سنگین نتائج“ محض نرم سی بات ہے، اس کا اصل مقصد تو فوراً پھانسی تھا۔ میں نے چند ایسے دوستوں اور رابطہ کاروں کو فون کئے جن کا جاسوسی کی گھناؤنی دنیا سے تعلق تھا یا وہ اس سے رابطہ رکھتے تھے، اور انہیں ساری صورت حال سے مطلع کر دیا۔ میرے وائٹ ہال (حکومت برطانیہ کے دفاتر) کے اندر کام کرنے والے ایک رابطہ کار نے کہا ”یہ سب کچھ امریکن انٹیلی جنس کی کارستانی ہے، اوہ میرے خدا، اگر آپ وہاں سے تابوت میں گھر آتیں تو رائے عامہ فوری طور پر طالبان پر بمباری کے حق میں ہو جاتی۔ تاہم یو آنے، میں اسے ذاتی طور پر نہیں لیتا“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔ وہ تو یہی کہہ سکتا تھا، مگر میں کہتی ہوں کہ یہ گھناؤنا فعل، برطانوی انٹیلی جنس ہوسا دیا کسی اور غیر ملکی ایجنسی کا بھی تو ہو سکتا تھا۔

پھر مجھے چیئرمین فیلڈ کے لیبر رکن پارلیمنٹ ٹونی بین سے اپنی وہ گفتگو یاد آئی جو بی بی سی کے ”نریک فاسٹ وڈ فراسٹ“ شو کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے سنڈے ایکسپریس میں چھپی ہوئی روداد ”میرا افغانستان میں گزرا ہوا وقت“ بھی پڑھ لی تھی، اس نے مجھے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے صحافت کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے اس نے کہا ”تم نے افغانوں کے انسانی چہرے کو نمایاں کیا ہے جب کہ مغرب کئی ہفتوں سے انہیں شیطان کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، انہیں شیطانی شکل میں پیش کر کے بھوں کا نشانہ بنانا آسان ترین بات تھی، تم نے بہت اچھا کیا ہے کہ اس کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔“

اس کی بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، ٹونی بین ہمارے دور کا عظیم ترین مبلغ امن، ممتاز مقرر اور بے حد دانشمند سیاستدان ہے۔

بات بڑی واضح ہے کہ اگر وحشی طالبان مجھے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیتے، اور میرے ٹوٹے ہوئے بدن کو بکس میں بند کر کے بھیج دیتے، یا الجزائرہ ٹی وی پر میری پھانسی کا منظر دکھا دیتے، مغرب کو ان کے وحشی ہونے کا ایک اور ثبوت مل جاتا۔

میں نے واپسی پر لندن میں ایک مسلم مذہبی رہنما سے مشورہ کیا تو اس نے کہا.... ”اگر طالبان کو اس فائل کے مواد کے صحیح ہونے کا یقین آ جاتا تو میرے خیال میں وہ آپ کو بطور ذریعہ سودا بازی، قید ہی میں رکھ لیتے آپ کو افغانستان کے پہاڑوں میں غائب کر دیتے اور آپ سے مفید مطلب معلومات اگلوانے کی کوشش کرتے۔“

مقام شکر ہے کہ طالبان کی انٹیلی جنس کے حکام اتنے احمق نہیں تھے، مجھ پر واضح ہو گیا ہے کہ انہوں نے مجھے کیوں

مجھے جاسوس ثابت کرنے کی سازش کہاں تیار ہوئی

میرا معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آنے کی کوشش کرنا (اگرچہ مجھے یقین نہیں کہ میری زندگی میں معمول والی کوئی بات ہے) ایک مشکل کام تھا کیونکہ مجھے احساس ہے کہ یہ اب بھی ایک ادھوری اور ناقص (unfinished) کارگزاری ہے۔ میری گرفتاری نے اس خطے میں میرے کام میں رخنہ ڈال دیا اور افغانستان سے میری واپسی، جو بالآخر ہو ہی گئی، بہت تیز رفتار تھی۔ جب کہ پاکستان سے میری روانگی بھی اسی عجلت میں ہوئی۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ میں پاشا کو مناسب طریقے سے الوداعی کلمات کہتی۔

میرے لئے حالات کے مطابق ڈھلنا بہت مشکل رہا ہے، ہر کوئی جانتا ہے کہ میڈیا کے شعبے میں کیا ہو رہا ہے، میری زندگی میں سے دس دن غائب ہو چکے ہیں۔ میں اب بھی اس تصویری معصے کی خالی جگہوں کو پُر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

بعض جگہیں قہقہہ آور تھیں۔ جب میں نے اپنے بارے میں پیشل فورسز کی رکن ہونے کے متعلق چھپنے والی خبریں پڑھیں تو ان میں ہلکے پن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں یہ پڑھ کر بھی محظوظ ہوئی کہ طالبان نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ میں پیشل فورسز میں سے ہوں۔ میں تو "SAS" کا میٹرل ہی نہیں ہوں، خاص طور پر جب تم اس بات پر غور کرتے کہ میں ایک ہی جگہ بیٹھ کر کتنے ہی سگریٹ پھونک دیا کرتی ہوں۔ تاہم طالبان کے حوالہ سے مجھ پر جاسوسی کے الزام کی تشہیر بہت سنگین اور امکانی پر ایک تباہ کن بات تھی۔

اخبارات کے دفاتر میں افواہ سازی اور ظریفانہ کہانیاں گھڑنا ایک عام بات ہے مگر بعض اوقات یہ افواہیں بہت شرانگیز اور سفاکانہ روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسے ظالمانہ مذاق کرنے والوں میں ایک قابل ذکر شخص "ڈیلی ایکسپریس" کا انتھونی مچل تھا۔ جب اس کی خفیہ شادی کے منصوبے کی بھنک نیوز روم میں ملی تو وہ بہت غضبناک ہوا تھا اور جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ مجھ تک یہ لنڈن گپ، گریگ سوٹ (Swift) نے پہنچائی ہے تو وہ مزید طیش میں آگیا۔ میں نے فوری طور پر پادری کو فون کیا تھا کہ اس بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔ انتھونی مچل کو اس کا پتہ چلا تو اس کے دل میں رنجش گھر کر گئی اور اس نے ہمیں کبھی معاف نہیں کیا۔ افغانستان میں میری گرفتاری کے دوران گریگ سوٹ ہی شمالی اتحاد کی لائنوں سے جنگ کی خبریں حاصل کر رہا تھا۔

انتھونی نے جب کہا کہ "میرا دل تو اس وقت خوش ہوگا جب سوٹ کو کوئی آگے لگے گی۔" اس پر دفتر میں قہقہوں کا لاوا پھوٹ پڑا کہ اس نے اپنی رنجش کا کیسے اظہار کیا ہے۔ واہ رہے انتھونی!

دو تہذیبوں کا اصل فرق

ان دلچسپ حکایتوں کے ماحول اور دس دن تک طالبان کی طرف سے انتہائی احترام اور پر شفقت برتاؤ سے ہونے والی میری خوشی اس وقت غارت ہو کر رہ گئی جب میں لندن میں ایک سیاہ کیب میں سوار ہوئی۔ اس کے ڈرائیور نے جو "ایسٹ اینڈ" کا رہنے والا تھا، اخبارات میں چھپنے والی تصاویر کی وجہ سے مجھے پہچان لیا۔ اور بولا

"کیا تم وہی چٹیا ہو جسے طالبان نے اپنے پنجرے میں بند کر دیا تھا؟" میں نے ہاں میں نے سر ہلایا تو اس نے کہا: "تو کیا انہوں نے تجھ سے جنسی فعل کیا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا: "مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو تجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیتا۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میرے خیال وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے حسن کو خراج تحسین پیش کر رہا ہے،... مہذب دنیا میں واپسی خوش آمدید، یو آنے... میں سوچتی رہ گئی۔ یہ تھا فرق دونوں تہذیبوں میں۔

اس معصے کے بعض اجزاء بلاشبہ نظروں سے اوجھل رہیں گے۔ اور بعض اجزاء کے بارے میں سوچتی ہوں کہ کاش میں انہیں نہ اٹھاتی اور نہ ہی اس تصویر میں جوڑتی۔ مثال کے طور پر ایک گروہ نے کراؤن پلازا میں میرے کمرے میں گھس کر بعض چیزیں اٹھا لیں، جن میں میری "ایجنٹ پروویسٹ پر فیوم" بھی شامل تھی۔ ڈینس رائس نے جو ڈیلی ایکسپریس میں کام کرتا ہے، میرے واپس آنے کے بعد مجھے بتایا کہ میرے ہوٹل بیڈ روم میں داخل ہوتے وقت ڈیوڈ سمیتھ کے آگے آگے اٹلیس ٹیلی ویژن کا عملہ تھا۔ لیکن مجھے جو خا کہ بتایا گیا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اٹالینوں کے آگے آگے کوئی اور تھا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طالبان کے پردے میں یہ کوئی اور گروہ پاکستان میں کام کر رہا ہو، یا صحافیوں ہی کا کوئی گروہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا رہا ہو۔ میں نے انہیں اپنے کمرے کا نمبر اس لئے بتا دیا تھا کہ میرے پاس چھپانے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ میرے کمرے سے نہ رقم نکالی گئی اور نہ کریڈٹ کارڈ اٹھایا گیا، میرا پاسپورٹ بھی جہاں تھا وہیں پڑا رہا۔ میرے رابطہ کاروں کے ناموں والی نوٹ بک اٹھالی گئی اور بعض کاغذات بھی اوپر نیچے کر دیئے گئے۔ علاوہ ازیں میرا بیڈ جو میں نے نکتے وقت تہہ کر دیا تھا، وہ بھی پیچھے ہٹا ہوا تھا اور اس کی تلاشی لی گئی تھی۔

جب میں ”سوہو“ میں اپنے فلیٹ میں واپس آئی تو ”ویونہ“ نے کہا کہ وہ یہاں داخل ہو گئی تھی کیونکہ کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا کہ میں کب تک قید رہوں گی۔ اس نے ایک لوہار کو بلوایا تھا، جس نے تالے بدلنے کے 70 پاؤنڈ کا کوٹیشن دیا تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اسے میٹرھیوں کے نیچے کے دو سیکورٹی تالوں اور میٹرھیوں کے اوپر میرے فلیٹ کے تین تالوں کی توقع نہیں تھی۔ چنانچہ ایکسپریس نیوز پیپر نے اصل کوٹیشن کے تقریباً پانچ گنا زائد مزدوری ادا کی۔ ویونہ نے کہا ”میں نے پہلے ایسی بات کبھی نہیں دیکھی“ لوہار سرجن کی طرح کام کر رہا تھا، وہ اندر داخل ہونے کے لئے تاریں اور شیشے استعمال کر رہا تھا، یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ جب میٹرھیوں سے اوپر تمہارے فلیٹ کے دروازے پر پہنچا تو پھر کچھ تاریں استعمال کیں اور ہر تالے کو کھولنے کے لئے کئی چیمبر زٹوڑے، اس نے مجھے بتایا کہ شاید تم سے پہلے اس کی چابیاں گم ہو گئی تھیں۔ کیونکہ یہاں کوئی اور یہی کچھ کرتا رہا ہے جو وہ اب کر رہا ہے۔“

میں نے اسے یہیں فوراً روکا اور کہا کہ سٹوری مجھے پھر سے سناؤ ”لیکن ویونہ میں یہاں ایک سال سے زائد عرصہ سے رہ رہی ہوں، میں نے اس کے تالے بدلوائے تھے مجھ پر باہر سے تالا کبھی بند نہیں ہوا۔“

میرے لئے اس سے ایک نئی تشویش شروع ہو گئی۔ میں نے لوہار سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا لیکن وہ کسی خاص سمت میں میری رہنمائی نہ کر سکا۔

اس روز ڈینس نے مجھے بتایا کہ نیلی وین کے الجزیرہ چینل نے ایران میں میری، ڈیزی اور ہرموش کی تصویر دکھائی تھی، مجھے پہلے تو اس پر ہنسی آئی، پھر میں نے اس کے نتائج پر غور کیا۔ پتہ نہیں طالبان نے وہ بلیٹین دیکھے تھے یا نہیں۔ الجزیرہ کو ان دنوں بڑی پذیرائی حاصل ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ اس پر دکھائے جانے والے اسامہ بن لادن کے انٹرویوز اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کے باعث نہ صرف مسلمانوں بلکہ لاکھوں دیگر افراد کے لئے بھی اسے دیکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ افغانستان میں نی وی کی ویسے تو ممانعت ہے پھر بھی حکمران طالبان نے اسے دیکھنے کا انتظام کر رکھا ہے۔

میں الجزیرہ چینل والوں پر بہت برہم ہوئی تھی کیونکہ اس سے تو میری جان پر بن سکتی تھی۔ طالبان جاسوسی کا شبہ ہو جانے پر کبھی کسی کو معاف نہیں کرتے۔ وہ مجھے بہ آسانی ٹینک کی توپ کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دیدی اور دوسروں کی عبرت کے لئے لاش سارا شہر پھراتے۔

میرے اصل دشمن کون تھے

میں نے فوراً نی وی سٹیشن کے قطر ہیڈ کوارٹر کو فون کر کے چیف ایڈیٹر سے کہا ”میں صرف یہ جانا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے پھانسی چڑھوانے کی کیوں کوشش کی تھی آپ نے اوپر تلے دو بلیٹنز میں مجھے اتنے بڑے بڑے ایکسپوزٹ رکیوں دیئے تھے اور پھر آپ نے بلیٹنز اچانک کیوں روکے تھے؟“

اس نے انکشاف کیا کہ الجزیرہ کو دو انتہائی مستند دکھائی دینے والی دستاویزات موصول ہوئی تھیں جن میں میرے جاسوس ہونے کا قومی امکان موجود تھا چنانچہ انہوں نے سٹوری چلانے کا فیصلہ کر لیا جب کہ لندن کے حکام نے بھی اس کی مزید چھان بین کر لی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ایک انٹرویو دے دوں گی، میں فوراً رضامند ہو گئی تاکہ میں اپنا کام مکمل کر لوں اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مجھے ان دستاویزات پر ایک نظر ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔

کئی دن بعد میں الجزیرہ کے دفاتر میں، جوں جوں سے کچھ دور کارنیمیسٹر میٹ میں واقع ہیں، جرنلسٹ ناصر بدری سے ملی، اس سے بات چیت کے دوران مجھے انداز ہوا کہ اسے واقعی میرے جاسوس ہونے کا شبہ تھا۔ جب ہم میٹرھیوں سے اوپر چڑھے تو میری سانس پھول چکی تھی، میں نے ناصر سے کہا کہ تم نے میری سانس کی کیفیت دیکھ لی ہے، کیا میں تمہاری نظر میں واقعی پیش فورسز سے تعلق رکھتی ہوں، یا جاسوس ہوں۔ وہ مسکرا دیا اس پر میں نے سمجھا کہ اسے قائل کرنا تو واقعی کافی مشکل کام ہوگا۔

ہم باتیں کرنے کے لئے بیٹھ گئے، اس نے مجھے ان دستاویزات کی فوٹو کاپیاں دیں جن میں ایک حد تک مستند معلومات پائی جاتی تھیں۔ اندرون ملک کے ٹیکس کوٹوارے بالکل اصلی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن میری سالانہ آمدنی تین گنا زیادہ ظاہر کی گئی تھی۔

لندن کے ڈاک لینڈز میں میرے سابق گھر کی دستاویز ملکیت اور ایک شوفلیٹ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مکان 5 لاکھ پاؤنڈز میں فروخت کیا گیا تھا جب کہ اصل میں وہ 2 لاکھ 20 ہزار پاؤنڈز میں بکا تھا۔ ناصر نے مجھے ایک اسرائیلی پاسپورٹ کی فوٹو کاپی دی جو دراصل میرے شوہر نمبر 3 کا پاسپورٹ تھا اور یہ بالکل اصلی دکھائی دیتا تھا۔ پھر اس کے پاس موساد کا کوڈ نمبر اور ایک شناختی کارڈ تھا اور اس کے دعوے کے مطابق وہ بھی میرے سابق شوہر ہی کا تھا۔ یہ دستاویزات اس کے کہنے کے مطابق مجھ سے اس وقت برآمد ہوئیں جب میں طالبان کے ہاتھوں گرفتار

رہا کیا۔ میرے خیال میں طالبان اتیلی جنس آفیسر نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی اتیلی جنس انہیں فریب دے کر استعمال کرنا چاہتی ہے، وہ اس کی چال کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جس روز امریکا اور برطانیہ نے کابل پر پچاس کروڑ میزائل پھینکے، لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے اگلے ہی دن مجھے افغانستان سے نکال کر باہر کر دیا گیا۔ ملا عمر نے مجھے انسانی بنیادوں پر رہا کرنے کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔ یہ دراصل ایک آنکھ والے روحانی لیڈر کی طرف سے مغرب کو دو انگلیوں کا ایک سلیوٹ تھا۔

ایسا نہیں ہوا کہ مجھ پر کسی قسم کی آنچ نہ آئی ہو، طالبان نے ایک بیان میں میڈیا سے کہا تھا کہ میں بہت نک چڑھی، گستاخ، اور ضدی عورت ہوں، میرا خیال ہے کہ میرے بارڈر کر اس کو جانے پر انہیں بھی اتنا ہی سکون محسوس ہوا ہو گا جتنا کہ مجھے نصیب ہوا تھا۔

تاہم میرے اخبار کی طرف سے فراہم کردہ شہادت کو دوسرے شواہد سے زیادہ وزنی پا کر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ میں ایک صحافی ہوں اور سکریٹ ایجنٹ ہرگز نہیں ہوں۔ انہوں نے پال لیشفورڈ کے ساتھ ایک مسلمان کے طور پر وعدہ کیا تھا کہ میرا صحافی ہونے کا یقین حاصل ہونے کے ساتھ ہی میری رہائی عمل میں آجائے گی۔ چنانچہ وعدہ پورا کر دیا گیا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com

اسلام کے مطالعے کا وعدہ

میں نے بھی جو وعدہ کیا تھا، میں اس پر سختی سے قائم ہوں۔ میں نے طالبان کے ایک عالم سے، جس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں، وعدہ کیا تھا کہ میں لندن واپس جا کر مذہب اسلام کا مطالعہ کر کے کوئی فیصلہ کروں گی۔ طالبان نے اپنا وعدہ پورا کیا اور میں بھی اپنا پورا کردکھاؤں گی۔

چنانچہ میں لندن میں مسلم کالج کے سربراہ ڈاکٹر ذکی بدای سے مل چکی ہوں۔ یہ کالج مسلمانوں کے لئے پوسٹ گریجویٹ سطح کا ایک مشہور ادارہ ہے، ڈاکٹر بدای نے مجھے اسلام کو سمجھنے کے لئے مزید معلومات فراہم کرنے کی پیشکش کی، اس کے لئے میں اس کی بہت شکرگزار ہوں۔ اسلام ایک پرکشش اور گرویدہ کن مذہب ہے، دوسرے مذاہب کی طرح اس میں بھی بہت سی عمدہ باتیں ہیں۔

اگر میں نے ان سب واقعات سے کچھ سیکھا ہے تو وہ یہ ہے کہ دوسروں کی نادانی اور بے علمی کو بھی حوصلے سے برداشت کیا جانا چاہیے۔ جب میں انگلینڈ میں واپس پہنچی، میڈیا کے بعض طبقے مجھ سے پہلو تہی کر رہے تھے، بعض دشنام طرازی بلکہ کھلم کھلے کے معاندانہ رویے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کالم نگار خواتین اپنے اپنے کوششہ عافیت میں بیٹھی اپنے ناخنوں کو پالش کرتے کرتے مجھے بطور ایک ماں، بطور صحافی اور بطور ایک عورت ادائیگی فرض کا درس دے رہی تھیں۔ ان کا بڑھتا ہوا غصہ اور ان کا گر جناب رسنا کا بل کی جمعہ مارکیٹ کے لئے ہرگز بے جا نہ ہوتا۔

انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے تمام کوٹوں میں چلائے جانے قلموں میں سے لعن طعن اور دشنام کے ناقابل یقین فوارے چھوٹ رہے تھے، البتہ جو لوگ مجھے صحیح طور پر جانتے تھے ان کی طرف سے چند آرٹیکل میری حمایت میں بھی لکھے گئے، حتیٰ کہ تلخ نوائی میں عام طور مشہور اور بعض اوقات کھلم کھلا ظالمانہ کردار ادا کرنے والا جریدہ ”پرائیویٹ آئی“ میری حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے واپسی پر برطانوی صحافی خواتین کے سالانہ اجلاس میں اپنی جو رواند اوقفس سنائی، اس سے بیشتر حاضرین کے دلوں میں میرے لئے اچھے تاثرات پیدا ہوئے لیکن چند بد ذوق عورتوں کا رد عمل بڑا مختلف تھا انہوں نے مجھے الفاظ کے ذریعے سنگسار کرنا شروع کر دیا کہ یہ وہاں صحافت کی کوئی خدمت کرنے گئی تھی۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ بعض لوگوں جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی، کی دلی خواہش تھی کہ وہاں مجھ پر جنسی حملے کئے جاتے یا کسی اور طرح تشدد کا نشانہ بنتی اور تابوت میں بند ہو کر وطن واپس آتی۔ تو ان سے مضید صحافتی خدمات کا سرٹیفکیٹ پالیتی۔

طالبان کے شریفانہ سلوک کا اعتراف

میں نے اجلاس میں کہا کہ ”طالبان نے مجھ سے بہت شریفانہ سلوک کیا، میں ان کی بے حد شکرگزار ہوں اگر وہ میرے ناخن کھینچ ڈالتے، مجھے ٹھنڈے سخ پانی میں ڈبکیاں دیتے، گرم سلاخوں سے میرا بدن داغنے تو یہ عورتیں شاید یہ سن کر بہت خوش ہوتیں۔“ میں جانتی کہ طالبان افغان عورتوں سے خوفناک سلوک روا رکھتے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اگر شمالی اتحاد کے لوگ برسر اقتدار آگئے تو وہ عورتوں سے کوئی بہتر سلوک کریں گے، انسانی حقوق کے حوالے سے تو ان کا ریکارڈ بھی اتنا ہی ہولناک ہے۔ افغانستان کی پوری آبادی نسواں جس بد حالی سے دوچار ہے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر تو نہیں ڈالی جاسکتی۔“

ایک رات ٹی وی پر میرے خلاف شدید زہر افشانی کی جارہی تھی۔ بات میرے قوت برداشت سے بڑھ گئی تو میں میڈیا کے مبصر اور ”مرز“ کے سابق ایڈیٹر رائے گریز لینڈ سے، جسے میں سال ہا سال سے جانتی ہوں، فون پر کہا کہ آپ کے خیال میں مجھ پر کوڑے برسانے کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

اس نے کہا..... ”یو آنے، یہ زیادہ تر تجارتی رقابت کا نتیجہ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تم ایک سپر لیس نیوز پیپر کے لئے کام کرتی ہو، چھوڑو نظر انداز کرتی رہو۔“

چند دن بعد میں بی بی سی کے بش باؤس کی طرف جارہی تھی، ایک افغان عورت تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئے مجھ تک پہنچی اور کہا ”آپ نے جو کچھ لکھا ہے، میں آپ کی بے حد شکرگزار ہوں، اب مجھے افغانستان کی باشندہ کہلانے پر شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کی سٹوریز نے ہمیں دوبارہ انسانیت نواز بننے میں مدد دی ہے۔“

ان چند پر تپاک جملوں نے میرے حوصلوں کو حقیقی اتھویت بخشی اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے منہی بھر لوگوں کے تلخ جذبات کو اپنی فکر و عمل پر ہرگز اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میرے تحقیر کرنے والے تو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، کیا میں سارا زور ان کی زبانیں بند کرانے کے لئے لگا دوں؟ ایسا کیا تو پھر کوئی مثبت کام نہیں کر سکوں گی۔

میں اپنی رہائی کے تقریباً دو ہفتے بعد ”سوسائٹی ایڈیٹر“ کانفرنس سے خطاب کرنے بلقا سٹ پہنچی تو ”آریوسی“ کے

چیف کانسیبل سررونی فلینگن نے اپنی تقریر میں نہایت موثر پرائے میں میرا ذکر کیا، جب اس نے مجھے بہادر اور جرات مند صحافی قرار دیا تو میں تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو گئی۔

جب میں کانفرنس سے خطاب کرنے کھڑی ہوئی تو میں نے ان علاقائی رپورٹروں کو خراج تحسین پیش کیا جو منشیات کے ڈیلروں اور جرائم پیشہ گروہوں اور ان کے سرپرستوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور صبح ناشتے کی میز پر تازہ تازہ خبریں لانے کے لئے اپنی جانوں کا خطرہ مول لے لیتے ہیں۔ میں نے آرٹس جرنلسٹوں کو ذاتی طور پر خراج تحسین پیش کیا جو اپنی نارل ڈیوٹی کے لئے بھی روزانہ خطرات سے دوچار ہوتے ہیں، میں نے امرٹن اوئینگن کا خاص طور پر ذکر کیا جسے اس کی بیوی کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اس نے ایک ایسے جرائم پیشہ گروہ کو بے نقاب کرنے کی مہم شروع کر رکھی تھی، جس نے حکومت کے وفاداروں کا بلا دہ اوڑھ رکھا تھا اور اس کی یہ کہانی سلسلہ وار چھپ رہی تھی۔

مارٹن اوئینگن اسی روز قتل ہوا تھا جس دن میں افغانستان میں گرفتار ہوئی تھی۔ میری گرفتاری کی خبریں دنیا بھر میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئیں اور اس بے چارے کی بہادری اور جرات کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا اور بعضوں نے اسے محض ایک گروہی چیلنج کا نتیجہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔

میری تقریر کے بعد ”سندے ورلڈ“ کے ناردرن ایڈیٹر جم میکڈویل نے اس اخبار کے صحافی کو شاندار خراج عقیدت پیش کرنے پر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں مارٹن اوئینگن جیسے صحافیوں کو سلیوٹ کرتی ہوں، خدا سچ لکھنے اور برائیوں کو بے نقاب کرنے والوں کی عزت کو دوام بخشنے۔ بعد ازاں بلافاست کی گلیوں میں عام لوگ مجھے روک روک کر میرے ساتھ مصافحہ کر رہے تھے، یورپا ہوٹل میں ایک نوجوان رپورٹر مجھے ملنے آیا اور کہا کہ ”برطانیہ آپ پر فخر کرتا ہے۔“ دو ادھیڑ عمر خواتین نے بھی ایسا ہی کیا۔

کانفرنس کے میزبان اور بلافاست ٹیلی گراف کے ایڈیٹر ”ایڈ کران“ نے مجھ سے کہا ”کیا تم جانتی ہو کہ تم دوبارہ پہلے جیسی نہیں رہ سکو گی۔ اتنی معروف ہو چکی ہو کہ بھیس بدل کر کام کرنا، ناممکن ہو جائے گا۔ اب تمہیں کوئی اور اندازہ اختیار کرنا ہو گا۔“

میں اس کے لفظوں پر غور کرتے کرتے اندر دہ ہو گئی۔ کیونکہ یہ ایک عظیم کام ہے، میں سندے ایکسپریس کی چیف رپورٹر کے طور پر کام کرنے پر فخر محسوس کرتی ہوں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں مستقبل میں کیسے کام کروں گی لیکن میرے پاس اپنے ناقدین کے لئے ایک پیغام موجود ہے۔

میرے اندر حس مزاج بدرجہ اتم موجود ہے، میں ہنستی مسکراتی رہنا چاہتی ہوں، شراب انجائے کرتی ہوں اور شیمپین سے خوب دل بہلاتی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سنجیدگی کی راہ نہیں اختیار کرنا چاہتی اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔

طالبان کی قید میں گزارے ہوئے دن بہت یاد آتے ہیں۔ اس سے خدا پر میرے ایمان کو بے حد تقویت ملی ہے، میں دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھوں گی۔ وہ دل سے نکلی ہوئی بات ضرور سنتا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ میری بھی سنے گا۔

بعض کہتے ہیں کہ کابل جیل میں بند ”شیلٹر“ کی ایڈورکرز کے مسیحی عقیدے کی قوت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ تین ماہ سے صبر کے ساتھ قید کاٹ رہی تھیں۔ ان پر الزام تھا کہ وہ مسلمانوں کو نیکی کی طرف بلا رہی تھیں۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتی ہوں کہ انہیں قید کر لینا طالبان کی مذہبی پولیس کی ایک ناروا کارروائی تھی۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ خدا پر ایمان ہی کی بدولت ثابت قدم رہیں۔

ادھر پانچ ہفتوں کی بمباری کے بعد شمالی اتحاد آگے بڑھا اور طالبان کی فوجیں، امریکا کی بے تحاشہ فضائی کارروائیوں کی تاب نہ لا کر تباہ و برباد ہو گئیں۔ جب وہ کابل سے فرار ہوئے تو پھپھاتے وقت آٹھ مسیحیوں کو بھی اپنے ہمراہ قندھار لے گئے ہیں جو کہ ان کا مضبوط قلعہ ہے۔

ایڈورکرز کے لیڈر جارج نابین نے جو کہ ایک تجربہ کار ایڈورکر ہے اور 16 سال سے افغانستان میں سرگرم عمل ہے کہا ”ہم بہت ڈرے ہوئے ہیں، اگر ہمیں قندھار لے گئے ہیں جو کہ ان کا مضبوط قلعہ ہے۔“

ایڈورکرز کے لیڈر جارج نابین نے جو کہ ایک تجربہ کار ایڈورکر ہے اور 16 سال سے افغانستان میں سرگرم عمل ہے کہا ”ہم بہت ڈرے ہوئے ہیں، اگر ہمیں قندھار پہنچا دیا گیا تو ہم غالباً نہیں بچ سکیں گے۔“ ان کی گاڑی کو رات کے وقت ملحقہ صوبے وردک میں روک لیا گیا اور آٹھوں رات بھر بج بستہ شینگ کانٹینر میں ٹھہرتے رہے، اگلی صبح انہیں کابل کے جنوب میں 80 کلومیٹر (50 میل) دور غزنی میں پہنچا دیا گیا۔ ایک جانب انہیں حوالات میں بند کیا جا رہا تھا اور دوسری جانب امریکی جیٹ بمباری کر رہے تھے۔ جب بموں کی ”برسات“ ختم ہوئی، ان کی کوٹھڑی کا دروازہ زور سے کھلا تو ایک رائفل بردار افغان اندر آ دمکا۔

غزنی میں ایک اور رات گزارنے کے بعد میرے سابق اسیر ساتھیوں کو تین امریکی ہیلی کاپٹروں نے جہنمیں پینشل فورسز پر پڑ کر رہی تھیں، ڈرامائی طور پر اچک لیا۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے پیشگوئی کی تھی کہ انہیں پینشل فورسز ڈرامائی انداز میں چھڑوا لیں گی، مگر یہ خیال نہیں تھا کہ یہ کام اس پیمانے پر ہوگا۔ مجھے خاص طور پر وہ تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی جب ہتھرمر سر دوڑتی ہوئی اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی، میری آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اس کا باپ اسلام آباد میں بیٹھ کر اس کی رہائی کے لئے کوشاں رہا۔

اس روز میرے سر میں درد تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی رہائی والی رات، میں حسن اتفاق سے جرمن شہر کولون میں ”شیلٹر انٹرنیشنل“ کے ڈائریکٹر ”اوڈو سنولٹ“، کیتھی کے بھائی ”اینڈریا زجیلنک“ اور اس کی بیوی ”کاتجا“ کے ساتھ تھی۔ ہم ٹی وی ”سرن“ پر رہائی سے متعلق اپنی توقعات اور خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ سوچ بچار رات دیر تک جاری رہی۔ لیکن میرے کیس سے متعلق افراد جانتے تھے کہ افغانستان کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کوئی بھی رخ اختیار کر سکتے ہیں۔

ہم ایک ٹیکسی میں اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ جب موبائل فون پر وڈو سنولٹ (ڈائریکٹر ”شیلٹر انٹرنیشنل“) نے کال وصول کی اور کہا..... ”وہ رہا ہو گئے.....“ خوشی کا وہ احساس بڑا جادوئی اثر رکھتا تھا۔ اور میرے منہ سے وہ جملہ بے ساختہ نکل گیا جو میں خصوصی اوقات میں کہا کرتی ہوں اور میرے دوست کئی بار پہلے بھی سن چکے ہیں..... ”آؤ شیمپین لنڈھائیں۔“

ہم ہوٹل کمپلیکس میں ایک پینا نو بار میں داخل ہوئے۔ میں نے جرنلسٹ پروڈیوسر ”تھیو ہین“ کو کال کی کہ وہ فوری طور پر یہ خوشخبری نشر کرے اور بعد ازاں ہم نے اسے خوشی منانے کے لئے ہمارے ساتھ آنے کی دعوت دی۔ وہ اس پورے شو میں گرم اینٹ پر بیٹھی بلی کی مانند دکھائی دے رہا تھا، کیونکہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ افغانستان سے آنے والی خبریں اچھی ہیں یا بری۔ اور جیسا کہ سب نے دیکھا کہ یہ واحد خبر تھی جس میں ”اگر مگر اور ممکن ہے“ کی تکرار تھی۔

میں نے اپنی غیر حاضر دوستوں کی یاد میں جام صحت نوش کیا اور ”اوڈو“ کو بار بار میڈیا کی طرف سے موبائل پر کھینچا جاتا رہا۔ اس نے جام صحت نوش کیا اور خدا کا شکر کیا۔ مجھے واقعی یاد نہ تھا کہ شیمپین مجھے کب کب اتنی لذیذ لگی تھی، چنانچہ ہم نے تین بوتلیں مزید حلق میں اتار لیں۔

پھر ہم نے سنا کہ ”شیلٹر انٹرنیشنل“ کے سولہ افغان ملازمین بھی رہا کر دیئے گئے ہیں، وہ جمعرات کو شمالی اتحاد کی فورسز کے کابل میں داخل ہونے کے وقت چھوڑے گئے تھے۔ میں نے ”اوڈو“ کو بتایا کہ ان کی ایڈورکرز کو یہ بتایا گیا تھا کہ ان کے میپلر ملازمین کو پھانسی دی دے گئے ہیں، انہیں اس اطلاع پر یقین نہیں آیا تھا اور دن میں دوبارہ ہونے والے اپنے اجلاسوں میں ان کے لئے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔

میرے ذہن میں فوراً اپنے دو گائیڈوں جان علی اور نقیب اللہ کا خیال آیا، جنہیں میں نے آخری بار کابل جیل میں دیکھا تھا، مجھے بتایا گیا تھا کہ انہیں پانچویں دے گئی ہے۔ یہ سن کر مجھے شدید صدمہ پہنچا تھا، خدا کا شکر ہے کہ عیسائی ایڈورکرز کی رہائی کے 24 گھنٹے سے بھی کم وقت میں پاشا نے مجھے بتایا کہ وہ بھی رہا کر دیئے گئے ہیں۔

پاشا نے کہا ”میڈم، طالبان نے انہیں کابل جیل سے نکال کر گاڑی کے ذریعے جلال آباد پہنچا دیا تھا۔ اور یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا کفیل خود ہے، اگر آپ دشمن سے بھاگ سکتے ہیں تو آپ بالکل آزاد ہیں۔“ اس کے یہ الفاظ میرے کانوں کے لئے ایک موسیقی تھے۔

میں اور میرا اخبار خاموشی سے منظر کے پیچھے سے ان کی رہائی کے لئے کوشاں رہے، میرے لئے یہ بہت مشکل وقت تھا کیونکہ میں نے دس دن طالبان کو یہ باور کراتے کراتے گزارے کہ یہ لوگ میرے گائیڈ نہیں ہیں۔ چنانچہ جب میں رہا ہوئی تو، میں صحافیوں کو اعتماد میں لے کر ساری سٹوری بتانے سے قاصر رہی۔ میرے خدشات بالکل بجاتھے کیونکہ بعض رپورٹروں نے میرے خلاف بدخواہی اور دشمنی کا رویہ اختیار کر رکھا تھا اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ انہیں بتا دینے سے گائیڈوں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

وہ اپنے خاندانوں سے جا ملے اور بہت خوش پائے گئے تھے۔ اور میں بھی پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ انہیں اڈیتیں دینے جانے کی جو افواہیں پھیلانی گئی تھیں، وہ مبالغہ آمیز تھیں۔ پاشا نے کہا کہ ”طالبان نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا لیکن یہ بات ان پر واضح کر دی تھی کہ اگر تمہارے جاسوس ہونے کا یقینی ثبوت مل گیا تو تم پھانسی سے نہیں بچ سکو گے۔ اب ان میں سے ہر ایک خوش ہے۔“

پاشا کی طرف سے موصول ہونے والی ساری کی ساری کالیں خوشخبری نہیں تھیں۔ میری رہائی کے تین ہفتے بھی مکمل نہیں ہوئے تھے، وہ چھوٹا سا گاؤں ”کاما“ جو ضلع ”کاما“ میں واقع تھا، امریکی بمباری سے صفحہ ہستی سے نابود ہو گیا

تھا۔ میں اپنے اس وقت کے احساسات کو بھول نہیں سکتی جب میں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ ”میڈم میرے پاس آپ کے لئے ایک بہت بری خبر امریکنوں نے آپ کے گاؤں کو بموں سے اڑا دیا ہے، کاما، اب ختم ہو چکا ہے اور آپ جن لوگوں سے ملی تھیں ہلاک ہو چکے ہیں۔“

میں نے بھولی بن کر اسے کہا کہ اتفاقاً کوئی بم وہاں جا پڑے ہوں گے، اس نے احتجاجی انداز میں کہا ”لیکن میڈم پھر وہ اتفاقاً ہی مسلسل تین دن ”کاما“ پر بمباری کرتے رہے ہیں۔“

میں نے لائن بند کر دی، میرے اندر سے آنسوؤں اور آہوں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ جس عورت نے کابل پر رات کو ہونے والی بمباری پر فاتحانہ انداز میں ”رول برطانیہ رول“ والا نغمہ الاپا تھا، آج جنگ پر لعنت بھیج رہی تھی۔ میں ”کاما“ گئی تھی اور خود دیکھ کر آئی تھی کہ اس کی کوئی فوجی یا تروریہ اہمیت نہیں تھی۔

میں ماں کو کال کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں نے کہا ”ماں ان حرامزادوں نے میرے گاؤں ”کاما“ پر بمباری کر کے اسے تہس نہس کر دیا ہے، اب اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔“ پھر میں نے اپنے نیوز ایڈیٹر جم کوفون کیا اور ہر کسی کو، جو سن سکتا تھا، یہ اندوہناک خبر سنائی۔ میں غمزہ تھی اور ہر کسی کو حال دل سنارہی تھی۔

پھر میں نے پارلیمنٹ کے لیبر رکن ان سیمپسن کوفون کیا جو ”لیبر اگنیٹ وار“ کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں اور انہیں ان دور افتادہ وپر امن گاؤں اور اس کے خوبصورت باسیوں کو رکھنا دینے جانے کے اندوہناک واقعہ کی تفصیل سنائی، اسے بھی بہت غصہ آیا۔ اس نے میرے خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے بہت اہم ہے کیونکہ میرے کوئی سیاسی مقاصد نہیں ہیں اور میں جنگ کے خلاف کسی خاص پریشر گروپ سے تعلق نہیں رکھتی۔

میں ایک چشم دید گواہ تھی، میں وہاں برسر زمین موجود تھی، میں ایسی صحافی تھی جو اس بات کی تصدیق کر رہی تھی کہ امریکن سولین آبادی پر بمباری کر رہے تھے۔ میرے پاس لوگوں کے لئے ایک اہم پیغام تھا جو اس کے بعد میں نے کئی اجلاسوں سے خطاب کرتے ہوئے دیا اور فوجی مہم جوئی سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرتی رہی۔

ابھی بے شمار کام ادھورے پڑے ہیں اور مجھے افغانستان واپس جا کر ان لوگوں کو ڈھونڈنا ہے جن سے میں نے ”کاما“ میں باتیں کی تھی، میں دنا کرتی ہوں کہ خدا کرے کہ وہ اب بھی زندہ اور سلامت ہوں۔ میں اس افغان عورت سے ایک بار پھر اپنا مذاق اڑوانا چاہتی ہوں جس نے ڈیٹک ماری تھی وہ پندرہ بچوں کو جنم دے سکتی ہے۔ میں اس نوجوان لڑکی سے بھی ملنا چاہتی تھی جو ڈاکٹر بننے کی آرزو پال رہی تھی۔ اور اس نوجوان لڑکے سے بھی ملاقات کی متنی ہوں جو میڈیکل کینسر خیر اختیار کرنا چاہتا تھا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا وہ سب زندہ ہیں۔ ایسے باہمت نوجوان اس ملک کے مستقبل کی امید ہیں جو دؤشروں سے بھی زیادہ عرصہ جنگ و جدل میں مبتلا چلا آ رہا ہے۔

میں دنیا کے بہت سے ملکوں اور شہروں کی محبت سے سرشار ہوں اور اس کی وجوہ بھی بہ آسانی بتا سکتی ہوں: نیویارک، بیجان خیز اور ولالہ انگیز ہے، روم اور اس کا روایتی طعام، مقدس اور متبرک ہیں۔ وینس، دم بخود کر دیتا ہے، پریس بے حد وضع دار اور نفاست پسند ذریعہ ہے۔

افغانستان نے میرا دل لوٹ لیا ہے، یہ ایک اجاڑ، وحشی اور معاف نہ کرنے والا ملک ہے، جس کے باشندوں کے تضادات اس کی متلاطم تاریخ، سیاست اور جغرافیے میں مضمر ہیں۔ احمد رشید نامی مصنف نے، جس نے ”Taliban: the story of the afghan warlords“ لکھی ہے، اس ملک کی خصوصیات اس چھوٹے سے پیراگراف میں بڑی خوبصورتی سے سمودیا ہے:

کئی سال پہلے ایک دانا بوڑھے افغان مجاہد نے مجھے افغانستان کے متعلق ایک اساطیری کہانی سنائی کہ یہ ملک کیسے بنا۔ اس نے بتایا کہ ”جب اللہ نے باقی ساری دنیا بنائی تو اس نے دیکھا کہ بہت سا کوڑا اکباڑ بچ گیا ہے، ایسے کلکڑے اور سنگ وریزے ہیں کہ یہ کہیں بھی اور نہیں لگ سکتے، چنانچہ اس نے سب کو یکجا کر کے زمین پر پھینک دیا، اس سے افغانستان وجود میں آ گیا۔“

افغانستان کی طرف خواہ مجھے کوئی بھی کھینچ رہا ہے، میں وہاں دوبارہ جاؤں گی اور اپنے ایڈیٹر مارٹن ٹاؤنسنڈ اور اپنی ماں جانس سے اجازت مانگوں گی کہ وہ مجھے ایک بار پھر وہاں جانے دیں تاکہ میں اس کو سمجھ سکوں اور آزادی میر کے ساتھ واپس آؤں۔

”ممکن ہے تم نے مجھے زمین پر لانے کی پہلی جنگ جیت لی ہو..... مگر تم نے اصل جنگ نہیں جیتی۔“

سوال: قید کے دوران آپ کے ساتھ طالبان کا سلوک کیسا رہا؟

جواب: اس سلوک کے بارے میں، میں اپنے متعدد انٹرویوز اور اپنی کتاب میں ذکر چکی ہوں، البتہ یہاں اس بات کا اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ بظاہر میں جاسوس ہی تھی اور ان کے راز ”چوری“ کرنے کے لئے بھیس بدل کر ان کے ملک میں گھسی تھی۔ پھر میں نے انہیں اشتعال دلانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، میں نے تفتیش کاروں کے منہ پر تھوکا، انہیں گالیاں دیتی رہی اور بری طرح دھتکارتی بھی رہی۔ اس کے جواب میں، وہ مجھے اپنی بہن اور معزز مہمان کہتے رہے۔ انہوں نے مجھے ایئر کنڈیشنڈ اور صاف ستھرا کمرہ بھی دیے رکھا، جس کی چابی بھی میرے قبضے میں تھی، اس کا موازنہ ابو غراب اور جزیرہ کوئٹا نامو بے میں رکھے گئے بے گناہ قیدیوں کی حالات سے کیجئے۔ امریکن ان کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کر رہے ہیں انہیں ایسے پنجروں میں رکھا گیا ہے جن میں وہ سیدھے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے، یہ مناظر ٹی وی پر بھی دکھائے جا رہے ہیں کہ ایک سپر پاؤر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے وحشیانہ حرکت کر رہی ہیں بتائیے پھر ان دونوں میں سے مہذب اور شائستہ قوم کون سی قرار پاتی ہے؟ اجڈ اور گنوار کون۔؟

سوال: آپ کے اسلام قبول کرتے وقت، آپ کے پاس اور کون کون تھا، اس سلسلے میں کوئی مزید قابل ذکر بات؟ اس کے بعد آپ کے معمولات زندگی اور روزمرہ کی سرگرمیوں پر کیا اثر پڑا، خاندانی تعلقات اور حلقہ احباب کا کیا رد عمل تھا۔

جواب: میرا قبول اسلام، کابل سے واپسی کے ڈھائی سال بعد کا واقعہ ہے، یہ ڈھائی سال اسلام کے مطالعے میں گزارے، جب میں نے خود کو اس عظیم مسلم برادری میں شامل ہونے کے لئے بالکل تیار پایا تو عمران خان کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا، انہوں نے مجھے ایک بار پھر غور کر لینے کے لئے کہا، میں نے کہا کہ ڈھائی سال سوچتی رہی ہوں، اب صرف عمل کرنا ہے۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں اس کے لئے خاص تقریب کے انعقاد یا پر جوش تقریر کی ضرورت نہیں سمجھتی، بس عمران خان اور ہمارے تین اور دوست موجود تھے۔

جہاں تک اثرات یا میری زندگی کے معمولات، خاندانی تعلقات اور حلقہ احباب کے رد عمل کا تعلق ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ میں نے شراب پینا بالکل ترک کر دیا ہے، کلبوں میں جانا، شطرنج کھیلنا اور مخلوط محفلوں میں شرکت کرنا کلیتاً چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح جو احباب کچھڑنا تھے وہ کچھڑ چکے۔ اب میں ان تمام حرکتوں سے اجتناب کرتی ہوں جنہیں گناہ کہا جاتا ہے۔ میں افغانی عورتوں کی طرح شل برقع نہیں پہنتی لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق ”حجاب“ پہنتی ہوں، اس میں بھی چہرے اور ہاتھوں کے سوا سارا جسم ڈھانپا ہوا ہوتا ہے۔ میں حتی الوسع اسلامی طرز معاشرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

جو لوگ مجھے بطور یو آنے رڈ لے بے حد عزیز جانتے تھے وہ مجھے بطور مریم دیکھ کر ششونج میں پڑ جاتے ہیں اور کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ چلئے اس سے انہیں طالبان اور اسلام کے بارے میں ایک ناقابل فراموش پیغام تو مل گیا ہے۔

مجھے عیسائی فنڈ مفلسوں کی طرف سے قتل کی دھمکیاں بھی ملتی رہتی ہیں، ان کا کہنا ہے میں نے ان کے مذہب سے غداری کی ہے، یہ ان کی تعبیر ہے اور میری تعبیر یہ ہے کہ میں نے اپنے مطالعے اور اپنے ضمیر کے مطابق ایک فیصلہ کیا ہے۔ جس سے مجھے بے پناہ اطمینانیت حال ہوئی ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ اس سے پہلے میری زندگی کا کوئی نصب العین نہیں تھا، اب مجھے جینے کا ایک واضح مقصد نظر آ گیا ہے۔ زندگی بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہے۔ البتہ مجھے ایک پچھتاوا ہے کہ میں نے اسلام کو سمجھنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نظر کرم کر ہی دی ہے، اب باقی زندگی اس کے احکام کے مطابق گزاروں گی۔

میں اب غیر مسلموں میں غیر محسوس طریقے سے اسلام کی روشنی پھیلا رہی ہوں اور مسلمانوں کو بھی خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اسلام کی سچائیوں سے بھاگنے والوں سے کہہ رہی ہوں کہ وہ خود کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے مغربی معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے سارے رنگ دیکھ چکی ہوں۔ نام نہاد تہذیب اور اس کے معاشرے کو بہت باریک بینی سے دیکھا ہے، اس لئے میں جانتی ہوں کہ وہ کتنا خطرناک معاشرہ ہے۔ دور سے بہت خوبصورت اور چمکدار ہے مگر قریب جا کر دیکھو تو بہت بھیا تک ہے۔ یہ صرف تن و جان اور مادیت سے غرض رکھتا ہے اور روحانی اقدار کے لئے تباہ کن اثرات رکھتا ہے۔ میں مسلمان عورتوں سے کہتی ہوں کہ اس معاشرے کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا، اسلام سے بڑھ کر کوئی تمہاری محافظ نہیں ہو سکتا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد اگر کچھ لوگ مجھ سے دور ہوئے ہیں تو کچھ میرے قریب بھی آئے ہیں یہ کروڑوں کی

”یو آنے رڈلے سے مریم ٹک“ انٹرویو

یو آنے رڈلے کی افغانستان سے واپسی کے بعد انگلینڈ میں آنے پر حالات میں تیزی سے تبدیلی آنے لگی، مغرب اور بالخصوص امریکہ نے اس سے جو توقعات قائم کی تھیں، وہ نہ صرف پوری نہ ہوئیں بلکہ ان کے ایٹمی طالبان پر پروپیگنڈے پر بھی پانی پھر گیا۔ امریکہ نے سنڈے نیلی گراف لندن کی کرسٹینا لمب کو دو دفعہ افغانستان بھیج کر صحافتی محاذ پر جو کامیابیاں حاصل کی تھیں اس نے اس تجربے کی بنا پر یو آنے رڈلے سے بھی کچھ توقعات قائم کر لی تھیں۔ کرسٹینا کے فراہم کردہ مواد نے مغربی ابلاغ عامہ کو کافی عرصہ تک طالبان پر الفاظ کی کولہ باری میں مدد دی اور اس سے پیدا شدہ فضا کو مستحکم بنانے کی کوششوں کا سلسلہ بنوز جاری تھا کہ یو آنے رڈلے اپنے خالصتاً صحافتی مقصد کے تحت افغانستان جا پہنچی، (اس راہ میں اسے جو کچھ بھی پیش آیا پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے)، اب امریکہ اور برطانیہ کو اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لئے اس کی لاش کی ضرورت تھی، مگر اس سازش کی کڑیاں، قدرت کے اپنے نظام کے تحت، یکے بعد دیگرے ٹوٹی چلی گئیں اور کتاب ہذا کی مصنفہ نے لندن واپس آخر اس سازش کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا، اور ان صحافیوں کو بھی بے نقاب کر دیا جو وقتی فوائد کے لئے اپنے سیاسی آقاؤں کے اشارہ اور پران کی مرضی کا مواد مہیا کرتے رہتے ہیں۔

رڈلے نے طالبان کے ساتھ مطالعہ اسلام کا وعدہ کیا تھا جس کے مطابق اس نے اسلامی کتب کا مطالعہ اور مسلم تنظیموں اور ممتاز مذہبی اور سماجی شخصیات سے تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رکھا، بالآخر اسے وہ منزل مل گئی جسے ”دائرہ اسلام“ کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اس نے 30 جون 2003ء کو ساڑھے گیارہ بجے دن عمران خان کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا، وہ اس کا بزنس پارٹنر بھی ہے۔ اس کا اسلامی نام، مریم تجویز ہوا ہے۔ اور اب وہ ”اسلام“ نامی ایک چینل سے وابستہ ہے، موصوفہ کی دوسری کتاب ”Ticket to Paradise“ ہے۔ مریم برٹش ایٹمی وار موومنٹ کی بھی فعال رکن ہے، اس نے اس پلیٹ فارم سے دہشت گردی کے خلاف متعدد لیکچرز دیئے اور ہر قسم کی دہشت گردی کی خواہ وہ انفرادی ہو یا ریاستی، قابل مذمت سمجھتی ہے، اس نے اس سلسلے میں جن ممالک کے دورے کئے ان میں وسطی ایشیاء آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، یورپ اور امریکہ شامل ہے۔ افغانستان کے بھی کئی دورے کئے 2002ء کے موسم بہار میں دورہ افغانستان میں اپنی بیٹی ڈیری کو بھی ساتھ لے گئی تھی تاکہ وہ اسے اس سرزمین کی سیر کرا سکے جہاں سے اس نے اسلام سے متعلق اپنی سوچ بچار کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

اس نے ڈیری کو انسانوں کی اس نسل سے متعارف کرایا جن کے دل بقول اس کے خوبصورت جذبوں سے سرشار ہیں اس کا خیال ہے کہ اس کی بیٹی کے لئے یہ تجربہ انتہائی خوشگوار تھا۔ جو اس کے دل میں ہمیشہ تر ونازہ رہے گا اور اس کے ”ڈزنی لینڈ“ کی سیر کے تجربے پر بھی غالب رہے گا۔

سابق یو آنے رڈلے اور موجودہ مریم، پاکستان کے شمالی علاقوں میں زلزلہ زدگان سے اظہار ہمدردی اور حالات کے جائزے کے لئے بھی اسلام آباد آئی اور اس نے یہاں صحافیوں سے گفتگو کی، جس میں اسلام میں خواتین کے حقوق پر بھی اظہار خیال کیا۔ علاوہ ازیں اس نے سعودی عرب کی وزارت حج کے ذولسانی محلے ”الحج والعمرة“ کو بھی ایک تفصیلی انٹرویو دیا۔ ذیل میں ہم ان انٹرویوز کے بعض حصے دے رہے ہیں جبکہ بعض حصوں کو نظر انداز کر رہے ہیں کیونکہ آپ انہیں پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں تاہم کہیں کہیں ان کا صرف وضاحت کے لئے سرسری حوالہ آئے گا۔ ملاحظہ فرمائیے:

سوال: جب طالبان کی تفتیش سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ آپ کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا اور آپ کی کھینچی ہوئی تصویریں بھی بمعہ کیمرہ ان کے پاس تھیں تو آپ کو دس دن تک قید و بند میں رکھنے کا ان کے پاس کیا جواز تھا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ طالبان اس وقت چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی فضائی حملوں کا نشانہ بننے والے تھے۔ ایک غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہو جانے والی انگریز عورت کی ”جلد از جلد رہائی“ ایسا مسئلہ نہیں تھا جسے وہ ترجیحی طور پر نمٹاتے۔

دوسری جانب مغربی قوتیں جن کے لئے کسی فرد کو سیاسی مقصد کے لئے قربانی کا بکرہ بنادینا کوئی شرم کی بات نہیں ہوتی وہ مجھے جاسوس ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی تکنیکی مہارت کے بل بوتے پر میری دستاویزات اور تصاویر چوری کرائیں اور ان کی نقول بنانا کر طالبان کو بھجوائیں اور انہیں وہ اتنی زیادہ تعداد میں وصول ہونے لگیں کہ انہیں اپنے ان ”مہربانوں“ کے محرکات پر شک پڑ گیا۔ اس طرح پیدا ہونے والی الجھنوں کی گرہیں کھولتے کھولتے اور سازش کی تہ میں پہنچتے پہنچتے ان کا بہت سا وقت ضائع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ میری رہائی میں تاخیر کی صورت میں برآمد ہوا۔

برادری ہے مجھے اس برادری کی طرف سے بہت سی محبت ملی ہے لیکن مسلمان خواتین مجھ سے حیران کن سوالات کرتی ہیں۔ یہ میرے حجاب کو دیکھ کر اکثر پوچھتی ہیں کہ آپ نے پردہ کیوں شروع کر دیا ہے۔ میں انہیں جواب دیتی ہوں، حجاب آپ کو بدنگاہ سے بچاتا ہے، یہ آپ کا محافظ ہے، اس لئے یہ آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ پھر میں ان پر سوال کر دیتی ہوں آپ حجاب کرنا کیوں پسند نہیں کرتیں اس پر وہ لا جواب ہو جاتی ہیں۔

میرے خاندان میں میرے علاوہ اور کوئی مسلمان نہیں ہوا۔ میری بیٹی ڈیزی اب تیرہ سال کی ہو چکی ہے، وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئی۔ مگر میں ان پر اسلام ٹھونسوں گی نہیں۔ اسے اس کا مطالعہ کرنے کی ترغیب ضرور دوں گی اور اس کے سامنے اسلام کا ایک نمونہ بنوں گی تاکہ وہ مجھے دیکھ کر اس کی طرف کشش محسوس کرے۔ البتہ میں اس کی تربیت اسلام کے مطابق کر رہی ہوں۔ میں اسے حجاب کے فائدے بتاتی ہوں اور بے پردگی کے نقصانات بھی بتاتی ہوں۔

میری ماں نے مجھے اسلام قبول کرنے سے نہیں روکا، البتہ اب وہ باقاعدگی سے چرچ جانے لگی ہے۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہے کہ میں شراب چھوڑ چکی ہوں، وہ پہلے بھی مجھے شراب سے روکتی رہتی تھی، اس کی کوئی نصیحت مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، میں اس سلسلے میں واضح نافرمانی تو نہیں کرتی تھی، چھپ کر پیتی تھی یا حیلے بہانے سے سال ہا سال سے یہ شغل جاری رکھے ہوئے تھی۔

سوال: کیا آپ کو طالبان کے علاوہ کسی اور نے اسلام کی دعوت نہیں دی؟

جواب: باقاعدہ دعوت تو کسی نے نہیں دی، انگلینڈ میں موجود مسلمانوں کو نہ میرے قریب آنے کا موقع ملا ہے اور نہ مجھے ان کے قریب جانے کی کوئی تحریک یا تجسس ہوا، اگر کہیں سفر میں یا روزمرہ کی زندگی میں ان سے کوئی واسطہ پڑا ہو تو ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر، یا اسلام کے حوالے سے قربت پیدا نہیں ہوئی۔ اور نہ ان میں سے کسی نے ایک فعال صحافی کے سامنے اسلام پیش کرنے کی ہمت کی مذہب سے متعلقہ لٹریچر پیش کرنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

لکھے ہوئے اسلام کی بجائے چلتے پھرتے ہوئے اسلامی نمونے (عملی اسلام) زیادہ متاثر کن ہوتے ہیں۔ افغانستان میں جیل کے اندر طالبان اسلام کے عملی نمونے ہوتے تھے میں انہیں توجہ اور سنجیدگی سے نمازیں ادا کرتے ہوئے دیکھتی تھی اور جیل کے باہر بھی ان لوگوں کو نماز کے وقت رکوع اور سجود میں عاجزی کرتے پا کر دلی طور پر متاثر ہوتی تھی۔ راستے میں نماز کا وقت آ جاتا، تو سفر روک کر ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے تھے، اس نظم و ضبط کا کچھ نہ کچھ اثر تو مجھ پر ہوتا ہی تھا۔ مگر یہ زمانہ قید کی باتیں ہیں میں نے زندگی کے بارے میں سنجیدگی اختیار کی تو مذہب کے عملی نمونوں سے بھی متاثر ہوئی۔

میں نے برطانیہ امریکا اور یورپ کے کئی شہروں کے دورے بھی کئے ہیں، میرے اندر آنے والی تہذیبی لوگوں کے لئے باعث حیرت رہی ہے اور وہ مجھ سے اسلام کے بارے میں بہت کچھ پوچھتے رہتے ہیں۔ گزشتہ سال فلوریڈا (امریکا) میں ایک تقریب ہو رہی تھی۔ لوگ بڑی دل جمعی سے میری تقریر سن رہے تھے، جوں جوں سوالات آرہے تھے اور میں جواب دے رہی تھی، رنگ جتنا جا رہا تھا، مخالفین نے جب دیکھا کہ میرے لئے کوئی سوال بھی پریشان کن نہیں بن رہا ہے تو انہوں نے تقریب کو منتشر کرنے کے لئے بم کی موجودگی کی افواہ اڑادی۔ پولیس فوراً پہنچ گئی لیکن اسے بم نہ ملا۔ پولیس اہلکار بھی تقریب میں بیٹھ گئے۔ میرے لیکچر کے بعد ایک پولیس آفیسر میرے قریب آیا اور مجھ سے قرآن مجید کا ایک نسخہ مانگا، جو میں نے اسے پیش کر دیا۔ میں نے ایک سکول ٹیچر (خاتون) کو بھی مسلمان کیا ہے، اور اسے اسلام سے متعلق کئی پمفلٹ اور جرائد دیے ہیں۔ اس کی اب مجھ سے ”خط و کتابت“ چل رہی ہے اس نے شراب بالکل چھوڑ دی ہے اور مسلمان ہو کر بہت سکون محسوس کر رہی ہے۔

سوال: گیارہ ستمبر، جس کے بارے میں آپ نے کہا ہے کہ اس واقعہ سے دنیا بدل گئی ہے، بدل جانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب: یہ واقعہ بیک وقت باعث رحمت بھی بنا اور باعث رحمت بھی ثابت ہوا ہے، اس کے کئی پہلو ہیں، مغرب اسلام کی تیز ترین پیشرفت کی وجہ سے پہلے ہی پریشان چلا آ رہا تھا، اس پر متعصب مسیحی، جنہیں آپ فنڈ امنگمنٹ کہہ سکتے ہیں شدید بیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہودی بھی ان کے ہمواتھے جب "Twin Towers" تباہ ہوئے تو انہوں نے سٹیٹ مشینری کے رد عمل کا رخ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت مسلمانوں کی طرف موڑ دیا۔ چنانچہ ”ناورز“ کے بلے سے اٹھانے والے سیاہ دھوئیں کی کالک سے اسلام کے چہرے کو داغدار بنانے کی کوشش شروع ہو گئیں، ذرائع ابلاغ صرف اسی کام کے لئے وقف ہو گئے۔ جیسا کہ دنیا جانتی ہے کہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے سپرنگ پر جتنا دباؤ ڈالا جائے وہ اتنی ہی شدت سے واپس آتا ہے لوگوں نے اسلام کو جاننے کی کوشش تیز تر کر دیں۔ 11 ستمبر کے بعد سے اسلامی لٹریچر کی مانگ میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

میں اعداد و شمار کے لحاظ سے صرف برطانیہ کے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ اس واقعہ کے بعد یہاں اب تک کوئی چودہ ہزار 14000 ہزار افراد اسلام کی طرف آچکے ہیں اور بہت سے مسلمان اپنے ایمان کو از سر نو تازہ کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو چکے ہیں۔

سوال: آپ کی کتاب میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے بھی کچھ باتیں چھپی ہیں، اب آپ اسلام کے دائرے میں آکر، ان کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہیں؟ اور غیر مسلموں کے اعتراضات کا کیا جواب دیتی ہیں؟

جواب: قرآن اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ دین سے تعلق فرد کی اہمیت اور تعلیم کے حوالے سے مرد و خواتین برابر ہیں بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش و تربیت کے بارے میں خواتین کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ بچوں کو بتایا گیا ہے، کہ ان کی جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہیں اور احادیث میں کہا گیا ہے کہ مردوں میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی یا بیویوں کے حق میں اچھا ہو۔ اگر اس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو وہ ان کے ساتھ انصاف و مساوات کا سلوک کرے۔

نبی اکرمؐ نے عورتوں کے ساتھ سلوک کی جو اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں وہ پوری امت بلکہ پوری انسانیت کے لئے ایک مشعل راہ ہیں۔ آپ خواتین کی صلاحیتوں اور ان کی خوبیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے مغرب نے عورت کو جو ”آزادیاں“ دی ہیں انہیں ”آزادیاں“ کہنے سے پہلے ہمیں، ان کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے یہ تو ان کے بدترین استحصال کا ایک حربہ ہے۔

سوال: مغرب کی طرف سے افغانستان پر شدید ترین بمباری کے بعد آپ کئی بار افغانستان جا چکی ہیں کیا اب وہاں کرزئی حکومت امن و امان کے قیام اور خواتین کے استحصال کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

جواب: کرزئی حکومت ناکام ہو چکی ہے۔ صدر افغانستان اپنے اقتدار کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ایک خوبصورت اور صحت افزا ملک منشیات فروشوں کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے افغانستان ہیروئین تیار کرنے والوں ملکوں میں سرفہرست ہے، بچوں کی فروخت زوروں پر ہے، خواتین آزادی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکتیں۔ طالبان نے اپنے دور حکومت میں منشیات فروشوں کا قلع قمع کر دیا تھا، پوسٹ اور ہیروئن کا کاروبار نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ خواتین کی عصمتیں محفوظ تھیں، قتل و غارت، چوری ڈکیتی کی وارداتیں کبھی کبھار سننے کو ملتی تھیں، لیکن اب حالات قطعاً مختلف ہیں۔

عصمت فروشی کا رو بار کھلے عام ہو رہا ہے، ریڈ لائٹ ایریاز کی رونقیں بحال ہو چکی ہیں، کابل میں نشہ ڈیز اور ڈی وی ڈیز عام ہو چکے ہیں سیکورٹی کے لئے غیر ملکی فوجوں کا سہارا لیا جا رہا ہے اور وہی ایفون اور پوسٹ کے کاروبار کی پشت پناہی کر رہی ہیں اگر طالبان نے جیسا کہ خود اقوام متحدہ اعتراف کر چکی ہے کہ وہاں منشیات ختم کرا دی

آخری باب

اس سے پہلے میں مسلمانوں سے کبھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ ہزاروں، لاکھوں مسلمان ہمارے ملک میں آتے رہے اور میں بھی وسطی ایشیا کے ملکوں آتی جاتی رہی، مجھے ہر طرف مادی رویوں سے ہی واسطہ پڑا تو میں کیسے متاثر ہوئی؟ اپنے معاشرے میں انہیں دوسروں جیسا ہی پا کر، مجھے ان کے فکری مرکز (اسلام بطور دین) پر غور کرنے کی کیسے ترغیب ملتی۔؟

جلال آباد میں دوران تفتیش، انتہائی جنس اور دیگر عملہ کے ارکان کے اس رویے نے بھی مجھے ایک عجیب تجربے سے دوچار کیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتے تھے، اس وقت میں یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ مجھے گمان گزرتا تھا کہ یا تو مجھ میں بطور عورت وہ کشش نہیں جو جنس مخالف کو متوجہ کر سکتی ہے، یا ان کے دل میں میرے خلاف کوئی بغض ہے کہ نفرت کے باعث میری شکل بغور دیکھنا انہیں کوارا نہیں ہے وہ مجھ پر سوال کر کے یا تو پیچھے دیوار پر لگی کسی چیز پر خالی خولی نگاہیں مرکز کئے رکھتے یا چھت کو گھورتے رہتے۔ مجھے ان سے تنہائی کے مواقع بھی ملے، جس طرح وہ دو دو تین تین کی صورت میں بے نیازی کا مظاہرہ کرتے، تنہائی میں بھی ویسے ہی ”لا تعلق“ کرتے۔ میں اس رویے کو اپنی ایک طرح کی ”توہین“ سمجھتی تھی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ان کے رویے میں درشتی اور کمرنگی آجانی چاہئے تھی، مگر ایسا بھی نہیں تھا، باقی ان سب باتوں میں عزت و احترام موجود تھا۔ یہ راز اب جا کر کھلا ہے کہ اسلام اگر عورت کو پردے (حجاب) کا حکم دیتا ہے تو مرد کو نگاہیں جھکانے (غض بصر) کا بھی حکم دیتا ہے حیا اور شرم کے لئے مرد اور عورت دونوں پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ عورت خود تو اپنے لباس کے باوجود اپنے حسن کو نمایاں سے نمایاں تر کرتی رہے اور مرد سے یہ توقع رکھے کہ وہ نگاہیں جھکانے رکھے، درست نہیں، اسی طرح مرد اگر عورت سے ”حجاب“ کی توقع رکھے اور خود بھوکے بھیڑیے کی طرح ان کا قد کاٹھ اور چال ڈھال نا پتہ رہے تو اس کی بھی اجازت نہیں۔ شرم و حیا کی ذمہ داری اور اس سے متعلقہ لوازمات، دونوں اصناف کے لئے کچھ حدیں مقرر کرتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ عورت اور مرد، دونوں مل کر ایک معاشرہ بناتے ہیں تو اس کا سارا بوجھ صرف عورت پر تو نہیں ڈالا جاسکتا۔

سوال: اسلام قبول کرنے سے پہلے آپ کا اسلام کے بارے میں کیا تصور تھا اور اب اسے کیسا مذہب سمجھتی ہیں؟
جواب: دوسرے غیر مسلموں کی طرح میری رائے بھی اسلام کے بارے میں کچھ اچھی نہیں تھی، میری رائے مسلمانوں کے عمومی رویے سے ہی بنی چاہیے تھی۔ میں اسلام کو دہشت گردوں کا مذہب سمجھتی تھی جن کا انسانی روایات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میڈیا جس طرح اسلام کو منہ کر کے پیش کرتا تھا اور مجھے جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا تھا، میں وہی کچھ سوچتی تھی۔ اس معاندانہ پروپیگنڈے میں آئے دن شدت بڑھتی جا رہی تھی اس کی بنا پر ہمارے دو قسم کے رویے پیدا ہوئے، ایک تو یہ کہ مذہب سے لا تعلق ہو جاؤ اور جو کچھ کامن سنس (عقل عام) کے ذریعے اچھا لگے اسی کو اختیار کر لو۔ اتوار آجائے تو چرچ چلے جاؤ، اور وہاں کی باتیں وہیں چھوڑ کر واپس آ جاؤ۔ غالباً یہی رویہ دوسرے مذہب کا بھی ہے، ہفتے میں کسی دن عبادت گاہ کا چکر لگا لو، مسلمان بھی یہی کچھ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ مگر جب میں اسلام کی طرف راغب ہوئی یعنی مذہب کو ایک سیریس (سنجیدہ) چیز کے طور پر لیا، تو میری ماں نے بھی زیادہ باقاعدگی اور زیادہ اہتمام کے ساتھ چرچ جانا شروع کر دیا چلو ایک چرچ سے دوسرا چرچ آگے، میری بہنیں بھی مذہب کے بارے میں زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہیں، آگے چل کر انہیں میرے رویے سے اسلام کی طرف کوئی ترغیب ملتی ہے یا نہیں، اس کا بعد میں پتہ چلے گا، میرا طرز عمل ہی، اصل تبلیغ ہوگا انہیں اگر میرے طرز عمل اور میری دعوت اسلام میں کوئی تضاد محسوس نہ ہو تو شاید کوئی بہتر صورت سامنے آجائے۔ میں ڈیزی پر بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گی۔

جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ اینٹی اسلام پروپیگنڈے سے عام لوگوں میں دو قسم کے رویے پیدا ہوئے، دوسرا رویہ تھا کہ جو کچھ ابلاغ عامہ کے ذرائع کہتے رہیں، اسلام کا کوئی آئینے میں دیکھا جائے۔ اس طرح ایک نفرت کی فضا پیدا ہوتی چلی آ رہی تھی۔ مسلمان یورپی ممالک اور امریکا میں خصوصی نشانہ بنے آ رہے تھے، حالانکہ یہاں یہودی اور دیگر مذاہب بھی ہیں مگر وہ سب اقلیت میں ہیں، مسلمان اگرچہ عیسائیوں سے تعداد میں زیادہ نہیں، مگر سب سے بڑی اقلیت تو ضرور ہیں اس لئے وہ نفرت کا آسان ہدف تھے۔

جہاں تک میرے اندر حالیہ تبدیلی کا تعلق ہے، اس میں بڑا رول تو ظاہر ہے کہ طالبان کے عملی رویے کا ہے اس کے بعد میرا اپنا مطالعہ اسلام اور حالات کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی کاوشیں ہیں جنہوں نے مجھ پر اینٹی اسلام پروپیگنڈے کے پس پردہ محرکات واضح کر دیے ہیں۔

میں اپنی ویب سائٹ پر، اپنے ملنے والوں کو مغرب کے مکروہ چہرے سے متعارف کراتی رہتی ہوں اور اسلام سے متعلق پیدا کردہ شبہات کو دور کرتی ہوں۔ اس میں مجھے ایک حد تک ضرور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

تھیں تو کیا وجہ ہے کہ نیٹو کی فوجوں کی بھاری تعداد، انہیں ختم نہیں کر سکی؟ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا اس کاروبار کے ساتھ مفاد وابستہ ہو چکا ہے، سیکس کو عام کرنے میں بھی ان کے لئے فوائد مضمر ہیں۔ حامد کرزئی پورے ملک کے صدر نہیں بلکہ صرف کابل شہر کے ایک میسر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مجال نہیں کہ وہ امریکا کے کسی حکم سے سر تابی کر سکیں۔ وہاں کا معاشرہ خراب سے خراب تر ہو رہا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ امریکا وہاں تعمیری کاموں میں دلچسپی لے رہا ہے۔

سوال: جب آپ افغانستان کی جیلوں میں تھی تو کیا آپ کو امید تھی کہ آپ زندہ سلامت باہر نکل آئیں گی۔

جواب: نہیں، بالکل نہیں۔ مجھے خاص طور پر 7 اکتوبر 2001ء کو جب میں کابل کی جیل میں تھی اور امریکا نے بم برسانا شروع کر دیے تو ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ میں نے سمجھا کہ اب اگر طالبان مجھے قتل نہیں کریں گے تو امریکا یا برطانیہ کا کوئی بم میرا کام تمام کر دے گا۔

سوال: کیا آپ اب اسلام اور مسلمانوں کے متعلق پھیلائے گئے افسانوں اور اصل حقیقت میں فرق کر سکتی ہیں؟

جواب: یہ تو بہت آسان ہے، اسلام ایک جامع اور مکمل دین ہے جبکہ مسلمان اسے اپنی زندگی میں داخل نہیں کر سکے۔ مغربی میڈیا نے ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کا استحصال کیا ہے اور انہیں اسلام سے بدظن کرنے کی مہم چلا رکھی ہے۔

سوال: آج مغرب نے ”دہشت گردی“ کی جو تعریف متعین کر رکھی ہے، کیا آپ اسے درست سمجھتی ہیں؟

جواب: یہ ایک جدید نفسیاتی حربہ ہے جسے امریکا اپنی جارحیت پر پردہ ڈالے اور آزادی راستوں کی آزادی سلب کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ جارج بش نے صدر پاکستان کو ٹیلی فون پر جو کہا تھا کہ تم اگر میرے ساتھ نہیں ہو تو دہشت گردوں کے ساتھ ہو گویا یہ ایک سپر پاور کی منطق ہے اسے اگر بھیڑیے اور مینے کی مکالماتی کہانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جو اس کے ”ساتھ نہیں یعنی اس کا تابع فرمان نہیں وہ اس کا دشمن ہے اور جو قوم اس کی خواہش کے مطابق اپنی آزادیاں ”سرنڈر“ کرنے کے لئے تیار نہیں وہ دہشت گرد ہے۔ ایک سابق وزیر اعظم برطانیہ نے جنوبی افریقہ کے لیڈر نیلسن منڈیلا کو دہشت گرد قرار دے دیا۔ لیکن آج اسے ایک عظیم قائد مانا جاتا ہے۔

اصل میں دہشت گرد وہ ہوتا ہے جو معصوم لوگوں کو بموں سے اڑاتا ہے اور عام سولین آبادی کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھتا ہے یہی کچھ افغانستان، عراق اور فلسطین میں ہو رہا ہے، یہ ریاستی دہشت گردی کی بدترین مظاہر ہیں۔ لاشیں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں آپ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں لگا سکتے، لیکن حال یہ ہے کہ ایک امریکی کی زندگی کی قیمت تو لاکھوں ڈالر میں لگائی جاتی ہے جبکہ ایک عرب مسلمان کی زندگی اس کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔

سوال: دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی یہ جنگ کس سمت میں جارہی ہے؟

جواب: دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی یہ جنگ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ بن چکی ہے ادھر شیرون اور ولادی میر پوٹن جیسے لوگوں نے بھی فلسطین اور چیچن عوام کو کچلنے کا تہیہ کیا ہوا ہے جب مظلوم، اپنے پیدائش حق کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو نہ صرف اس ملک کی پوری ریاستی مشین اسے چکی میں پیس ڈالتی ہے بلکہ اسے سب ظالم قوتوں کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مظلوموں نے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے فی الحال یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سلسلہ آگے چل کر کیا رنگ اختیار کرے گا۔

سوال: امریکا نے 11 ستمبر کے واقعے کو جس طرح استعمال کیا ہے کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس نے دنیا بھر میں ایٹمی امریکن جذبات ابھار دیے ہیں۔

جواب: امریکا نے جو کچھ کیا ہے، اس کے نتائج آہستہ آہستہ ابھر رہے ہیں۔ پین کے عوام نے عراق میں جاری جنگ کے حوالے سے اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کر دیا ہے۔ اس کے وزیر اعظم ازنار کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔ ٹونی بلیئر کو بھی اپنے عوام سے یہی کچھ ملنا ہے اور بش کے خلاف بھی مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔

سوال: آپ نے قطر میں کچھ وقت گزارا ہے، آپ کا یہ دورہ آپ کے قبول اسلام کے حوالے سے کیا رہا؟

جواب: مجھے قطر جا کر سخت مایوسی ہوئی، تاہم یہ وہ جگہ ہے جہاں سے میں نے ایک سبق پایا ہے، اسلام کامل ہے مگر افسوس کہ اس پر عمل کرنے والے لوگ، اسلامی صفات کے حامل نہیں ہیں۔ میں برطانیہ میں ”مسجد ابو بکر صدیق“ میں جایا کرتی ہوں تو میری آمد سے لوگوں کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ لیکن جب میں قطر میں پہنچنے کے فوراً بعد مسجد میں گئی تو مجھے جس توہین آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا، وہ افسوسناک تھا، اس سے پہلے مجھے اپنے ہم مذہبوں سے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔

سوال: اب آپ کا آئندہ کا منصوبہ کیا ہے؟

جواب: میں سنجیدگی سے سیاست میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتی ہوں، کیونکہ حق اور سچائی کے موثر اظہار کے لئے ایک موثر سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت ہوتی ہے، میں ایسے پلیٹ فارم کے لئے ضرور کوشش کروں گی۔ انشاء اللہ۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔

(C)-www.UrduPoint.com